کاروانِ ملّت



مولانا وحید الدّین خاں

کاروانِ ملّت

مولانا وحید الدّین خاں

مکتبہ الرسالہ ، نئی دہلی

Karwane Millat
by Maulana Wahiduddin Khan

First published 1992
Reprinted 2008

Goodword Books
1, Nizamuddin West Market
New Delhi - 110 013
email: info@goodwordbooks.com
www.goodwordbooks.com

Printed in India

بسم الله الرحمن الرحيم

آغاز کلام

ایک مرتبہ میری ملاقات ایک مسلمان آئی اے ایس سے ہوئی۔ انھوں نے کہا: میں نے آپ کی کتابیں پڑھی ہیں۔ مجھے آپ سے سخت اختلاف ہے۔ آپ اسلام کو اور مسلمان کو الگ الگ سمجھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ ہی جیسے مولاناؤں نے اسلام کو برباد کیا ہے۔

یہ بات بظاہر بہت عجیب معلوم ہوتی ہے۔ لیکن گہرائی کے ساتھ دیکھئے تو یہی موجودہ زمانہ کے تمام مسلمانوں کا عقیدہ ہے۔ وہ خواہ مذکورہ قسم کے الفاظ نہ بولیں مگر عملاً ان کا خیال یہی ہے کہ مسلمانوں ہی کا دوسرا نام اسلام ہے، اور مسلمان جو کچھ کریں، اپنے آپ وہ اسلام بن جائے گا۔

اس کی ایک واضح علامت یہ ہے کہ اگر مسلمانوں کے کسی کام (مثلاً مدعو اقوام سے ان کی لڑنے بھڑنے کی سیاست) کو غلط بتایا جائے تو وہ فوراً بگڑ جائیں گے۔ ان کی اس روش کے خلاف قرآن وحدیث سے خواہ کتنے ہی زیادہ دلائل دیے جائیں مگر وہ اس پر غور کرنے کے لیے تیار نہ ہوں گے۔ وہ سارے دلائل و حقائق کو یہ کہہ کر نظر انداز کر دیں گے کہ تم مسلم دشمن طاقتوں کے ایجنٹ ہو، تم مسلم مفاد کے خلاف کام کر رہے ہو۔

یہ واقعہ اس بات کا ثبوت ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلمان یہ سمجھتے ہیں کہ وہ جو کچھ کریں، اسی کا نام اسلام ہے۔ ایسے مسلمان کم ملیں گے جو اپنی زبان سے مذکورہ مسلمان آئی اے ایس جیسا کلمہ بولیں مگر ہر مسلمان عملاً یہی کہہ رہا ہے کہ ہم کو اسلام پر نہ جانچو بلکہ خود اسلام کو ہمارے اوپر جانچو۔

زیر نظر کتاب کے مرتب کو موجودہ مسلمانوں کی اس فکر سے اتفاق نہیں۔ اس کتاب میں مسلمانوں کے طرز عمل کو اسلام کے مطابق ثابت کرنے کی کوشش نہیں کی گئی ہے۔ بلکہ اس میں قرآن وسنت کی روشنی میں مسلمانوں کے طرز عمل کا جائزہ لیا گیا ہے۔

آج سب سے زیادہ ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلمان اپنے آپ کو قرآن وسنت کی روشنی میں جانچیں اور اپنی روش کو قرآن وسنت کے مطابق بنائیں۔ قرآن وسنت کو چھوڑ کر ہی وہ موجودہ زمانہ میں برباد ہوئے ہیں اور قرآن وسنت کو اختیار کر کے ہی وہ خدا کی نظر میں دوبارہ فلاح کا استحقاق حاصل کر سکتے ہیں۔

وحید الدین

۸ ستمبر ۱۹۹۱

باب اوّل

احیاء ملّت

پاکستان کے مشہور اخبار نوائے وقت (۳۰ مئی ۱۹۹۰) میں ایک مضمون نظر سے گزرا۔ اس مضمون میں مسلمانوں کی عالمی زبوں حالی کا ذکر تھا اور اس کا عنوان حسب ذیل لفظوں میں قائم کیا گیا تھا:

امت پہ تری آکے عجب وقت پڑا ہے

یہ مصرعہ در اصل "مسدس حالی" سے لیا گیا ہے۔ اس منظوم کتاب کے آخر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جناب میں ایک مناجات شامل کی گئی تھی۔ اس مناجات کا پہلا شعر یہ تھا:

اے خاصۂ خاصان رسل وقت دعا ہے   امت پہ تری آکے عجب وقت پڑا ہے

سو سال پہلے جب الطاف حسین حالی نے اپنی یہ کتاب تیار کر کے سر سید احمد خاں (۱۸۹۸-۱۸۱۷) کو دی، تو سر سید اتنا خوش ہوئے کہ انھوں نے کہا: خدا اگر قیامت میں پوچھے کہ کیا لائے تو میں کہوں گا کہ حالی سے مسدس لکھوا لایا ہوں۔

اس وقت سے لے کر اب تک مسلمانوں کے درمیان بے شمار رہنما اٹھے، بے شمار بڑی بڑی تحریکیں ابھریں۔ ان رہنماؤں اور ان تحریکوں کے غلغلہ سے زمین و آسمان گونج اٹھے۔ مگر یہ تمام کی تمام تحریکیں سراسر بے نتیجہ رہیں۔ وہ مسلمانوں کی حالتِ زوال کو دوبارہ حالت عروج تک پہنچانے والی ثابت نہیں ہوئیں۔ حالی کا شعر سو سال بعد بھی دہرا جا رہا ہے۔

مسلم رہنماؤں کی سو سالہ کوششیں کیوں حبط اعمال کا نمونہ بن کر رہ گئیں۔ اس کا جواب بالکل سادہ ہے۔ انھوں نے مرض کی تشخیص میں غلطی کی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اپنی ساری کوششیں غلط مقام پر صرف کرتے رہے۔ وہ ملت کے درخت کی پتیوں پر پانی ڈالتے رہے۔ جب کہ اصل ضرورت یہ تھی کہ ملت کے درخت کی جڑ کو پانی سے سیراب کیا جائے۔

ہمارے تقریباً تمام رہنماؤں نے کارِ اوّل کو چھوڑ کر کارِ ثانی پر اپنی ساری توجہ صرف کر دی۔ وہ بنیاد کی تعمیر سے پہلے چھت کھڑی کرنے میں لگے رہے۔ وہ تیاری کے بغیر اقدام کی نادانی کرتے رہے۔ ایسی جدوجہد کے لئے موجودہ دنیا میں یہی مقدر ہے کہ وہ بے نتیجہ ہو کر رہ جائے۔

ایک مثال

ایک شخص کے یہاں دو چھوٹے بچے ہیں۔ وہ چاہتاہے کہ اپنے بچوں کے بارہ میں اپنی ذمہ داریاں جاننے کے لئے قرآن و حدیث کا حکم معلوم کرے۔ اب ایک صورت یہ ہے کہ وہ پیغمبر اسلام کے اس قول کو اپنا رہنما بنائے کہ: مانحل والدٌ ولدَہ من نُحلٍ أفضلَ من أدبٍ حَسَنٍ (۱۳۸۹/۳)

جو شخص اس حدیث رسول سے اپنا حکم اخذ کرے اور اس کی رہنمائی میں اپنے عمل کا نقشہ بنائے، وہ کیا کرے گا۔ وہ اپنی ساری توجہ اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت پر لگا دے گا۔ وہ کوشش کرے گا کہ اس کے بچے جب بڑے ہوں تو وہ علم اور اخلاق کے اعتبار سے پوری طرح تیار ہوں۔ وہ خدا کے حقوق کو اور اپنی ذمہ داریوں کو اچھی طرح سمجھ سکیں۔ وہ اس قابل ہو چکے ہوں کہ زندگی کے شعور سے پوری طرح مسلح ہو کر زندگی کے میدان میں داخل ہوں۔

دوسری صورت یہ ہے کہ مذکورہ آدمی "نکاح" کی آیتوں اور حدیثوں سے اپنی ذمہ داریوں کا تعین کرے۔ مثلاً وہ اس حدیث رسول سے اپنا حکم معلوم کرے کہ: علیکُم بالْبَاءَۃِ فَاِنَّہ اَغَضُّ لِلْبَصَرِ و اَحْصَنُ لِلْفَرجِ (الترمذی، ابواب النکاح)

جو آدمی اس حدیث رسول سے اپنا حکم اخذ کرے، وہ اپنے بچوں کے بارہ میں کس چیز کو اپنی ذمہ داری سمجھے گا۔ وہ سمجھے گا کہ سب سے ضروری کام بچوں کے نکاح کا انتظام کرنا ہے۔ وہ اپنی بچی کے لئے ایک شوہر اور اپنے بچہ کے لئے ایک بیوی کی تلاش میں مصروف ہو جائے گا۔ اور چاہے گا کہ جلد سے جلد ان کا جوڑا فراہم کرکے ان کا نکاح کر دے، خواہ ہندستان کی بعض پست اقوام کی طرح اس کو ایسا کیوں نہ کرنا پڑے کہ وہ دولہا اور دلھن کو اپنی گود میں بٹھا کر مقام نکاح تک لے جائے۔

موجودہ زمانہ میں احیاء امت کے معاملہ میں ہمارے رہنماؤں نے وہی غلطی کی ہے جو غلطی وہ شخص کرے گا جو اپنے چھوٹے بچوں کے بارہ میں اپنی ذمہ داریوں کو ادا کرنے کے لئے نکاح کے حکم کو اپنا پہلا رہنما بنالے۔

آج کے مسلمان

موجودہ زمانہ میں جو مسلم نسلیں ہیں، ان کا مسئلہ یہ تھا کہ وہ زوال کا شکار ہو گئیں۔ اب ضرورت تھی کہ ان کو دوبارہ عروج کی طرف لے جایا جائے۔ موجودہ زمانہ میں ہزاروں کی تعداد

میں ایسے رہنما اٹھے جن کا مقصد یہی تھا۔ یعنی ملت مسلمہ کا احیاء۔

ان رہنماؤں کے سامنے سب سے پہلا سوال یہ تھا کہ قرآن کی وہ کون سی آیت ہے جو اس معاملہ میں ہماری رہنمائی کرتی ہے، اور جس کی روشنی میں ہمیں اپنے عمل کا نظام بنانا چاہئے۔ تقریباً بلا استثناء ہر ایک نے یہ کیا کہ اس نے خلافت و امامت کی آیات کو اپنے لیے رہنما آیت قرار دیا :

کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تأمرون بالمعروف وتنھون عن المنکر (آل عمران ۱۱۰)

تم بہترین امت ہو جو لوگوں کے لئے نکالی گئی ہے۔ تم بھلائی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو۔

موجودہ حالات میں مسلمانوں کے احیاء کے لئے کیا کرنا ہے، اس کا حکم ہمارے رہنماؤں نے مذکورہ قسم کی آیتوں سے نکالا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر ایک اوّل دن سے مسلمانوں کو مجاہدانہ اقدام اور قیام امامت کا سبق دینے لگا۔ ہر ایک نے مسلمانوں کے ذہن میں یہ تصور بٹھانا شروع کیا کہ تم دنیا کے فوجدار ہو، اٹھو اور دنیا کو مسخر کرکے خلافت ارضی کا مقام سنبھالو۔ اقبال نے اسی بات کو ان لفظوں میں کہا :

سبق پڑھ پھر صداقت کا عدالت کا شجاعت کا لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

یہی بات مولانا ابو الحسن علی ندوی نے ان الفاظ میں کہی ہے: مسلمان اپنے دین کی رو سے دنیا کے محتسب اور خدائی فوجدار ہیں۔ جس دن وہ بیدار ہوں گے اور اپنا فرض منصبی انجام دیں گے، وہ مشرق اور مغرب کی قوموں کے لئے روز حساب ہوگا۔" (عروج و زوال، صفحہ ۳۹۴)

مولانا موصوف دوسری جگہ " احتساب کائنات " کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں: امت مسلمہ پر عالمی نگرانی، اخلاق و رجحانات، انفرادی و بین اقوامی طرزعمل کے احتساب، انصاف کے قیام، شہادت حق، امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی ذمہ داری ڈالی گئی ہے۔" (اسلام کے اثرات و احسانات، صفحہ ۱۲۴)

یہی موجودہ زمانہ کے تمام مفکروں اور رہنماؤں کا معاملہ ہے۔ ہر ایک نے خلافت و امامت کی آیتوں کو اپنا اولین رہنما بنایا۔ ان کے الفاظ اور ان کی تعبیرات اگرچہ ایک دوسرے سے جدا تھیں۔ مگر حقیقت کے اعتبار سے سب کا خلاصہ ایک تھا۔ یعنی مسلمانوں کو دنیا کا فوجدار بننے

کی دعوت دینا۔

آزاد سبحانی مسلمانوں کو تلقین کرتے تھے کہ آپس میں اس طرح سلام کیا کرو۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ نحن خلیفۃ اللہ۔ کچھ دوسرے لوگ اس بھونڈے پن تک نہیں گئے۔ انھوں نے اسی بات کو زیادہ مہذب انداز میں بیان کیا جس کی ایک مثال اوپر کے اقتباس میں نظر آتی ہے۔

موجودہ زمانہ کی مسلم نسلوں کے احیاء کے لئے عمل کا آغاز کہاں سے کرنا ہے، اس کا حکم ہمارے رہنماؤں نے امامت اور قیادت جیسی آیتوں سے اخذ کیا۔ ان کا یہ استنباط غلط تھا، چنانچہ ان کا سارا عمل غلط ہو کر رہ گیا۔ ہمارے رہنماؤں کی اٹھائی ہوئی تحریکیں اس فارسی شعر کا مصداق بن گئیں کہ معمار جب پہلی اینٹ ٹیڑھی رکھتا ہے تو اس کے بعد ثریا تک دیوار ٹیڑھی ہو جاتی ہے :

خشت اول چوں نہد معمار کج تا ثریا می رود دیوار کج

ایک مشہور مسلم رہنما نے اپنی تقریر میں مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا : "تم ہی تو ہو جس نے قیصر و کسریٰ کے تخت الٹ دئے تھے"۔ یہ ایک بے اصل کلام ہے۔ اس سے شبہہ ہوتا ہے کہ موجودہ مسلمان گویا دور اول کے مسلمانوں کا تسلسل ہیں۔ حالانکہ یہ صحیح نہیں۔ صحیح بات یہ ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلمان دور اول کے مسلمانوں کی بعد کی نسل ہیں۔ مزید یہ کہ عقیدہ اور کردار کے پہلو سے موجودہ مسلمانوں کی جو حالت ہے، اس کے اعتبار سے یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ موجودہ زمانہ کے مسلمان دور اول کے مسلمانوں کی اگلی زوال یافتہ نسل ہیں۔

ان حقائق کو سامنے رکھ کر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ موجودہ مسلم نسلوں کے معاملہ میں قرآن کا حکم جاننے کے لئے صحیح اور متعلق آیت حسب ذیل ہے :

الم یأن للذین آمنوا ان تخشع قلوبھم لذکر اللہ وما نزل من الحق۔ ولا یکونوا کالذین اوتوا الکتاب من قبل فطال علیھم الامد فقست قلوبھم وکثیر منھم فاسقون۔ اعلموا ان اللہ یحیی	کیا ایمان والوں کے لئے وہ وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی نصیحت کے آگے جھک جائیں۔ اور اس حق کے آگے جو نازل ہوا ہے۔ اور وہ ان لوگوں کی طرح نہ ہو جائیں جن کو پہلے کتاب دی گئی تھی۔ پھر ان پر لمبی مدت گزر گئی تو ان کے دل سخت

الارض بعد موتها. قد بيّنا لکم الآیات لعلکم تعقلون (الحدید ۱۶ - ۱۷)

ہو گئے۔ اور ان میں سے اکثر نافرمان ہیں۔ جان لو کہ اللہ زمین کو زندگی دیتا ہے اس کی موت کے بعد۔ ہم نے تمہارے لئے نشانیاں بیان کر دی ہیں تاکہ تم سمجھو۔

خدا کی ہدایت ابتداءً جب آتی ہے تو جو لوگ اس سے متاثر ہوتے ہیں، ان کا تاثر ذہنی انقلاب کے ہم معنی ہوتا ہے۔ ان کے اندر ایمان ایک زندہ طاقت کی حیثیت سے داخل ہوتا ہے۔ ان کی پوری زندگی جاہلیت سے نکل کر اسلام پر قائم ہو جاتی ہے۔ اب وہ پہلے والے انسان نہیں ہوتے، بلکہ بالکل نئے انسان بن جاتے ہیں۔

یہ پہلی اسلامی نسل کی بات ہے۔ اس کے بعد دور اول کے لوگ وفات پاتے جاتے ہیں اور ان کی جگہ دوسرے مسلمان آنے لگتے ہیں جو توالد وتناسل کے ذریعہ اسلام کی جماعت میں شامل ہوئے تھے۔

یہ اسلام کی بعد کی نسلیں ہیں۔ قرآن کے مطابق، ان لوگوں میں قساوتِ قلب (الحدید ۱۶) کی کمزوری پیدا ہو جاتی ہے۔ یعنی دور اول کے مسلمانوں کا ایمان اگر تڑپ والا ایمان تھا تو بعد کی مسلم نسلوں کا ایمان بے حسی کا شکار ہو جاتا ہے۔ دور اول کے لوگوں میں اسلام اگر روح (اسپرٹ) اور ہیئت (فارم) دونوں کے اعتبار سے موجود تھا تو دور مابعد کے لوگوں میں روح غائب ہو جاتی ہے اور صرف ظاہری ہیئت باقی رہ جاتی ہے۔ دور اول کے لوگوں کے لئے دین کا ماخذ اگر قرآن وسنت تھا تو دور مابعد کے لوگوں کے یہاں قرآن وسنت رسمی عقیدہ کے خانہ میں چلا جاتا ہے، اور دین کے ماخذ کی حیثیت سے انھیں جو چیز معلوم ہوتی ہے وہ صرف وہ تاریخ ہے جو بعد کے زمانوں میں ایک یا دوسری شکل میں بنی۔

ان اسباب کے نتیجہ میں دونوں گروہوں کے درمیان بنیادی فرق واقع ہو جاتا ہے۔ دور اول کے مسلمان اگر زندہ ملت تھے تو دور مابعد کے مسلمان مردہ ملت بن جاتے ہیں۔ دور اول کے لوگ اگر ہرے بھرے درخت کی مانند تھے تو دور مابعد کے لوگ سوکھے ہوئے درخت کی مانند ہو جاتے ہیں جس سے کسی کو نہ سایہ ملے اور نہ پھل۔

کوئی مسلم نسل جب زوال کی اس حالت کو پہنچ جائے تو اس وقت اس کے احیاء نو کے لئے کیا کرنا چاہئے۔ اس کا جواب مذکورہ آیت (الحدید ۱۷) میں دیا گیا ہے۔ ایسی نسل کی مثال مردہ زمین کی ہے، اور اس کو دوبارہ زندگی دینے کے لئے وہی عمل کرنا چاہئے جو مردہ زمین کے ساتھ کوئی کسان کرتا ہے۔

کسان کو جب ایک مردہ زمین ملتی ہے تو وہ ایسا نہیں کرتا کہ پہلے ہی مرحلہ میں اس کے اندر بیج بکھیر دے۔ وہ یہ کرتا ہے کہ پہلے زمین کو تیار کرتا ہے۔ اس کا اینٹ پتھر نکالتا ہے۔ اس کے جھاڑ جھنکار کو کاٹتا ہے۔ اس کو ہموار کرتا ہے۔ اس کو جوتتا ہے اور اس میں پانی دیتا ہے۔ اس ابتدائی عمل کے بعد جب زمین تیار ہو کر قابل کاشت ہو جاتی ہے، اس وقت وہ اس میں بیج ڈالتا ہے۔ اس کے بعد بہت جلد دیکھنے والے دیکھتے ہیں کہ اس کی زمین میں لہلہاتی ہوئی فصل کھڑی ہوئی ہے۔ اس کے برعکس اگر وہ یہ کرتا کہ زمین کو تیار کئے بغیر اس میں بیج بکھیر دیتا تو اس کے حصہ میں آخر کار کچھ بھی نہ آتا۔

مسلم رہنما اگر قرآن کی اس آیت سے موجودہ مسلم نسلوں کا حکم اخذ کرتے تو وہ کسان کی طرح ایک ایک مسلمان کی تعلیم و تربیت میں لگ جاتے۔ وہ ان کے رسمی عقیدہ کو زندہ عقیدہ بناتے۔ وہ ان کے اندر اسلام کی اسپرٹ ابھارتے۔ وہ ان کے ایمان کو ذہنی انقلاب کے درجہ تک پہنچانے کی کوشش کرتے۔ وہ خدا کے ساتھ ان کے تعلق کو اس طرح استوار کرتے کہ خدا ان کے لئے ایک حاضر و ناظر حقیقت بن جائے۔

یہ بلاشبہ ایک خشک عمل ہے۔ اس کو گم نامی کی سطح پر انجام دینا پڑتا ہے۔ اس عمل کے دوران ایک مقبول آدمی بھی اپنی قوم کے اندر نامقبول بن جاتا ہے۔ لیکن اگر ہمارے رہنما ان تمام ناموافق باتوں کو برداشت کرتے ہوئے اس ابتدائی کام کو انجام دیتے اور اس کو تکمیل کے مرحلہ تک پہنچاتے تو یقیناً آج ہمارے سامنے مسلم ملت ایک سرسبز و شاداب باغ کی صورت میں موجود ہوتی۔ مگر جب انھوں نے ایسا نہیں کیا تو ان کے تمام پرشور ہنگاموں کے باوجود ملت ہر طرف ایک ویران باغ کی تصویر بنی ہوئی ہے۔

اب ماضی کی اس غلطی کی کم سے کم تلافی یہ ہے کہ حال میں اس کو نہ دہرایا جائے۔ اب تمام مسلم

رہنماؤں اور تمام مسلم دانشوروں پر فرض کے درجہ میں ضروری ہے کہ وہ اپنی موجودہ لایعنی سرگرمیوں کو بالکل بند کر دیں۔ سب کے سب پیچھے لوٹیں اور ملت کی ذہنی بیداری کے کام میں لگ جائیں۔ ملت کے افراد میں ایمان و اسلام کی بنیاد پر ذہنی بیداری لائے بغیر عملی اقدام کی سیاست چلانا صرف ایک جرم ہے نہ کہ کوئی حقیقی عمل۔

موجودہ زمانہ میں احیاء اسلام کے لئے ہم کو جو عمل کرنا ہے وہ یہی ہے۔ اس کے سوا ہر دوسرا عمل صرف وقت اور قوت کا ضیاع ہے، اس کے سوا اور کچھ نہیں۔

تعمیر نو کا مسئلہ

تمہید

اسلام اور اہل اسلام کی تاریخ چودہ سو سال کی مدت تک پھیلی ہوئی ہے۔ ابتدائی تقریباً ایک ہزار سال ایسے ہیں جب کہ اہل اسلام کو غلبہ ملا ہوا تھا۔ ان کی تہذیب غالب تہذیب کی حیثیت رکھتی تھی۔ اس کے بعد مسلم قوموں پر زوال آیا۔ وہ دوسری قوموں سے شکست کھا گئے۔ شکست اور مغلوبیت کی یہ صورت تا حال باقی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ کچھ ملکوں میں وہ مقامی اکثریت کے ہاتھوں مغلوب ہیں اور دوسرے ملکوں میں بیرونی قوموں نے انھیں مغلوب کر رکھا ہے۔

قرآن میں اللہ تعالیٰ نے اعلان فرمایا ہے کہ جو مصیبت بھی تمہارے اوپر آتی ہے وہ خود تمہارے اپنے کئے کا نتیجہ ہوتی ہے (التوبہ ۳۰) اس قانون الٰہی کی روشنی میں یہ ماننا ہوگا کہ مغلوبیت کی موجودہ صورت حال کا سبب باہر نہیں ہے بلکہ اندر ہے۔ یہ خود اہل اسلام کی داخلی کمیاں ہیں جنھوں نے ان کو موجودہ حالت میں مبتلا کر دیا ہے۔

اسلام کے دور اول میں غزوۂ احد (۳ھ) میں اہل اسلام کو شکست ہوئی۔ یہ جنگ اگرچہ واضح طور پر مخالفین کے ظلم اور جارحیت کا نتیجہ تھی۔ مگر قرآن میں اس کی ذمہ داری خود مسلمانوں کے اوپر ڈالتے ہوئے کہا گیا کہ اس کا سبب تمہارا باہمی نزاع (آل عمران ۱۵۲) تھا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ اگر تم چاہتے ہو کہ دوبارہ تمہارے ساتھ احد جیسا المیہ نہ پیش آئے تو اپنے اندر نزاع کی حالت کو ختم کرو۔ تم ایک بے نزاع گروہ بن جاؤ۔

اسی طرح غزوۂ حنین (۸ھ) میں ابتداءً اہل اسلام کو شکست ہوئی اور انھیں نقصان اٹھانا پڑا۔ یہ جنگ بھی تمام تر مخالفین اسلام کی سازش اور جارحیت کی بنا پر پیش آئی۔ مگر قرآن میں جب اس پر تبصرہ کیا گیا تو ابتدائی شکست اور نقصان کی ساری ذمہ داری مسلمانوں کی داخلی کمی پر ڈال دی گئی اور فرمایا گیا کہ یہ حادثہ اس لئے پیش آیا کہ تم کو اپنی کثرت پر ناز (التوبہ ۲۵) ہو گیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اگر تم چاہتے ہو کہ حنین جیسا [illegible] ساتھ نہ دہرایا جائے تو تم اپنے آپ کو فخر و ناز کی نفسیات سے بچاؤ۔ اپنے اندر تواضع کا مزاج پیدا کرو۔

اس سے معلوم ہوا کہ اس طرح کا معاملہ پیش آنے کی صورت میں صحیح اسلامی ردعمل یہ ہے کہ اپنے اندر پائے جانے والے سبب کو دور کیا جائے نہ کہ بیرونی ظالم کے خلاف احتجاج کا طوفان کھڑا کیا جائے۔ مسئلہ کا حل ہمارے اندر ہے نہ کہ ہمارے باہر۔

قرآن فطرت انسانی کا شرعی بیان ہے۔ قرآن میں جو بات شریعت کی زبان میں کہی گئی ہے وہ ہر آدمی کی فطرت میں پیدائشی طور پر موجود ہے۔ ہر آدمی خواہ وہ مسلم ہو یا غیر مسلم، جب کسی شکست سے دوچار ہوتا ہے تو اس کی فطرت اس کو یہی بات سجھاتی ہے کہ تمہاری کمیوں کی بنا پر ایسا ہوا۔ اس لیے اپنی کمیوں کو دور کرکے ایسے انجام سے بچو۔ اس کے خلاف صرف اس وقت ہوتا ہے جب کہ آدمی کے آس پاس کچھ بہکانے والے لوگ موجود ہوں اور وہ اس کو بہکا کر اس کے ذہن کو غلط رخ پر موڑ دیں۔

اس کی ایک انفرادی مثال رابرٹ امیان (Robert Immiyan) ہے۔ وہ لمبی کود کا عالمی چیمپین ہے۔ ایک بار وہ مقابلہ میں ہار گیا۔ اس کے بعد اس سے پوچھا گیا کہ اب تمہارا پروگرام کیا ہے۔ ٹائمس آف انڈیا (۵ اپریل ۱۹۸۸) کے مطابق، اس نے جواب دیا کہ سب سے اہم بات یہ ہے کہ میں اپنے ان نقائص سے چھٹکارا حاصل کروں جو میرے لئے اچھی کارکردگی میں رکاوٹ ہیں:

The most important is to get rid of the defects which prevent me from improving my performance.

یہ دراصل فطرت کا سبق تھا جو مذکورہ کھلاڑی کی زبان پر جاری ہوا۔ جب بھی کوئی شخص زندگی کی دوڑ میں گر پڑتا ہے تو اس کی فطرت خاموش زبان میں اس سے کہتی ہے کہ تم اپنی کمیوں کو دور کرو، اس کے بعد تم اپنے آپ کو دوبارہ اٹھانے میں کامیاب ہو جاؤ گے۔ فطرت کے اسی سبق کو رہنما بنا کر ہزاروں افراد نے ایک بار ناکام ہونے کے بعد دوسری بار کامیابی کی منزل کو پالیا ہے۔

فرد کے احیاء نو کا جو اصول ہے وہی قوم کے احیاء نو کا بھی اصول ہے۔ مقابلہ کی اس دنیا میں بار بار ایسا ہوتا ہے کہ ایک قوم دوسری قوم سے شکست کھا جاتی ہے۔ اس وقت فطرت کا خودکار نظام اپنے آپ جاگ پڑتا ہے۔ وہ قوم کو سکھاتا ہے کہ تمہاری شکست کا سبب خود تمہاری اندرونی کمزوری ہے۔ اس کمزوری کو دور کرنے میں لگ جاؤ۔ جب تمہاری داخلی کمزوری دور ہوگی تو اس کے بعد تمہاری شکست بھی فتح میں تبدیل ہو چکی ہوگی۔

رہنما کی ذمہ داری

ایک آدمی کے ہاتھ یا پاؤں کی ہڈی ٹوٹ جائے تو کوئی بھی ڈاکٹر بطور خود اس کو دوبارہ جوڑ نہیں سکتا۔ ایسے کیس میں ڈاکٹر جو کچھ کرتا ہے وہ حقیقۃً مدد ہے نہ کہ شفاء۔ ڈاکٹر صرف یہ کرتا ہے کہ وہ ہڈی کے دونوں سروں کو ٹھیک طور پر ایک دوسرے سے ملا دیتا ہے، اور پھر ٹریکشن (traction) وغیرہ کے ذریعہ عضو کے اوپر خارجی بندش قائم کر دیتا ہے کہ وہ اپنی جگہ سے ہلنے نہ پائے۔ اس کے بعد دونوں ٹکڑوں کو دوبارہ جوڑنے کا پورا عمل فطرت انجام دیتی ہے (17/821)

یہی معاملہ پورے علم طب کا ہے۔ طبیب یا ڈاکٹر کا کام صرف یہ ہے کہ وہ ایسے حالات پیدا کرے کہ "طبیعت مدبرۂ بدن" کو اپنا کام کرنے کا موقع مل جائے۔ اصل کام فطرت (طبیعت مدبرۂ بدن) کرتی ہے۔ معالج صرف اس کا مددگار بن جاتا ہے، وہ اس کے راستہ کی رکاوٹوں کو دور کر دیتا ہے۔

ایسا ہی معاملہ قوم کے احیاء نو کا بھی ہے۔ کوئی قوم جب شکست سے دوچار ہوتی ہے تو اس کے اندر خود فطرت کے قائم کردہ نظام کے تحت حیات نو کا عمل جاری ہو جاتا ہے۔ یہاں رہنما کا کام بس وہی ہے جو کسی علاج میں ڈاکٹر کا ہوتا ہے۔ رہنما کو یہ کرنا ہے کہ وہ فطرت کے تحت ابھرنے والے عمل کے ابھرنے میں مدد دے، وہ اس کو غلط رخ کی طرف جانے سے بچائے۔ فطرت ہمیشہ انسان کو صحیح رخ پر متحرک کرتی ہے۔ یہ صرف غلط رہنما ہیں جو انسان کے ذہن کو بگاڑ کر اس کو رخ سے بے رخ کر دیتے ہیں، وہ اس کو تعمیر کے بجائے تخریب کے راستہ میں دوڑا دیتے ہیں۔

مسلمان ایک تاریخی استثناء

تاریخ میں بار بار قوموں کے ساتھ شکست کا معاملہ پیش آیا ہے۔ مگر بار بار ایسا ہوا کہ ایک قوم گر کر بہت کم مدت میں دوبارہ اٹھ گئی۔ اس معاملہ میں موجودہ مسلمانوں کی مثال ایک استثنائی مثال ہے۔ مسلمانوں کی مغلوبیت پر دو سو سال سے بھی زیادہ لمبی مدت گزر گئی۔ مگر اب تک ان کے اندر کمیوں کو دور کرنے کا مذکورہ عمل جاری نہیں ہوا۔ اس لئے ان کی مغلوبیت بھی دوبارہ غلبہ میں تبدیل نہ ہو سکی۔

مسلمانوں کے ساتھ یہ استثنائی معاملہ اس لئے پیش آیا کہ ان کے درمیان فطرت کا وہ عمل جاری نہ ہو سکا جو دوسری قوموں میں بلا تاخیر جاری ہو گیا۔ مسلمانوں کے ساتھ یہ المیہ ہوا کہ شکست کا واقعہ پیش آنے کے فوراً بعد ان کے درمیان ایسے رہنما اٹھ کھڑے ہوئے جو اصل حقیقت سے بے خبر تھے۔

ان کی الٹی رہنمائی فطرت کے اوپر ایک قسم کا پردہ بن گئی۔ انھوں نے قوم کو مثبت ردعمل کے بجائے منفی ردعمل کی سمت میں موڑ دیا۔

شکست کا واقعہ پیش آنے کے بعد فطرت یہ سبق دیتی ہے کہ اسبابِ شکست کو دور کرو۔ مگر مسلمانوں کے رہنماؤں نے اپنے بے جا جوش کے تحت انھیں اکسایا کہ تم ظالموں سے لڑ جاؤ۔ اس طرح یہ ہوا کہ جو وقت تعمیر خویش کی جدوجہد میں لگتا وہ تخریب غیر کی ناکام کوششوں میں ضائع ہوتا رہا۔ اور تادم تحریر بہت بڑے پیمانہ پر ضائع ہو رہا ہے۔

دوسوسالہ مسئلہ

مولانا شاہ عبد العزیز دہلوی (۱۸۲۳-۱۷۶۲) شاہ ولی اللہ کے فرزند تھے۔ ان کے زمانہ میں "نصرانی حکام کا حکم دہلی تک بے دغدغہ" جاری ہو چکا تھا۔ چنانچہ انھوں نے فتویٰ دیا کہ ہندستان دار الحرب ہو گیا ہے (فتاوی عزیزی، جلد اول) انھوں نے اپنے ایک عربی شعر میں کہا کہ میں دیکھتا ہوں کہ انگریز جو دولت کے مالک ہیں انھوں نے دہلی اور کابل کے درمیان فساد برپا کر رکھا ہے:

وإنّي أرى الافرنج اصحاب ثروة　　لقد أفسدوا ما بين دهلي وكابل

اس زمانہ کے ایک اور بزرگ سید احمد شہید بریلوی (۱۸۳۱-۱۷۸۶) نے اپنے ایک خط میں شاہ سلیمان حاکم چترال کو لکھا کہ عیسائی اور مشرکین جیسے برے لوگوں نے ہندستان کے بیشتر حصہ پر غلبہ حاصل کر لیا ہے اور اس ملک کو ظلم وجور سے بھر دیا ہے (نصاریٰ نکوہیدہ خصال و مشرکین بد مآل بر اکثر بلاد ہند استیلا، یافتند و آں دیار را بہ ظلمات ظلم و بیداد مشحون ساختند)

سید صاحب نے ایک اور خط میں غلام حیدر خاں کو لکھا جو اس وقت ریاست گوالیار کے ایک فوجی افسر تھے۔ انھوں نے لکھا کہ ملک ہندستان کا بیشتر حصہ غیر ملکیوں کے قبضہ میں چلا گیا ہے اور انھوں نے ہر جگہ ظلم وجور کا قانون جاری کر رکھا ہے۔ ہندستان کے حاکموں کی حکومت برباد ہو گئی ہے (اکثر بلاد ہندستان بدست بیگانگاں افتادہ وایشاں ہر جا بنیاد و آئین جور و ظلم نہادہ، ریاست رؤسائے ہندستان برباد رفتہ) تاریخ دعوت وعزیمت، حصہ پنجم، صفحہ ۳۷۰

ہمارے بزرگوں نے یہ بات انیسویں صدی کے شروع میں کہی تھی۔ گویا انھوں نے تقریباً دوسو سال پہلے یہ اعلان کیا کہ برصغیر ہند کے مسلمان دوسری قوموں کے ظلم وستم کی زد میں آ گئے ہیں۔ آج

دوسو برس بعد بھی ہمارے رہنماؤں کے پاس کہنے کی جو بات ہے وہ یہی ہے۔ آج بھی مزید شدت کے ساتھ وہ اسی بات کو دہرا رہے ہیں۔ ساری دنیا میں مسلمانوں کے لکھنے اور بولنے والے آج بھی متفقہ طور پر کہہ رہے ہیں کہ مسلمان غیر قوموں کے ظلم و جور کا نشانہ بنے ہوئے ہیں۔ ہر جگہ ان کے خلاف سازشیں ہو رہی ہیں۔ ہر جگہ ان کو تعصب اور جارحانہ زیادتیوں کا سامنا پیش آ رہا ہے۔

زیادہ اہم سوال

دوسو سال سے مسلمانوں کے تمام اہل قلم اور اہل زبان یہ پکار رہے ہیں کہ مسلمانوں کے اوپر ظلم کیا جا رہا ہے۔ مگر بات اسی پکار پر ختم نہیں ہو جاتی۔ فطرت کے مذکورہ قانون کی روشنی میں دیکھئے تو اس سے بھی زیادہ اہم سوال یہ ہے کہ اتنی لمبی مدت گزرنے کے بعد بھی مسلمانوں کی حالت بدلی کیوں نہیں۔ کیا وجہ ہے کہ صدیاں گزرنے کے بعد بھی مسلمانوں کی شکست اور مغلوبیت کی حالت بدستور جاری ہے۔ اتنی مدت یا اس سے بھی کم مدت میں دوسری دبی ہوئی قومیں دوبارہ ابھر آئیں۔ پھر مسلمان ایک بار گرنے کے بعد دوبارہ کیوں نہیں ابھر رہے ہیں۔

یہ تاریخ کا ایک انوکھا معاملہ ہے جو صرف مسلمانوں کے ساتھ پیش آ رہا ہے۔ معلوم تاریخ میں کسی بھی دوسری قوم کے ساتھ کبھی اس قسم کا ظالمانہ معاملہ پیش نہیں آیا جو مسلسل سیکڑوں سال تک جاری رہے، پھر بھی اس کا خاتمہ نہ ہو سکے۔

تاریخ کا تجربہ یہ ہے کہ دباؤ سے قومیں ابھرتی ہیں۔ ظلم و فساد ان کو نئی ترقیوں کی طرف لے جاتا ہے۔ ناموافق صورت حال کا پیش آنا ہمیشہ قوموں کے لئے عروج کا نیا زینہ ثابت ہوا ہے۔ اس قانون اقوام کی تائید خود قرآن سے بھی ہوتی ہے۔ چنانچہ قرآن میں ارشاد ہوا ہے : کم من فئۃ قلیلۃ غلبت فئۃ کثیرۃ باذن اللہ (البقرہ ۲۴۹) یعنی کتنی ہی بار ایسا ہوا ہے کہ ایک قلیل جماعت ایک کثیر جماعت پر اللہ کے اذن سے غالب آئی ہے۔

اس آیت میں "قلیل" سے مراد صرف عددی قلت نہیں ہے۔ بلکہ ہر اعتبار سے قلت ہے۔ عربی زبان میں قلیل کا لفظ اس قسم کے جامع مفہوم کے لئے معروف ہے۔ حماسی شاعر نے کہا ہے :

فان اَکُ فی شرارکم قلیل　　فانی فی خیارکم کثیر

قرآن کا یہ بیان تاریخ کے عین مطابق ہے۔ آرنلڈ ٹوائن بی (۱۹۷۵ - ۱۸۸۹) کی کتاب تاریخ

کامطالعہ (A Study of History) جو بارہ ضخیم جلدوں میں ہے، گویا اسی آیت کی تفسیر ہے۔ انگریز مورخ نے اس کتاب میں پوری معلوم تاریخ کا مطالعہ پیش کیا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ تاریخ میں ہمیشہ ایسا ہوا ہے کہ جو قومیں چیلنج کی زد میں آئیں وہی قومیں ابھری ہیں اور انھیں نے بڑی بڑی تاریخ بنائی ہے۔ گویا اس دنیا میں جو تاریخی قانون رائج ہے وہ یہ کہ جو قومیں مغلوبیت کا شکار ہوں وہ دوبارہ ابھریں اور غالب آئیں۔ اس معاملہ کی وضاحت کے لئے دو مثال لیجئے، ایک اسلامی تاریخ کی، اور دوسری غیر مسلموں کی تاریخ کی۔

تاریخ کی مثال

اس سلسلہ میں ایک نمایاں مثال خود اسلام کی ابتدائی تاریخ میں ملتی ہے۔ ساتویں صدی عیسوی میں جب اسلام کا آغاز ہوا تو اپنے ابتدائی وطن مکہ میں اس کو شدید ترین قسم کے ظلم و زیادتی کا شکار ہونا پڑا۔ مگر اس ظلم و زیادتی نے اسلام کی تحریک کو اور اہل اسلام کی مختصر جماعت کو صرف مظلوم بنا کر نہیں چھوڑ دیا۔ بلکہ مغلوبیت کی اس حالت سے فتح و غلبہ کا ایک نیا دور پیدا ہوا۔ جس گروہ کو اپنے وطن مکہ میں جگہ نہیں ملی تھی اس نے ایک صدی کے اندر تمام عالم میں اپنے لئے ایک ممتاز جگہ حاصل کرلی۔

دوسری مثال یورپ کی مسیحی قوموں کی ہے۔ مسلمانوں نے صلیبی جنگوں (۱۰۹۵ - ۱۲۹۱) میں مسیحی قوموں کو شدید ترین شکست دی۔ مگر یہ شکست مغربی قوموں کے مستقبل کا خاتمہ نہ کرسکی۔ شکست کے چند سو سال بعد یہ مسیحی قومیں نئی تہذیب اور نئی طاقت کے ساتھ ابھریں۔ انھوں نے مسلمانوں سمیت تمام اقوام کے اوپر براہ راست یا بالواسطہ طور پر غلبہ حاصل کرلیا۔ یہ غلبہ تا حال جاری اور قائم ہے۔

اذن اللہ

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مغلوب گروہوں کو دوبارہ غلبہ کا یہ مقام کیسے ملا۔ اس کا سادہ سا جواب صرف ایک لفظ میں چھپا ہوا ہے اور وہ قرآن کی مذکورہ آیت کے مطابق اذن اللہ (البقرہ ۲۴۹) ہے۔ یعنی اللہ کا حکم، بالفاظ دیگر، قانون فطرت کی پیروی۔

فطرت کی دنیا میں اللہ تعالیٰ نے یہ قانون جاری کر رکھا ہے کہ کوئی چیز ہمیشہ کے لئے ضائع نہ ہوسکے۔ جب بھی کسی چیز کے ساتھ نقصان کی کوئی صورت پیش آئے تو وہ اپنی کھوئی ہوئی صلاحیت کو دوبارہ حاصل کرکے اپنی سابقہ حیثیت کو از سر نو بحال کرلے۔ یہ اذن اللہ (قانون فطرت) ہے۔ قوموں کے عروج وزوال

کے معاملہ کو اسی کی روشنی میں سمجھا جاسکتا ہے۔

یہ فطرت کا ایک آفاقی اصول ہے۔ وہ نہ صرف انسانوں میں بلکہ ساری دنیا میں قائم ہے۔ اس اصول کو عام طور پر تعویض (compensation) کا اصول کہا جاتا ہے۔ فطرت میں جب بھی کہیں کوئی کمی واقع ہوتی ہے تو وہیں اس کمی کی تلافی یا تعویض کا عمل بھی جاری ہو جاتا ہے۔ فوراً ایسے اسباب حرکت میں آجاتے ہیں جو کمی کی تلافی کرکے سابقہ صورت حال کو دوبارہ بحال کرسکیں۔

کمی کی تلافی (compensation) کا یہ اصول فطرت کا ایک عام اصول ہے۔ مثلاً اپنے کمرہ میں آپ ہوا نکالنے والا پنکھا (اکزاسٹ فین) لگائیں تو جب وہ کمرہ کی ہوا باہر نکالے گا تو فوراً ہی باہر کی ہوا کمرہ کے اندر آنا شروع ہو جائے گی تاکہ کمرہ کو دوبارہ ہوا سے پر کرسکے۔ انسان کے جسم میں خون کی مقدار اوسط طور پر اس کے جسم کے وزن کا سات سے آٹھ فی صد حصہ ہوتا ہے۔ اگر کسی حادثہ کی وجہ سے خون کا ایک حصہ نکل جائے تو پورے جسم میں ایمرجنسی کی حالت قائم ہو جاتی ہے تاکہ خون کی مقدار کو جلد از جلد برابر کیا جاسکے (2/1112)

حیاتیاتی نظام کی ایک اصطلاح ہے جس کو تعویضی امتداد (compensatory hypertrophy) یا اضافہ برائے تعویض (compensatory growth) کہا جاتا ہے۔ یہ ایک خودکار نظام ہے۔ جسم کے اندر جب بھی کسی قسم کی کوئی کمی واقع ہوتی ہے تو یہ نظام اپنے آپ حرکت میں آجاتا ہے اور جسم کے تمام ذرائع کو استعمال کرکے کم سے کم وقت میں مذکورہ کمی کی تلافی کر دیتا ہے۔

حیوانی جسم کے اکثر اعضاء جوڑے جوڑے کی صورت میں ہیں۔ اگر کسی جوڑے کا ایک عضو ضائع ہو جائے تو باقی رہنے والا عضو حجم میں بڑھنے لگتا ہے۔ اس طرح وہ اپنے استعمال کی بڑھی ہوئی مانگ کو پورا کرتا ہے۔ مثال کے طور پر انسان کے جسم میں دو گردے ہوتے ہیں۔ اگر ایک گردے کو آپریشن کے ذریعہ نکال لیا جائے تو دوسرے گردے کا حجم اپنے آپ بڑھ جائے گا تاکہ ایک گردہ دو گردوں کا کام کرسکے۔ اس کو تعویضی ردعمل کہا جاتا ہے:

Many organs of animals occur in pairs, and if one is lost the remaining member increases in size, as if responding to the demands of increased use. If one of the two kidneys of a human is removed, for example, the other increases in size. This is called a compensatory reaction. (8/442)

قرآن کی آیت (البقرہ ۲۴۹) میں اذن اللہ سے مراد فطرت کا یہی قانون ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تمام چیزوں کی فطرت اس ڈھنگ پر بنائی ہے کہ جب کسی چیز کو نقصان کا تجربہ ہو تو فوراً وہ اپنی اس کمی کو دور کرنے کی طرف متوجہ ہو جائے جس کی بنا پر اس کو یہ نقصان اٹھانا پڑا۔ جو لوگ فطرت کے اس قانون کا اتباع کریں گے وہ بالآخر اپنے کھوئے ہوئے مقام کو دوبارہ پالیں گے۔

اسی قانون فطرت کی بنا پر ایسا ہے کہ جب بھی کسی فرد یا قوم کے ساتھ کسی نقصان کا معاملہ ہوتا ہے تو اس کی اندرونی فطرت اس کو یہ رہنمائی دینے لگتی ہے کہ تم اپنی کمیوں کی تلافی کرو، اس طرح تم کھوئی ہوئی چیز کو دوبارہ حاصل کر لوگے۔ یہ قانون فطرت اس بات کا ضامن ہے کہ ہر ناکامی میں کامیابی کا پہلو نکل آئے ہر زوال کے اندر وہ اسباب پیدا ہو جائیں جو قوم کو دوبارہ عروج کی طرف لے جانے والے ہوں۔

فطرت کی رہنمائی

اب اس قانون کی روشنی میں تاریخ کے مذکورہ دونوں واقعہ کو دیکھئے۔ ہر واقعہ میں آپ کو فطرت کا یہی قانون کام کرتا ہوا نظر آئے گا۔

مثال کے طور پر اہل اسلام کی ابتدائی تاریخ میں کیا ہوا۔ مکہ میں یہ صورت حال پیش آئی کہ اہل شرک ان کے ظالم بن گئے اور اہل اسلام ان کے مقابلہ میں مظلومیت کی حد پر پہنچ گئے۔ اس کا سبب بنیادی طور پر اہل اسلام کی عددی قلت تھی۔ اس وقت مکہ کی آبادی کی اکثریت شرک پر عقیدہ رکھتی تھی۔ اسی طرح عرب کے تمام قبائل بھی مشرک تھے۔ اس بنا پر اہل مکہ کو ان کی حمایت حاصل رہتی تھی۔ اس عددی فرق نے اہل شرک کو یہ موقع دے دیا کہ وہ اہل توحید کو اپنے ظلم کا نشانہ بناسکیں۔

اہل اسلام نے اس وقت اپنی اس کمی کا ادراک کیا۔ چنانچہ انھوں نے ایسا نہیں کیا کہ مکہ میں بے فائدہ طور پر اہل شرک سے ٹکراؤ کرتے رہیں۔ اس کے بجائے انھوں نے ہجرت کا طریقہ اختیار کرلیا، تاکہ ایک نئے مقام پہ جا کر وہاں اپنا دعوتی مرکز بنائیں اور اس طرح عددی اضافہ کے لئے اپنے منصوبہ کو زیر عمل لانے کی کوشش کریں۔

یہ دعوتی عمل خاموشی کے ساتھ دس برس تک جاری رہا جس کی تفصیل سیرت کی کتابوں میں دیکھی جاسکتی ہے۔ خلاصہ یہ کہ دس سال کی مسلسل جدوجہد کے نتیجہ میں ایسا ہوا کہ عرب میں عددی تناسب بدل گیا۔ اہل شرک اقلیت بن گئے اور اہل اسلام نے ملک میں اکثریتی طبقہ کی حیثیت حاصل کر لی۔ اس

کے بعد کوئی چیز نہیں تھی جو اہل اسلام کو فتح و غلبہ تک پہنچنے سے روک سکے۔

"اذن اللہ کے تحت پیش آنے والے اس معاملہ کو قرآن میں آخری دور کی ایک سورہ میں ان الفاظ میں ظاہر کیا گیا ہے: اذا جاء نصر اللہ والفتح۔ ورأیت الناس یدخلون فی دین اللہ افواجا (جب اللہ کی مدد آجائے اور فتح ۔ اور تم دیکھو کہ لوگ اللہ کے دین میں فوج در فوج داخل ہورہے ہیں)

اسی طرح صلیبی جنگوں کے بعد یورپی قوموں کے معاملہ کو لیجئے۔ ان جنگوں میں کامل شکست کے بعد یورپی قوموں کے مدبرین نے غور کیا کہ ہماری اس ذلت آمیز شکست کا سبب کیا ہے۔ وہ اس رائے پر پہنچے کہ مسلمان علم کے میدان میں ہم سے آگے بڑھ گئے ہیں۔ ہمارے پاس صرف تلوار ہے اور ان کے پاس تلوار اور علم دونوں ہے۔ مسلمانوں کے مقابلہ میں اپنے پچھڑے پن کو مانتے ہوئے انھوں نے کہا کہ جب تک ہم اس نابرابری کو ختم نہ کریں، ہم مسلمانوں کے مقابلہ میں جیت نہیں سکتے۔

اس کے بعد مغربی قوموں نے جنگ اور مقابلہ کا راستہ چھوڑ دیا۔ وہ پوری سرگرمی کے ساتھ علم کے حصول میں لگ گئے۔ یہ کوشش کئی سو سال تک مسلسل جاری رہی۔ یہاں تک کہ انھوں نے نہ صرف اپنے زمانے کے تمام علوم کو سیکھا بلکہ خود علم کو ایک نئے دورِ ترقی میں پہنچا دیا، انھوں نے تاریخ میں پہلی بار طاقت کے معیار کو بدل دیا۔

اُس زمانہ میں لوگوں کے پاس جو علم تھا وہ صرف روایتی علم تھا۔ یورپی قوموں نے علم کے قافلہ کو روایتی دور سے آگے بڑھا کر سائنٹفک دور میں پہنچا دیا۔ انھوں نے دستکاری کی صنعت کو مشینی صنعت میں تبدیل کر دیا۔ فطرت کی دنیا میں جو خزانے اربوں سال سے چھپے ہوئے تھے ان کو انھوں نے نکال کر انھیں انسانی خدمت میں لگا دیا، وغیرہ۔

مسیحی قوموں نے جب ایسا کیا تو نہ صرف ان کی کمزوریوں کی تلافی ہوئی بلکہ اُن کے اِن صحت بخش کارناموں نے ان کو سارے عالم انسانی کا ہیرو بنا دیا۔

شاہراہ سے انحراف

اوپر کی تفصیلات سے معلوم ہوا کہ قوموں کی تاریخ میں عام طور پر یہ ملتا ہے کہ جب انھیں کسی کے مقابلہ میں شکست پیش آتی ہے تو ان کی فطرت رہنمائی کرتی ہے۔ شکست کے جلد ہی بعد ان

کے اندر اپنی کمیوں کی تلافی کا عمل شروع ہوجاتا ہے۔ یہ عمل جاری رہتا ہے، یہاں تک کہ قوم اپنی کھوئی ہوئی حیثیت کو دوبارہ حاصل کرلیتی ہے۔ موجودہ زمانہ میں فرانس، جرمنی، جاپان وغیرہ اس کی مثالیں ہیں۔ یہ قومیں دوسری عالمی جنگ میں برباد ہوگئی تھیں۔ مگر جنگ کے فوراً بعد ان کے اندر تلافی کا عمل جاری ہوگیا۔ آج یہ قومیں پہلے سے بھی زیادہ طاقت ور حیثیت حاصل کرچکی ہیں۔

لیکن مسلمانوں کا معاملہ استثنائی طور پر اس سے الگ ہے۔ مسلمان موجودہ زمانہ میں دوسری قوموں کے مقابلہ میں شکست سے دوچار ہوئے۔ مگر کئی سو سال کی مدت گزر گئی اور اب تک ان کے اندر قومی پیمانہ پر تلافی مافات کا عمل جاری نہ ہوسکا۔ اس کا واحد سبب غلط رہنمائی ہے۔ مسلم رہنماؤں نے اپنی غلط رہنمائی سے مسلمانوں کے ذہن کو اس طرح بگاڑا کہ وہ اس قابل نہ رہے کہ فطرت کی آواز کو سنیں اور اس کی پیروی میں اپنی تعمیر نو کا کام انجام دیں۔

ایک علامتی واقعہ

مولانا حسین احمد مدنی (۱۹۵۷-۱۸۷۹) نے اپنی خود نوشت سوانح حیات میں ۱۸۵۷ کے جہاد آزادی کا تذکرہ تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔ اس سلسلہ میں انھوں نے بتایا ہے کہ علماء دیوبند میں ایک ممتاز عالم مولانا شیخ محمد صاحب تھے۔ "مولانا کی رائے یہ تھی کہ انگریزوں کے خلاف جہاد کرنا ہم مسلمانوں پر فرض تو درکنار موجودہ احوال میں جائز ہی نہیں"۔

اس موضوع پر غور وفکر کے لئے دیوبند میں اکابر علماء کا ایک اجتماع ہوا۔ اس موقع پر مولانا قاسم نانوتوی نے نہایت ادب کے ساتھ مولانا شیخ محمد صاحب سے پوچھا کہ حضرت، کیا وجہ ہے کہ آپ ان دشمنان دین ووطن پر جہاد کو فرض بلکہ جائز بھی نہیں فرماتے۔ انھوں نے جواب دیا کہ ہمارے پاس اسلحہ اور آلات جہاد نہیں ہیں۔ ہم بالکل بے سروسامان ہیں۔ مولانا نانوتوی نے عرض کیا کہ کیا اتنا بھی سامان نہیں ہے جتنا کہ غزوۂ بدر میں تھا۔ اس پر مولانا شیخ محمد نے سکوت فرمایا (نقش حیات، جلد دوم، ۱۹۵۴، صفحہ ۴۰)

اس کے بعد علماء اور عوام کی ایک جماعت جہاد کے لئے نکلی۔ شاملی (سہارن پور) کے میدان میں انگریزی فوج سے اس کا مقابلہ ہوا۔ مسلم مجاہدین کے پاس زیادہ تر تلوار اور بھالے تھے اور انگریزوں کے پاس بندوق اور توپ۔ چنانچہ بدترین شکست ہوئی۔ کچھ لوگ مارے گئے، کچھ لوگوں کو انگریزوں

نے اپنا قیدی بنالیا۔ (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو : سوانح قاسمی، از مولانا مناظر احسن گیلانی)

یہ واقعہ علامتی طور پر بتاتا ہے کہ موجودہ زمانہ میں جب غیر قوموں نے مسلمانوں کے اوپر غلبہ حاصل کر لیا تو اس کے بعد وہ کون سا حادثہ پیش آیا جس نے مسلمانوں کی جدید تاریخ کو مسلسل بربادی کی تاریخ بنادیا۔ وہ دراصل اذن اللہ (قانون فطرت) سے انحراف تھا۔

مذکورہ واقعہ میں مولانا شیخ محمد صاحب گویا فطرت کے ترجمان تھے۔ ان کا شعور یہ کہہ رہا تھا کہ اس وقت اصل مسئلہ طاقت کی نابرابری کا ہے۔ اس لئے ہمیں سب سے پہلے اس نابرابری کو ختم کرنا چاہئے۔ اس نابرابری کو دور کئے بغیر لڑائی لڑنا صرف خودکشی ہے۔ مگر دوسرے علماء ردعمل کے جذبات سے مغلوب ہوکر اس ضروری پہلو کو بھول گئے۔ وہ جوش میں آکر صرف جنگی اقدام کی باتیں کرنے لگے۔ اس ماحول میں مولانا شیخ محمد صاحب برسر حق ہونے کے باوجود اکیلے رہ گئے۔ چنانچہ ملت کا قافلہ، غلط رہنمائی کے نتیجہ میں فطرت کی شاہراہ کو چھوڑ کر بے فائدہ ٹکراؤ کی اندھی راہوں میں چل پڑا۔ اس کے بعد اس نے قربانی کی مثالیں تو ضرور قائم کیں، مگر وہ قوم کی تعمیر جدید اور اس کے از سر نو غلبہ کی مثال قائم نہ کر سکے۔

تجدید موت

یہاں مسلمانوں کے سلسلہ میں ایک اور عجیب تر استثناء سامنے آیا ہے۔ اور وہ ہے مسلسل ہلاکت کے بعد بھی کوئی سبق نہ لینا۔ دوسری قوموں کی تاریخ بتاتی ہے کہ ابتدائی ردعمل کے تحت اگر انھوں نے غیر مساوی فریق کے ساتھ جنگ کر لی اور اس کے نتیجے میں ہلاکت پیش آئی تو قوم فوراً سنبھل گئی۔ اس نے مزید بے فائدہ ٹکراؤ جاری نہیں رکھا۔ مثال کے طور پر ۱۸۵۰ میں جاپان کا امریکہ سے ابتدائی ٹکراؤ کے بعد حصول علم میں لگ جانا۔ مگر مسلمان حیرت انگیز طور پر یہ نمونہ پیش کر رہے ہیں کہ وہ ناقابل بیان ہلاکتوں کے باوجود اپنے رویہ پر نظر ثانی کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔

اس فرق کا سبب یہ ہے کہ مسلمانوں کے پاس ایک ایسا عقیدہ ہے جو دوسری کسی قوم کو حاصل نہیں۔ یہ عقیدہ "شہادت" کا تصور ہے۔ مسلمان کے لئے اپنے عقیدہ کی رو سے یہ ممکن ہوتا ہے کہ وہ اپنی ہر ہلاکت کو شہادت بتا کر اس کو اپنے کارنامہ کے خانہ میں ڈال سکے۔

موجودہ دور کے مسلم رہنماؤں نے اس عقیدہ کا مبالغہ آمیز حد تک بے جا استعمال کیا۔ وہ مسلمانوں کی ہر ہلاکت کو شہادت بتا کر اس کو گلوریفائی کرتے رہے۔ حتی کہ بذات خود مرمٹنے کو مقصود اعلیٰ

بناکر پیش کیا۔ مسلمانوں کی مجلسیں ہر طرف اس قسم کے پرجوش ترانوں سے گونج اٹھیں :

شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن نہ مال غنیمت نہ کشور کشائی

ناماوی ٹکراؤ کے بعد مسلمانوں کو جس یک طرفہ ہلاکت کا تجربہ ہوا، اس کے بعد یہ بالکل فطری تھا کہ لوگوں کے اندر نئی سوچ پیدا ہو۔ وہ بے فائدہ تصادم کو چھوڑ کر اپنی مثبت تعمیر میں لگ جائیں۔ مگر موت کو شہادت بنا کر اس کا جو مبالغہ آمیز گلوری فیکیشن (glorification) کیا گیا اس نے مسلمانوں سے یہ ذہن چھین لیا کہ وہ اپنی تباہی کو تباہی سمجھیں اور اس سے سبق لے کر از سر نو اپنے عمل کی منصوبہ بندی کریں۔

ملت کا قافلہ جو فطرت کی صراط مستقیم سے ہٹ کر تباہی کے راستوں پر چل پڑا تھا وہ بدستور اس پر چلتا رہا۔ اور آج تک اسی رخ پر چلا جارہا ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ اپنے بگڑے ہوئے ذہن کی بنا پر وہ اپنے اس عمل کو مجاہدانہ قربانی سمجھ رہا ہے نہ کہ احمقانہ ہلاکت۔

ہیروانہ کردار

نفسیات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ انسان جب کسی سخت حادثہ سے دوچار ہوتا ہے تو اس کے ذہن میں سخت ہیجان برپا ہوتا ہے۔ علماء نفسیات کے الفاظ میں، اس کے اندر ایک قسم کے دماغی طوفان (brainstorming) کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس وقت عام انسان ایک غیر معمولی انسان بن جاتا ہے۔ ایک غیر معروف آدمی ہیروانہ کردار ادا کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔

مسلمانوں کی جدید تاریخ میں یہ واقعہ عملاً پیش آچکا ہے۔ مغربی قوموں نے جب مسلمانوں سے ان کا سیاسی اقتدار چھینا اور ان کی تہذیبی عظمت کو پامال کیا تو لاکھوں مسلمانوں کے اندر وہی کیفیت شدت کے ساتھ پیدا ہو گئی جس کو نفسیات میں دماغی طوفان کہا جاتا ہے۔ ان میں کا ایک ایک شخص ہیرو کے روپ میں ابھر آیا اور انھوں نے جنگ کے میدان میں غیر معمولی بہادری دکھائی۔

سلطان ٹیپو ۱۷۹۹ میں تن تنہا برٹش سلطنت سے ٹکرا گئے۔ حالانکہ اس وقت یہ ٹکرانا ایسا ہی تھا جیسے چیونٹی کا ہاتھی سے ٹکرانا۔ سید احمد بریلوی کا قافلہ ۱۸۳۱ میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کی فوجوں سے بے باکانہ طور پر لڑ گیا۔ حالانکہ مہاراجہ کے پاس مقابلۃً بہت زیادہ طاقتور فوج تھی، اور اس کی فوج کو نپولین کے فوجی افسروں نے تربیت دی تھی۔ علماء ہند کی جماعت نے ۱۸۵۷ میں ایسٹ انڈیا کمپنی

کی منظم فوج سے نہایت دلیرانہ جنگ کی۔ حالانکہ علماء کے پاس زیادہ تر تلواریں تھیں، اور انگریزوں کے پاس پورا توپ خانہ موجود تھا۔ وغیرہ، وغیرہ

مغربی چیلنج پیش آنے کے بعد مسلمانوں کے اندر ایک شدید قسم کا "دماغی طوفان" اٹھا تھا۔ فطرت کے قانون نے اس وقت مسلمانوں کو بے پناہ بنا دیا تھا۔ یہ بلاشبہ ملت کا عظیم ترین سرمایہ تھا جو ہیروانہ کردار ادا کرنے کی طاقت رکھتا تھا۔ مگر ہمارے رہنماؤں نے اس جذبہ کو غلط رخ پر ڈال دیا۔ اگر بروقت صحیح رہنمائی دی جاتی اور اس طوفانی جوش کو خارجی ٹکراؤ کے بجائے اندرونی تعمیر کے محاذ پر لگایا جاتا تو یقینی طور پر آج ملت مسلمہ کی تاریخ دوسری ہوتی۔

ضرورت تھی کہ اس وقت مسلمانوں کو یہ احساس دلایا جائے کہ تمہارا مسئلہ حقیقۃً داخلی کمی کا مسئلہ ہے نہ کہ خارجی جارحیت کا مسئلہ۔ آج زمانہ سائنسی طاقت کے دور میں پہنچ گیا ہے اور تم ابھی تک روایتی طاقت کے دور میں جی رہے ہو۔ اس لئے تم کو چاہئے کہ ٹکراؤ سے اعراض کرتے ہوئے اپنی کمیوں کو دور کرو۔ اگر تم نے جدید تقاضوں کے مطابق اپنے آپ کو تیار کر لیا تو اس کے بعد اپنے آپ وہ وقت آئے گا کہ تم دوبارہ غالب حیثیت حاصل کر لوگے۔

اگر ایسا کیا گیا ہوتا تو مسلمانوں کے ابھرے ہوئے جذبات علم کے حصول اور ترقیاتی نشانوں کی تکمیل میں لگ جاتے۔ جو ہیروانہ کردار جنگ کے میدان میں ضائع ہو گیا وہ تعمیر و استحکام کے محاذ پر استعمال ہونا ——— یہی وہ مقام ہے جہاں غلط رہنمائی نے مسلمانوں کو بھٹکا دیا ہے، اور یہی وہ مقام ہے جہاں دوبارہ صحیح رہنمائی دے کر انھیں ترقی اور کامیابی کی منزل کی طرف سرگرم سفر کیا جا سکتا ہے۔

اعداد قوت نہ کہ استعمال قوت

قرآن کا ایک حکم وہ ہے جو قاتلوا (البقرہ ۱۹۰) کے الفاظ میں دیا گیا ہے۔ یعنی اے مسلمانو، جنگ کرو۔ قرآن کا دوسرا حکم وہ ہے جو مسلمانوں کو اعدادِ قوت (الانفال ۶۰) کی تاکید کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اے مسلمانو، قوت فراہم کرو۔

موجودہ زمانہ کے مسلمان قاتلوا کے حکم کے مخاطب نہ تھے۔ کیوں کہ ان کے اندر وہ شرطیں موجود ہی نہ تھیں جو قتال کے عمل کے لئے ضروری ہیں۔ مسلمانوں کی موجودہ عملی حالت کے ساتھ جنگ کرنا ان کے لئے صرف خودکشی کرنے کے ہم معنی تھا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ مسلمانوں نے اپنے مفروضہ دشمنوں سے

ہزاروں بار ٹکراؤ کیا، اور ہر ٹکراؤ یک طرفہ طور پر مسلمانوں کی کامل بربادی پر ختم ہوا۔

مسلمان موجودہ زمانہ میں اعدادِ قوت کے حکم قرآنی کے مخاطب تھے۔ یعنی فریق ثانی کے مقابلہ میں اپنی کمیوں کو جاننا اور ان کمیوں کو دور کرنے کی کوشش کرنا۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کا جہاد اعدادِ قوت تھا نہ کہ استعمالِ قوت۔ مگر موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے رہنماؤں نے اس راز کو نہیں سمجھا۔ ناقابل فہم نادانی کے تحت وہ مسلمانوں کو جوش دلاکر انھیں ان کے حریفوں سے ٹکراتے رہے۔ انھوں نے اپنے عمل کا آغاز " بانگ درا " سے کیا نہ کہ خاموش تیاری سے۔ اس قسم کی نادانی کا آخری نتیجہ بربادی تھا۔ اور وہی اپنی کامل ترین صورت میں مسلمانوں کے حصہ میں آیا۔

کرنے کا کام

ملت کے احیاء نو کے لئے اس وقت کرنے کا کام صرف ایک ہے۔ اور وہ یہ کہ ملت کے افراد میں اس فطری عمل کے جاری ہونے کے مواقع پیدا کئے جائیں جس کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے۔ فطرت خود سب سے بہتر رہنما ہے۔ اگر بیرونی رہنما بھٹکانے کا کام نہ کریں تو اندرونی فطرت اپنے آپ لوگوں کی رہنما بن جائے گی۔ وہ وہی کریں گے جو انھیں کرنا چاہئے، اور وہ نہیں کریں گے جو ان کو نہیں کرنا چاہئے۔

اس وقت ملت کا پہلا مسئلہ یہ ہے کہ وہ تعلیم یافتہ بنے۔ اس کے شعور کی صلاحیت کو ابھارا جائے۔ اس کے اندر حقیقت پسندانہ فکر پیدا کیا جائے۔ ناممکن چٹانوں سے سر ٹکرانے کے بجائے اس کو ممکن میدانوں میں سرگرم عمل کیا جائے۔ خوش خیالیوں میں جینے کے بجائے لوگوں کو حقائق میں جینے والا بنایا جائے۔ جو لوگ آج سماج کا احتجاجی گروپ (protestant group) بنے ہوئے ہیں، ان کو اٹھا کر سماج کا تخلیقی گروپ (creative group) بنا دیا جائے۔

تعمیر خویش کا یہ عمل صرف پر امن حالات میں جاری ہو سکتا ہے۔ اس لئے اس کے ساتھ یہ بھی لازمی طور پر ضروری ہے کہ جنگ اور ٹکراؤ سے آخری حد تک پرہیز کیا جائے۔ اشتعال انگیزی پر مشتعل ہونے کا طریقہ مکمل طور پر ختم کر دیا جائے۔ ناخوشگوار باتوں کے متعلق شعوری طور پر یہ فیصلہ کر لیا جائے کہ ان سے الجھنا نہیں ہے بلکہ ان سے اعراض کرنا ہے۔ اختلافی امور میں ردعمل کے بجائے صبر کا طریقہ اختیار کیا جائے۔

ایک کام کو کرنے کے لئے دوسرے کام کو چھوڑنا پڑتا ہے۔ اگر آپ چھوڑنے والے کام کو نہ چھوڑیں تو آپ کرنے والے کام کو بھی انجام نہیں دے سکتے۔

عمل کا رخ

سوچنے کا عمل (thought process) سب سے بڑا عمل ہے جو انسان کی شخصیت کے اندر واقع ہوتا ہے۔ تمام اعمال اسی سوچ کے تحت انجام پاتے ہیں۔ قدیم فلاسفہ بھی متفرق طور پر اس انسانی ظاہرہ پر اظہار خیال کرتے رہے ہیں۔ مگر موجودہ زمانہ میں اس موضوع پر مستقل تحقیقات ہوئی ہیں اور بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں۔ چند کتابوں کے نام یہ ہیں :

Stuart Hamshire, *Thought and Action*, 1959
Myles Brand, *The Nature of Human Action*, 1970
D. Rapaport, *Toward a Theory of Thinking*, 1951
W.E. Vinacke, *The Psychology of Thinking*, 1952
D.M. Johnson, *The Psychology of Thought and Judgement*, 1955
F.C. Bartlett, *Thinking*, 1958
Max Wertheimer, *Productive Thinking*, 1959
H. Bergson, *The Creative Mind*, 1946
N. Berdyaev, *The Meaning of the Creative Act*, 1955
Arthur Koestler, *The Act of Creation*, 1964.

سوچنے کا یہ عمل عام حالات میں بھی انسان کے دماغ میں برابر جاری رہتا ہے۔ مگر جب انسان کسی اندرونی یا بیرونی حادثہ سے دوچار ہوتا ہے تو یہ عمل بے پناہ حد تک بڑھ جاتا ہے۔ اس وقت آدمی کے اندر ایک سخت ہیجانی کیفیت پیدا ہوتی ہے جس کو علماء نفسیات دماغی طوفان (brainstorming) کا نام دیتے ہیں۔

اس فکری ہیجان کے وقت آدمی ایسی باتیں سوچتا ہے جن کو وہ عام حالات میں نہیں سوچ سکتا، وہ ایسے کام کر گزرتا ہے جن کو وہ عام حالات میں نہیں کر سکتا۔ اس قسم کے چیلنج جب آتے ہیں تو وہ آدمی کو ہیرو بنا دیتے ہیں۔ وہ اس کی دماغی قوتوں کو اس طرح جگا دیتے ہیں کہ عام حالات میں اگر اس کا ذہن صرف حل (solution) تک پہنچ سکتا تھا تو اب وہ برتر حل (superior solution) تک پہنچ جاتا ہے (18/357)

یہی مشکل حالات آدمی کے اندر وہ انتہائی قیمتی چیز پیدا کرتے ہیں جس کو تخلیقی فکر (creative thinking) کہا جاتا ہے۔ عام حالات میں آدمی کا ذہن صرف معمول کی باتیں سوچ پاتا ہے۔ غیر معمولی حالات میں آدمی کا ذہن غیر معمولی باتیں سوچنے لگتا ہے۔ اور جب تک یہ غیر معمولی سوچ

نہ ابھرے کوئی آدمی کبھی تخلیقی مفکر نہیں بن سکتا۔

کسی فرد یا کسی قوم کی زندگی میں جب اس قسم کے سنگین لمحات آتے ہیں تو یہ اس فرد یا قوم کے لیے بے حد نازک وقت ہوتا ہے۔ کیونکہ ایسا تجربہ اس کو بیک وقت دو انتہائی امکانات کے کنارے کھڑا کر دیتا ہے۔ یہ وہ فیصلہ کن وقت ہوتا ہے جب کہ یہ طے کرنا ہوتا ہے کہ اس کی شخصیت کا موجزن سیلاب کون سا رخ اختیار کرے ـــــ تعمیر کا رخ، یا تخریب کا رخ ـــــ جذباتی ہیجان کو اگر تعمیر کی سمت میں موڑ دیا جائے تو قوم ترقی کرے گی۔ اور اگر ان جذبات کو تخریب کی سمت میں موڑ دیا جائے تو پوری قوم تباہ ہو کر رہ جائے گی۔

جاپان کی مثال

انیسویں صدی کے وسط تک جاپان بند ملک کی حیثیت رکھتا تھا۔ صرف ندرلینڈ ایک ایسا ملک تھا جس سے جاپان کے تجارتی تعلقات تھے۔ امریکہ اور برطانیہ اور فرانس نے چاہا کہ جاپان کو ایک کھلا ملک بنائیں اور وہاں داخل ہو کر تجارت کریں۔ مگر جاپان کی حکومت اس کے لیے راضی نہیں ہوئی۔

اس کے بعد برطانیہ اور فرانس اور امریکہ نے اپنے جنگی جہاز (warships) جاپان کے ساحل پر پہنچا دیے۔ یہ جہاز اسٹیم انجن سے چلتے تھے۔ مگر جاپان ابھی تک اسٹیم پاور کو اختیار نہ کر سکا تھا۔ اس وقت جاپان کے پاس دستی ہتھیار تھے اور مغربی قوموں کے پاس دور مار ہتھیار۔ چنانچہ جاپان نے ابتدائی ٹکراؤ کے بعد ہی جان لیا کہ جنگ میں ہم ان قوموں سے جیت نہیں سکتے۔

حکومت جاپان نے جلد ہی ٹکراؤ کو ختم کر دیا۔ جاپانی مفکرین نے اپنی قوم کے ابھرتے ہوئے جذبات کو انتہا پسندی کے بجائے حقیقت پسندی کی طرف موڑ دیا۔ انھوں نے دیکھا کہ اہلِ مغرب کی بندوقوں کے مقابلہ میں ہماری تلواریں کارآمد نہیں ہیں۔ ہماری چپوؤں سے چلنے والی کشتیاں ان کے اسٹیم انجن سے چلنے والے جہازوں کا مقابلہ کرنے سے عاجز ہیں۔ انھوں نے محسوس کیا کہ ان بیرونی قوموں کو فوجی طاقت میں فیصلہ کن برتری حاصل ہے۔ ان پر واضح ہو گیا کہ بیرونی قوموں کو طاقت کے ذریعہ بھگانا ممکن نہیں (EB-10/78)

پہلے ہی تجربہ میں جاپانی رہنماؤں نے اعتراف کر لیا کہ ان کے اور مغرب کے درمیان ایک فیصلہ کن فرق واقع ہو گیا ہے۔ وہ یہ کہ جاپان جسمانی طاقت کے دور میں ہے، اور مغربی قومیں

دماغی طاقت کے دور میں پہنچ گئی ہیں۔ اس لیے پہلا کام اس فرق کو ختم کرنا ہے نہ کہ بے فائدہ طور پر مغربی قوموں سے ٹکراؤ کرنا۔ اس کے بعد انھوں نے مغربی قوموں سے ٹکراؤ کو ختم کرنے کے لیے جاپان کے دروازے کھول دیے۔

اس تجربہ کے بعد جاپانیوں میں شدید جذبات ابھرے تھے۔ مگر ان کے رہنماؤں نے ان جذبات کو صحیح رخ دیا۔ انھوں نے ٹکراؤ کے میدان سے ہٹ کر علم کے میدان میں اپنی محنت شروع کر دی۔ اس کے بعد ان کے یہاں تبدیلی کا وہ دور آیا جس کو میجی رسٹوریشن (Meiji restoration) کہا جاتا ہے۔

ٹکراؤ کے میدان سے ہٹنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ جاپان کی سائنسی اور صنعتی ترقی شروع ہو گئی۔ یہاں تک کہ وہ جدید ٹکنالوجی کے دور میں پہنچ گیا۔ دوسری جنگ عظیم کے وقت دوبارہ یہی صورت حال پیدا ہوئی۔ جاپان نے ابتداءً امریکہ اور اس کے مغربی حلیفوں سے ٹکر لی۔ مگر ۱۹۴۵ میں جب امریکہ نے جاپان پر ایٹم گرائے تو دوبارہ جاپانیوں نے یہ جانا کہ وہ اگرچہ ٹکنالوجی کے دور میں داخل ہو گئے ہیں، مگر امریکہ سپر ٹکنالوجی کے دور میں پہنچ چکا ہے۔ جاپانی رہنماؤں نے دوبارہ اپنی قوم کے ابھرتے ہوئے جذبات کو تعمیری رخ دیا۔ انھوں نے بے فائدہ جنگ کو یک طرفہ طور پر ختم کر دیا اور از سر نو سائنس کے میدان میں ترقی کرنے لگے۔ یہاں تک کہ وہ وقت آیا کہ جاپان ایک صنعتی دیو (industrial giant) بن کر دنیا کے نقشہ پر چھا گیا۔

مسلمان دور جدید میں

انیسویں اور بیسویں صدی کے مسلمان کم از کم دو بار اس قسم کے شدید حالات سے گزرے جب کہ ان کے اندر شخصی اور قومی سطح پر دماغی طوفان کی مذکورہ بالا کیفیت پیدا ہوئی۔ اب اہم ترین ضرورت تھی کہ ان کو بر وقت صحیح رہنمائی ملے۔ مگر دونوں بار مسلم رہنماؤں نے ناقابل فہم حد تک غلط رہنمائی دی۔ اس وقت اصل کام یہ تھا کہ مسلمانوں کے اندر اٹھتے ہوئے فکری طوفان کو تعمیر کی طرف موڑ دیا جائے۔ مگر عملاً اس کے برعکس ہوا۔ تمام مسلم رہنماؤں نے انتہائی نادانی کے تحت مسلمانوں کے جذبات کو تخریب کی طرف موڑ دیا۔

اسی غلط رہنمائی کا یہ نتیجہ ہے کہ دو سو سال کی بے پناہ قربانیوں کے باوجود مسلم ملت کے حصہ میں تباہی و بربادی کے سوا کچھ اور نہیں آیا۔

۳۱ جولائی ۱۹۸۸ کو کشمیر میں جو مسلح تحریک شروع ہوئی وہ بھی اسی غلط رہنمائی کی ایک تازہ مثال ہے۔ کشمیر کے نوجوانوں کے اندر ان کے حالات کے نتیجہ میں "دماغی طوفان" برپا ہوا تھا۔ اندر اور باہر کے کچھ نادان رہنماؤں نے اس دماغی طوفان کو تخریب کی طرف موڑ دیا۔ اس کے نتیجہ میں کشمیر نے پایا تو کچھ نہیں۔ البتہ اس کے تمام بہترین امکانات ناقابل تلافی حد تک برباد ہو کر رہ گئے۔

کشمیر کے نوجوانوں کے اندر ان کے حالات کے نتیجہ میں جو دماغی طوفان ابھرا تھا اس کو اگر حقیقی معنوں میں تعمیر کی طرف موڑ دیا جاتا تو ان کا سارا جوش مثبت تیاریوں میں استعمال ہونے لگتا۔ وہ کشمیر کی قدرتی حسن کی دنیا میں انسانی ترقیوں کا ایک چمنستان اگاتے۔ اور پھر کشمیر میں تعمیری انقلاب کی ایک ایسی دنیا ابھرتی جو اس کو حقیقی معنوں میں برصغیر ہند کا تاج بنا دیتی۔

اسلام ایک ابدی مذہب ہے۔ اس میں ہر قسم کے حالات کے لیے رہنمائی موجود ہے۔ چنانچہ اس معاملہ میں بھی اسلام کی تعلیمات اور اس کی تاریخ میں واضح رہنمائی موجود تھی۔ مگر موجودہ مسلم قائدین کا المیہ یہ ہے کہ انھوں نے اسلام کو اپنے لیے فخر تو بنایا، مگر وہ اس کو اپنے لیے رہنمائی نہ بنا سکے۔ اور جب دین کو سامان فخر بنا لیا جائے تو وہ سامانِ ہدایت کی حیثیت سے اپنی اہمیت کھو دیتا ہے۔

قدیم مکہ میں جب رسول اور اصحاب رسول نے توحید کی دعوت دی تو اہل مکہ کی طرف سے شدید ترین مزاحمت کی جانے لگی۔ اہلِ مکہ کی زیادتیوں اور اشتعال انگیز کارروائیوں نے اہل اسلام کے اندر "دماغی طوفان" کی حالت پیدا کر دی۔ اپنے ابتدائی تاثر کے تحت وہ لڑنے مرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے اس فکری ہیجان کو تخریب کے بجائے تعمیر کی طرف موڑ دیا۔ آپ نے فرمایا کہ تم سب لوگ مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ چلے جاؤ اور اس کو اسلامی مرکز بنا کر وہاں اپنا دعوتی کام کرو۔

حدیبیہ کے موقع پر بھی یہی صورت حال پیش آئی۔ اہل مکہ کی ضد اور اشتعال انگیزی کے نتیجہ میں دوبارہ صحابہ کے اندر "دماغی طوفان" اٹھا۔ اس کے زیر اثر وہ اہل مکہ سے لڑنے پر آمادہ ہو گئے۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوبارہ ان کے جذبات کو تخریب سے تعمیر کی طرف موڑ دیا، صحابہ کے جوش و خروش کو جنگ کے بجائے دعوت کے میدان میں مصروف عمل کر دیا۔

اللہ کا یہ عجیب معاملہ ہے کہ اس نے مشکلات کو ہمارے لیے مزید ترقی کا زینہ بنا دیا۔ اس نے

اپنی قدرت خاص سے ہمارے نہیں کو ہمارے ہے میں تبدیل کر دیا۔

چیلنج کا جواب

انگریز مورخ ٹوائن بی (Arnold Toynbee) نے عالمی تاریخ کے گہرے مطالعہ کے بعد اپنی مشہور کتاب مطالعہ تاریخ (A Study of History) لکھی جو ۱۲ جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس میں ۲۱ تہذیبوں کا مطالعہ کیا گیا ہے۔ ٹوائن بی کی تحقیق کا خلاصہ یہ ہے کہ چیلنج اور اس کا جواب (Challenge-response) میکانزم وہ چیز ہے جو قوموں کے مستقبل کا فیصلہ کرتا ہے۔

ٹوائن بی کے مطابق، خارجی چیلنج ہی وہ لازمی عمل ہے جو افراد یا قوموں کے امکانات کو جگا دیتا ہے۔ تہذیب کا ابتدائی اور بنیادی مرحلہ ماحول کے ایسے چیلنج سے ظہور میں آتا ہے جو نہ اتنا سخت ہو کہ ترقی کو روک دے، نہ اتنا موافق ہو کہ وہ تخلیقیت کو معطل کر دے۔ قوم کی ایک تخلیقی اقلیت اس چیلنج کا جواب دیتی ہے اور قوم کے لئے رہنمائی فراہم کرتی ہے:

> The initial stage of a civilization is its growth, brought about by an environmental challenge, neither too severe to stifle progress nor too favourable to inhibit creativity, which finds a response among a creative minority that provides leadership to the passive majority. (X/76)

اس کا مطلب یہ ہے کہ زندگی کی مصیبتیں (troubles) لوگوں کی صلاحیتوں کو جگاتی ہیں بشرطیکہ وہ اتنی زیادہ نہ ہوں کہ آدمی اس کے نیچے دب کر رہ جائے۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو مومن سب سے زیادہ تخلیقی انسان ثابت ہو سکتا ہے، کیوں کہ مومن کے اندر سہنے اور تاب لانے کی صلاحیت سب سے زیادہ ہوتی ہے۔

عام انسان صرف اپنے آپ میں عقیدہ رکھتا ہے۔ وہ صرف اپنی بنیاد پر کھڑا ہوتا ہے دوسری طرف مومن کا معاملہ یہ ہے کہ وہ اپنے علاوہ خدائے برتر میں عقیدہ رکھتا ہے اور خدا کی بنیاد پر کھڑا ہوتا ہے۔ انسان کی قوتیں محدود ہیں، خدا کی قوتیں لامحدود۔ اس بنا پر عام انسان کے لئے کسی نہ کسی مقام پر حد آجاتی ہے۔ جب کہ مومن کے لئے کبھی حد نہیں آتی۔ جہاں

مومن کی اپنی حد ختم ہو جائے، وہاں اس کا خدا اس کی کمی کی تلافی کے لئے موجود ہوتا ہے۔

مومن دوسروں کے مقابلہ میں مصیبت اور مشکلات کو زیادہ برداشت کر سکتا ہے۔ اس لئے وہ دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ تخلیقی ثابت ہوتا ہے۔

مصیبتیں کیوں آدمی کو تخلیقی بناتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مصیبتیں انسان کے دماغ کے اجزاء (particles) کو جگاتی ہیں۔ وہ اس کی خوابیدگی کو بیداری بناتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب آدمی کے اوپر مشکلات آتی ہیں تو اس کی سوچنے اور کرنے کی صلاحیت بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے۔

اس واقعہ کے پیش نظر یہ کہنا صحیح ہے کہ عام انسان کے دماغ کے اجزاء صرف محدود طور پر جاگتے ہیں۔ جب کہ مومن کے دماغ کے اجزاء لامحدود طور پر جاگ اٹھتے ہیں۔ عام انسان کی تخلیقیت کی ایک حد ہے، مگر مومن کی تخلیقیت کی کوئی حد نہیں۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ جو شخص اللہ پر بھروسہ کرے تو اللہ اس کے لئے کافی ہے (الطلاق ۳) ارشاد ہوا ہے کہ تم لوگوں سے نہ ڈرو بلکہ اللہ سے ڈرو (المائدہ ۳) اسی طرح فرمایا گیا ہے کہ اے ایمان والو، اللہ سے ڈرو، اللہ تمہارے اعمال درست کر دے گا (الاحزاب ۷۰-۷۱)

اس قسم کی آیتوں کا مطالعہ کیجئے، اور پھر فطرت کے مذکورہ قانون کو سامنے رکھئے تو اس سے یہ اصول اخذ ہوتا ہے کہ اہل ایمان پر جب بھی مشکلات و مصائب کا لمحہ آئے تو اس وقت جو ضروری کام کرنا ہے وہ یہ کہ ان کے اندر اعتماد علی اللہ کی کیفیت کو ابھارا جائے۔ اللہ پر توکل اور اعتماد ان کے اندر برداشت کا مادہ پیدا کرے گا۔ اور جن لوگوں کے اندر سہارنے اور برداشت کرنے کی صفت ابھر آئے وہ مشکلات کے وقت ہیرو بن جاتے ہیں۔ وہ مشکلات کو اپنے لئے نفسیاتی ٹانک بنا لیتے ہیں۔

اس دنیا میں مشکل کا پیش آنا بذات خود کوئی مسئلہ نہیں، اصل مسئلہ یہ ہے کہ مشکل پیش آنے کے وقت آدمی اس کو سہارنے کی طاقت کھو دے۔ اس لئے مشکل پیش آنے کے وقت شکایت اور احتجاج میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہئے۔ بلکہ یہ کوشش کرنا چاہئے کہ آدمی کے اندر سہارنے اور برداشت کرنے کی طاقت جاگ اٹھے۔ مشکل کے وقت آدمی اگر پست ہمت ہونے سے بچ

جائے تو اس کے بعد اس کا ذہن مزید طاقت کے ساتھ متحرک ہو کر اپنے آپ مسئلہ کو حل کرلے گا۔

عسر کے ساتھ یسر

ایک بار کا واقعہ ہے۔ میں مسلمانوں کے ایک اجتماع میں شریک ہوا۔ یہ اجتماع شہر کے ایک شاندار ہال میں کیا گیا تھا۔ بے ریش اور باریش مسلمانوں سے ہال کی کرسیاں بھری ہوئی تھیں۔ اجتماع کا پروگرام قرأت سے شروع ہونے والا تھا۔ مگر عین وقت پر معلوم ہوا کہ کوئی قاری یا حافظ اجتماع میں موجود نہیں ہے۔ چنانچہ کالج کے ایک استاد اسٹیج پر آئے۔ انھوں نے پارہ عم سے دو سورتیں سادہ طور پر پڑھ کر سنائیں۔ سورہ والضحیٰ اور سورہ الم نشرح۔

اس ابتدائی کارروائی کے بعد تقریریں شروع ہوئیں۔ ایک کے بعد ایک لوگ اسٹیج پر آنا شروع ہوئے۔ لوگوں کی پرجوش تقریروں سے ہال گونجنے لگا۔ تمام تقریروں کا خلاصہ صرف ایک تھا ـــــ اسلام آج مخالفانہ سازشوں سے گھرا ہوا ہے۔ مسلمانوں کے دشمن ان کو فنا کردینے پر تلے ہوئے ہیں۔ اسلام اور مسلمانوں کو آج ہر طرف تعصب، ظلم، سازش اور عناد کا سامنا ہے۔ اسی قسم کی باتوں پر اجتماع شروع ہوا اور اسی قسم کی باتوں پر آخر کار وہ ختم ہوگیا۔

آخر میں میں مائک پر آیا۔ میں نے کہا کہ آپ حضرات نے اغیار کے خلاف تقریریں کی ہیں، مگر مجھے خود آپ کے خلاف بولنا ہے۔ آپ کو دوسروں سے شکایت ہے مجھے خود آپ سے شکایت ہے۔

آپ نے اپنا یہ اجتماع اگرچہ قرآن کی تلاوت سے شروع کیا۔ مگر یہ تلاوت محض رسمی تھی، بلکہ وہ قرآن کی نفی کے ہم معنی تھی۔ آپ لوگوں نے قرآن کو پڑھ کر قرآن کے خلاف عدم اعتماد کا اظہار کیا ہے۔

آپ نے اپنے اجتماع کے آغاز میں سورہ الم نشرح کی تلاوت کی۔ اس سورہ میں اللہ تعالیٰ نے تکرار کے ساتھ اعلان کیا ہے کہ مشکل کے ساتھ ہمیشہ آسانی ہوتی ہے، مشکل کے ساتھ ہمیشہ آسانی ہوتی ہے (فان مع العسر یسراً، ان مع العسر یسرا)

قرآن کی اس آیت کے مطابق لازماً ایسا ہونا چاہئے کہ موجودہ حالات میں اگر کچھ باتیں ہمارے خلاف ہوں، تو اسی کے ساتھ کچھ باتیں ہمارے موافق بھی ہوں۔ قرآن کے لفظوں میں، عسر کے ساتھ یسر بھی ہو۔ مگر آپ سب لوگوں نے صرف غیر موافق باتوں (عسر) کا اعلان کیا۔ آپ میں سے کسی نے موافق باتوں (یسر) کا انکشاف نہیں کیا۔ اس طرح آپ نے قرآن کے ایک جزء کا تو خوب ذکر کیا، مگر قرآن کے دوسرے جزء کو آپ نے یکسر حذف کر دیا۔

یہودی یا اور کوئی فرقہ اگر قرآن کا ایسا نسخہ چھاپے جس میں قرآن کی ایک آیت کو نکال دیا گیا ہو تو ساری دنیا کے مسلمان اس کے خلاف احتجاج کرنے کے لئے سرگرم ہو جائیں گے۔ مگر خود مسلمان عملاً یہی کام کر رہے ہیں۔ آج ہر جگہ کے مسلمانوں کا یہ حال ہے کہ وہ "عسر" کے واقعات کا خوب چرچا کرتے ہیں، مگر وہ "یسر" کے پہلوؤں کا کوئی ذکر نہیں کرتے۔

دوسرے لوگ اگر قرآن میں کمی بیشی کریں تو مسلمان اس کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ مگر خود مسلمان یہی کام زیادہ بڑے پیمانے پر کر رہے ہیں تو اس کا غلط ہونا کسی کو دکھائی نہیں دیتا۔

لوگ قرآن کی تلاوت کر رہے ہیں مگر وہ قرآن سے بے خبر ہیں۔ لوگ اپنے جلسوں کا آغاز قرآن سے کرتے ہیں، مگر وہ صرف رسمی تبرک کے لئے ہوتا ہے نہ کہ اس سے رہنمائی لینے کے لئے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کے چرچا کے باوجود قرآن کا فائدہ لوگوں کو حاصل نہیں ہوتا۔

قرآن بلاشبہہ قوموں کو اٹھانے والی کتاب ہے۔ مگر قرآن کا یہ معجزہ اس قوم کے حق میں ظاہر ہوتا ہے جو قرآن کو اپنا رہنما بنائے نہ کہ ان لوگوں کے لئے جو قرآن کے الفاظ خوش الحانی کے ساتھ دہرائیں اور اس کے بعد اس کو بند کر کے طاق پر رکھ دیں۔

خیر امّت

عام تصور یہ ہے کہ مسلمان بحیثیت قوم خیر امت کے مقام پر فائز ہیں۔ وہ تمام قوموں میں سب سے بہتر قوم کا درجہ رکھتے ہیں۔ اسی خیال کو مولانا الطاف حسین حالی نے ان لفظوں میں نظم کیا ہے:

وہ امت لقب جس کا خیر الامم تھا

مگر اس میں ایک غلط فہمی شامل ہے۔ خیر امت کا لفظ کوئی قومی لقب نہیں ہے، بلکہ وہ صفت کو بتاتا ہے۔ یعنی خیر امت مسلمانوں کا قومی یا نسلی امتیاز نہیں ہے۔ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ جو لوگ یہ مطلوبہ صفات اپنے اندر پیدا کریں گے وہ اللہ کے نزدیک خیر امت قرار پائیں گے۔

عن قتادة عن عمر في قوله تعالیٰ (كنتم خير امة) انه تلا هذه الآية ثم قال يا ايها الناس من سرّه ان يكون في الامة التي اخرجت للناس فليؤد شرط الله فيها.

قتادہ کہتے ہیں کہ حضرت عمر فاروق نے آیت (کنتم خیر امة) پڑھی اور پھر کہا کہ اے لوگو، جو شخص اس خیر امت میں ہونے کی خوشی حاصل کرنا چاہتا ہے تو وہ اس کے لئے خدا کی شرط کو پورا کرے۔

(التفسیر المظہری ۲ / ۱۱۸)

خیر امت کا مطلب

اب اس آیت پر غور کیجئے جس میں خیر امت کا لفظ آیا ہے۔

كنتم خير امة اخرجت للناس تأمرون بالمعروف وتنهون عن المنكر وتؤمنون بالله (آل عمران ۱۱۰)

تم بہترین گروہ ہو جس کو لوگوں کے واسطے نکالا گیا ہے۔ تم بھلائی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو۔ اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

مفسر ابن کثیر نے خیر امت کی تشریح میں یہ الفاظ لکھے ہیں: یعنی خير الناس للناس۔ والمعنى انهم خير الامم وانفع الناس للناس (یعنی وہ لوگوں کے لئے سب لوگوں سے بہتر ہیں۔ اور اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ سب امتوں میں بہتر ہیں اور لوگوں کے لئے سب سے زیادہ نافع ہیں) گویا وہ خیر امت اس لئے ہیں کہ وہ خیر یا نافعیت کی صفت اپنے اندر رکھتے ہیں۔ وہ لوگوں

کے لئے بالفعل خیر بننے سے خیر امت بنے ہیں نہ کہ مجرد ایک نسلی گروہ میں شامل ہونے سے۔

یہ الفاظ ابتداءً اصحاب رسول کے لئے اترے۔ جب وہ اپنے عملی اوصاف کے اعتبار سے بطور واقعہ بہتر گروہ بن گئے تو، ہجرت کے بعد اس واقعہ کا اعلان کرتے ہوئے کہا گیا کہ تم خیر امت ہو۔ اصحاب رسول کے بعد دوسرے اہل ایمان خیر امت میں شامل کئے جانے کے مستحق اس وقت ہوں گے جب کہ وہ عملی اعتبار سے ان اوصاف پر قائم ہو جائیں۔ اصحاب رسول خیر امت کا ماڈل ہیں۔ جو شخص خیر امت میں شامل ہونا چاہے وہ اس ماڈل کو اپنی زندگی میں اپنائے۔

منصب شہادت

آیت میں " خیر امت " کا منصب یہ بتایا گیا ہے کہ انھیں لوگوں کے لئے نکالا گیا ہے (اخرجت للناس)۔ یعنی اس کا ایک مشن ہے جس کو اسے اقوام عالم کے اوپر انجام دینا ہے۔ یہ مقررہ مشن قرآن کے اس بیان سے معلوم ہوتا ہے جو دوسرے مقام پر ان الفاظ میں آیا ہے:

وکذالک جعلناکم امۃ وسطاً لتکونوا شہداء علی الناس ویکون الرسول علیکم شہیدا (البقرۃ ۱۴۳)	اور اس طرح ہم نے تم کو امت وسط بنا دیا تاکہ تم لوگوں کے اوپر گواہ بنو اور رسول تمہارے اوپر گواہ ہو۔

امت وسط سے مراد امت عدل ہے۔ اس سے مراد تقریباً وہی ہے جس کے لئے دوسری جگہ خیر امت کا لفظ آیا ہے۔ دونوں لفظ ایک ہی حقیقت کے دو پہلوؤں کو بتاتے ہیں۔ یعنی یہ امت اپنے قول وعمل کے اعتبار سے عدل پر قائم ہوگی، اور چونکہ وہ عدل پر قائم ہوگی، اس لئے وہ اہل عالم کے لئے سراپا خیر بن جائے گی۔

شہادت (گواہی) سے مراد خدا کے بندوں کو خدا کی مرضی سے باخبر کرنا ہے۔ اسی باخبری پر قیامت میں لوگوں سے ان کے کارنامۂ حیات کا حساب لیا جانے والا ہے۔ تمام انسان خدا کے آگے مسئول (جواب دہ) ہیں۔ مگر یہ مسئولیت اسی وقت صحیح ہو سکتی ہے جب انھیں اصل حقیقت سے باخبر کر دیا گیا ہو۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے دنیا میں شہادت (دعوت) کا نظام قائم کیا تاکہ اس کی بنیاد پر آخرت میں لوگوں سے باز پرس کی جا سکے۔

دنیا میں شہادت دینے والے ہی آخرت کے شاہد ہیں (ق ۲۱) دنیا میں جو لوگ قوموں کو باخبر کرنے کی ذمہ داری ادا کریں گے، وہی قیامت کے دن خدا کی عدالت میں کھڑے ہو کر یہ

گواہی دیں گے کہ کس نے حق کے پیغام کو مانا اور وہ کون لوگ ہیں جنھوں نے اس کا انکار کر دیا۔

یہی وہ خاص مقصد ہے جس کے لئے امت محمدی کا "اخراج" ہوا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طرح اپنے زمانے کے لوگوں پر شہادت کی ذمہ داری ادا فرمائی، اسی طرح بعد کے تمام زمانوں میں آپ کی امت کو لوگوں کے اوپر شہادت کا فرض ادا کرنا ہے۔

شہادت کا خاص مقصد یہ ہے کہ انسان کو اس تخلیقی منصوبہ سے باخبر کیا جائے جس کے تحت اللہ تعالیٰ نے اس کو پیدا کر کے اس زمین پر آباد کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک ابدی مخلوق کی حیثیت سے پیدا کیا۔ پھر اس کے عرصۂ حیات کا بہت چھوٹا حصہ موجودہ دنیا میں رکھا اور بقیہ تمام حصہ موت کے بعد آنے والی کامل دنیا میں رکھ دیا۔ اللہ تعالیٰ نے فیصلہ کیا کہ انسان کے لئے موت سے پہلے کی زندگی آزمائش کی زندگی ہوگی اور موت کے بعد کی زندگی انجام پانے کی زندگی۔ موجودہ دنیا کے عمل کے مطابق، بعد کی دنیا میں کسی کو جنت میں جگہ ملے گی اور کسی کو جہنم میں۔

موت سے پہلے کی دنیا میں آدمی کو مکمل آزادی ہے۔ اسی آزادی کے معاملہ میں انسان کا امتحان ہے۔ اللہ تعالیٰ یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ کون شخص اپنی آزادی کا صحیح استعمال کرتا ہے اور کون شخص اس کا غلط استعمال کرتا ہے۔ جو شخص آزادی اور اختیار کے باوجود حق کے آگے جھک گیا، وہ امتحان میں پورا اترا۔ اور جو شخص آزادی اور اختیار پا کر بہک گیا اور سرکشی کا طریقہ اختیار کیا وہ امتحان میں ناکام ہو گیا۔ پہلے انسان کے لئے آخرت میں خدا کا انعام ہے اور دوسرے انسان کے لئے آخرت میں خدا کی سزا۔

اللہ تعالیٰ کا یہ منصوبہ اور اس کی تمام ضروری تفصیلات قرآن اور حدیث میں بتا دی گئی ہیں۔ اہل اسلام کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ قرآن و حدیث کے گہرے مطالعہ سے اس حقیقت کو سمجھیں اور اس کے تمام آداب و شرائط کے ساتھ اس کو اقوام عالم تک پہنچائیں۔ پیغام رسانی کے اس عمل کا کامل نمونہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں موجود ہے۔ اسی نمونہ کی پیروی کرتے ہوئے مسلمانوں کو یہ کام انجام دینا ہے، اس کے بعد ہی وہ اللہ تعالیٰ کے یہاں شہادت کا انعام پا سکتے ہیں۔

امر بالمعروف ، نہی عن المنکر

خیر امت کی بابت مذکورہ آیت میں کہا گیا ہے کہ تم معروف کا حکم دیتے ہو اور منکر سے روکتے ہو (تأمرون بالمعروف وتنھون عن المنکر) اس سے مراد داخلی نصیحت اور اندرونی احتساب کا وہ نظام ہے جو امت اپنے دائرہ کے اندر قائم کرتی ہے۔ امت کا ہر فرد نہ صرف اپنی ذات کی اصلاح کرتا ہے بلکہ وہ امت کے دوسرے لوگوں کے لئے ناصح اور نگراں بن جاتا ہے، تاکہ امت برابر خیر کی حالت پر قائم رہے۔ افراد امت کی یہی اسپرٹ امت کو خیر امت بنائے رکھنے کی اصل ضمانت ہے۔ اس بات کو سورۃ کی دوسری آیت میں ان الفاظ میں بتایا گیا ہے:

ولتکن منکم امة یدعون الی الخیر ویأمرون بالمعروف وینھون عن المنکر واولٰئك ھم المفلحون	اور تم میں سے ایک گروہ ہونا چاہئے جو نیکی کی طرف بلائے اور بھلائی کا حکم دے اور برائی سے روکے اور یہی لوگ کامیاب ہیں۔

(آل عمران ۱۰۴)

اس آیت میں مسلمانوں کے اندر جس مطلوب گروہ کی ضرورت بتائی گئی ہے وہ داخلی مصلحین کا گروہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلم ملت کو ایمانی کمزوری، داخلی انتشار اور باہمی بے انصافی سے بچانے کے لئے ضروری ہے کہ ان میں یہ مزاج موجود ہو کہ وہ ایک دوسرے کی کمزوریوں پر ٹوکیں۔ وہ ایک دوسرے کی اصلاح پر کمربستہ رہیں۔ ہر آدمی یا کم از کم ایک گروہ، اپنے آپ کو دوسروں کا نگراں سمجھے۔ اس کے بغیر مسلمان "خیر امت" کے مطلوبہ معیار پر باقی نہیں رہ سکتے ——— شہادت علی الناس اس امت کا منصبی مشن ہے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اس امت کا تربیتی نظام۔

شریعت میں جو احکام ہیں ان میں سے ہر حکم کے لیے الگ الگ الفاظ ہیں۔ کسی حکم کے لیے صلوٰۃ کا لفظ ہے اور کسی حکم کے لیے صوم کا۔ کسی حکم کے لیے زکوٰۃ کا لفظ آیا ہے اور کسی حکم کے لیے حج کا، وغیرہ۔ اسی طرح ایک حکم وہ ہے جس کے لیے قرآن وحدیث میں الامر بالمعروف والنہی عن المنکر کے الفاظ آئے ہیں۔ یعنی اچھی باتوں کا حکم دینا اور بری باتوں سے روکنا۔ حدیث میں ارشاد ہوا ہے کہ مسلمان کے اوپر لازم ہے کہ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا کام کرے، طاقت ہو تو ہاتھ سے۔ ہاتھ سے نہ کر سکے تو زبان سے، اور زبان سے نہ کر سکے تو دل سے۔

یہ حکم دراصل مسلمانوں کی باہمی اصلاح کے لیے آیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر مسلمان دوسرے مسلمان کے اوپر نگران بن جائے۔ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو اس کا حق نہ دے تو قریب کے مسلمان اس پر زور ڈال کر اس کو حق دار کا حق دینے پر مجبور کریں۔ ایک مسلمان ظالمانہ روش اختیار کرے تو اس کے آس پاس جو مسلمان ہیں وہ سب مل کر اس کے پیچھے پڑ جائیں اور اس کو ظلم و سرکشی کا رویہ چھوڑنے پر مجبور کر دیں۔ یہ کام اپنی استطاعت کے بقدر کرنا ہے۔ ہاتھ سے ممکن ہو تو ہاتھ سے، ورنہ زبان سے، اور زبان سے ممکن نہ ہو تو آخری درجہ یہ ہے کہ دل سے۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی اسی خاص نوعیت کی بنا پر قرآن میں اس کے لیے مشارکت کے صیغے آئے ہیں، یعنی ایسا صیغہ جس میں آپس میں ایک دوسرے کے اندر کرنے کا مفہوم پایا جاتا ہو۔ مثلاً ائتمار بالمعروف (واتمروا بینکم بمعروف، الطلاق ۶) اور تناہی عن المنکر (کانوا لا یتناھون عن منکر فعلوہ، المائدہ ۷۹)

مسلمانوں کی اصلاح معاشرہ کے لیے یہی اصل کام ہے جو مسلمانوں کو کرنا ہے۔ اس حکم کا مطلب یہ کہ مسلمان کے اندر اپنے بھائی کی مدد کرنے کا جذبہ موجود ہو۔ جہاں کوئی مسلمان حق کے خلاف چلتا ہوا نظر آئے فوراً اس علاقہ کے مسلمان ایسے مسلمان سے ملیں، وہ ظالم کے خلاف مظلوم کی حمایت کریں۔ وہ ہر شخص کے معاملہ میں دخل دے کر اس کو حق پر قائم رہنے اور ناحق کو چھوڑنے پر مجبور کر دیں۔ یہ حقیقتہً ایک سماجی کام ہے نہ کہ کوئی حکومتی کام۔

ایمان باللہ

آیت کے آخر میں فرمایا کہ تؤمنون باللہ (تم اللہ پر ایمان رکھتے ہو) یہ تمام مطلوب باتوں کی کلید اور اس کی بنیاد ہے۔ اللہ پر ایمان لانا تمام حقیقتوں کے اصل سرے کو پالینا ہے۔ اور جو آدمی حقیقت کے سرے کو پالے اس نے گویا سب کچھ پالیا۔ اسی سے ان اعمال کا صدور ہو سکتا ہے جو ایک صاحبِ ایمان کے اندر باعتبار معیار ہونا چاہئے۔ بخاری و مسلم نے ایک حدیث ان الفاظ میں نقل کی ہے:

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: اتدرون ما الایمان باللہ وحدہ۔ قالوا اللہ ورسولہ	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ کیا تم جانتے ہو کہ ایک اللہ پر ایمان رکھنا کیا ہے۔ لوگوں نے کہا

اعلم. قال شهادة ان لا الٰه الا اللّٰه وان محمداً رسول الله واقام الصلاة وایتاء الزکاة وصیام رمضان وان تعطوا من المغنم الخمس

(التفسیر المظہری ۲ / ۱۲۰)

کہ اللہ اور اس کا رسول زیادہ جانتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ اس بات کی گواہی دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہ کہ محمد اللہ کے رسول ہیں اور نماز قائم کرنا اور زکوٰۃ ادا کرنا اور رمضان کے روزے رکھنا اور یہ کہ تم غنیمت میں سے پانچواں حصہ ادا کرو۔

اس حدیث میں اللہ کی وحدانیت اور محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا اقرار ایمان کا براہ راست پہلو ہے اور دوسری چیزیں ایمان کا بالواسطہ پہلو ہیں۔ وہ ایمان کے نتیجے اور تقاضے کے تحت آدمی کے اندر پیدا ہوتی ہیں۔ تاہم یہ بالواسطہ تقاضوں کی مکمل فہرست نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تمام دینی احکام ایمان باللہ کے تقاضے میں شامل ہیں۔ جس طرح درخت کا ہر جزء اس کے بیج کا ظہور ہوتا ہے۔ اسی طرح کوئی آدمی جب صحیح معنوں میں ایمان کی حقیقت کو اپناتا ہے تو اس کی زندگی کے تمام اعمال میں اس کا اثر ظاہر ہوتا ہے۔ اس کی پوری زندگی اللہ کے رنگ میں رنگ جاتی ہے اللہ سب کچھ ہے، وہی اصل حقیقت ہے۔ اللہ کے حکم سے تمام چیزیں ظہور میں آتی ہیں اور پھر اسی کی طرف تمام چیزیں لوٹتی ہیں۔ اللہ تمام کائنات کا رب ہے۔ وہی ہر چیز کا مطلوب و مقصود ہے۔

اللہ پر ایمان دین کی اصل اساس ہے۔ ایک شخص کو جب اللہ کی معرفت حاصل ہوتی ہے تو اس کی پوری شخصیت سب سے بڑے نور سے چمک اٹھتی ہے۔ اس کے نتیجہ میں اس کے اندر وہ تمام اوصاف پیدا ہو جاتے ہیں جو خیر امت سے وابستہ ایک فرد کے اندر مطلوب ہیں۔ مثلاً تواضع، احساس ذمہ داری، بندوں کی خیر خواہی، انصاف پسندی، اپنے اور غیر کو ایک نظر سے دیکھنا، سچائی کا اعتراف کرنا وغیرہ۔ انھیں اوصاف سے متصف انسان کا نام مومن ہے۔ اور جو شخص ان ربانی اوصاف سے متصف ہو وہی خیر امت کا رکن بن سکتا ہے۔

شہادت علی الناس (عمومی دعوت) اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر (داخلی اصلاح) یہ دونوں کام وہی لوگ مطلوب معیار پر انجام دے سکتے ہیں جن کی معرفت خداوندی نے ان کے اندر یہ اوصاف پیدا

کردئے ہوں۔ اس کے بغیر اس کام کی انجام دہی ممکن نہیں۔

خارجی اعلان حق اور داخلی امر و نہی، یہ دونوں نازک ترین ذمہ داری کے کام ہیں۔ ان کو صحیح طور پر انجام دینے کے لئے اللہ کا وہ خوف درکار ہے جس نے آدمی کی شخصیت کو پوری طرح بدل ڈالا ہو۔ اس کے لئے ضرورت ہے کہ آدمی دوسروں کا خیر خواہ بنے۔ وہ احساس ذمہ داری کے تحت یہ کام انجام دے نہ کہ اظہار برتری کے لئے۔ وہ لوگوں کی زیادتیوں کو یک طرفہ طور پر برداشت کرے۔ وہ لوگوں کی طرف سے کسی قسم کے بدلے کا امیدوار نہ ہو۔ اس کا کلام دل سوزی کا کلام ہو۔ وہ اتنا زیادہ لوگوں کی ہدایت کا حریص ہو کہ اس کے دل سے ان کے لئے دعائیں نکلنے لگیں۔

ایمان باللہ کے بغیر آدمی کی زندگی غیر فطری زندگی ہوتی ہے، ایمان باللہ کے بعد وہ اپنی اصل فطرت پر آجاتا ہے۔ اب وہ مصنوعی انسان کے بجائے حقیقی انسان بن جاتا ہے۔ وہ اپنی ذات کے محور پر چلنے کے بجائے اللہ عز وجل کے محور پر چلنے لگتا ہے۔ وہ خود ساختہ شریعت کو چھوڑ کر اللہ کی مقرر کی ہوئی شریعت پر قائم ہوجاتا ہے۔

اس طرح جو انسان بنتے ہیں، انھیں کے مجموعہ کا نام خیر امت ہے۔ انھیں انسانوں سے وہ کردار ظاہر ہوتا ہے جو اللہ اور اس کے رسول کو مطلوب ہے اور جس کا مذکورہ آیت میں ذکر کیا گیا ہے۔

اسلامی جہاد

جہاد کے لفظی معنی کوشش (struggle) کے ہیں ۔ اس میں مبالغہ کا مفہوم شامل ہے۔ مثلاً عربی میں کہتے ہیں جہدتُ رائی ۔ یعنی میں نے اس معاملہ میں بہت زیادہ غور و فکر کیا۔ قرآن میں ہے کہ واقسموا باللہ جھد ایمانھم (المائدہ ۵۳) یعنی قسم کھانے میں شدت برتنا، مبالغہ کرنا۔

اسلام شروع سے آخر تک جہاد ہے۔ آدمی جب اسلام میں داخل ہوتا ہے تو وہ ایک مجاہدانہ زندگی میں داخل ہوتا ہے جو برابر جاری رہتا ہے ، یہاں تک کہ اسی راہ میں آدمی کی موت آجائے۔

اس جہاد کا پہلا محاذ آدمی کی خود اپنی ذات ہے ۔ جب آدمی اپنے آپ کو مومن و مسلم کہتا ہے تو وہ گویا یہ عہد کرتا ہے کہ وہ نفسیاتی محرکات کو دبائے گا اور شیطانی ترغیبوں سے لڑکر خدا کی بتائی ہوئی صراط مستقیم پر قائم رہے گا۔ اس کو حدیث میں اِس طرح بیان کیا گیا ہے کہ مجاہد وہ ہے جو اللہ کی اطاعت کے لیے اپنی نفس سے جہاد کرے (المجاھد من جاھد نفسہ فی طاعۃ اللہ)

جہاد کا دوسرا محاذ دعوت ہے ۔ یعنی اللہ کے پیغام کو اللہ کے بندوں تک پہونچانے کے لیے اپنی ساری ممکن کوشش صرف کرنا ۔ یہ اتنا بڑا عمل ہے کہ قرآن میں اس کو جہاد کبیر کہا گیا ہے (وجاھدھم بہ جہاداً کبیراً) اللہ کے دین کا خطاب تمام انسانوں اور تمام قوموں سے ہے۔ اس کو اس کے تمام آداب اور تقاضوں کے ساتھ سارے اہل عالم تک پہونچانا ہے ۔ اس لحاظ سے بلاشبہ دعوت کا عمل عظیم ترین جہاد ہے ، اس سے بڑا جہاد اور کوئی نہیں۔

جہاد کا تیسرا محاذ دفاع ہے ۔ یعنی اسلام کے دشمن اگر یک طرفہ طور پر اہل اسلام کے اوپر جارحانہ حملہ کردیں ، اور ان کو حملہ سے باز رکھنے کی تمام ممکن تدبیریں غیر موثر ثابت ہوئی ہوں تو ایسی صورت میں بشرط استطاعت ان سے مقابلہ کرکے انھیں پسپا کرنا اور ان کے حملہ کو ناکام بنادینا۔ جہاد کی یہی تیسری قسم ہے جس کو شریعت میں قتال فی سبیل اللہ کہا گیا ہے۔

جہاد نفس اور جہاد دعوت ایک مستقل عمل ہے ، وہ مومن کی زندگی میں ہر روز اور ہر لمحہ کسی نہ کسی صورت میں جاری رہتا ہے ۔ اس کے مقابلہ میں جہاد اعدار ایک اتفاقی اور استثنائی عمل ہے۔ اس کا مقصد دفاع ہے اور دفاع اس وقت کیا جاتا ہے جب کسی کی طرف سے جارحیت کا آغاز کردیا جائے۔

جہاد عمومی معنیٰ میں ہر وقت جاری رہنے والا عمل ہے اور قتال کے معنی میں وقتی طور پر پیش آنے والا عمل۔ یہاں قرآن و حدیث کی روشنی میں اس کا ایک مطالعہ پیش کیا جاتا ہے۔

جہاد قتال کے ہم معنی نہیں ہے، بلکہ وہ کامل جدوجہد کے ہم معنی ہے۔ اس اعتبار سے جہاد کا تعلق زندگی کے ہر معاملہ سے ہے۔ مشہور تابعی الحسن البصری نے کہا ہے کہ آدمی جہاد کرتا ہے اور وہ ساری عمر میں ایک دن بھی کسی کو تلوار نہیں مارتا (ان الرجل لیجاھد وما ضرب یوما من الدھر بسیف، تفسیر ابن کثیر ۳/۴۰۴)

جہاد کے لفظی معنی کوشش کے ہیں۔ البتہ اس کے مفہوم میں مبالغہ ہے۔ یعنی اس کا مطلب ہے بہت زیادہ کوشش کرنا (جھد الرجل فی کذا ای جد وبالغ، لسان العرب) اس اعتبار سے جہاد وہی چیز ہے جس کو اردو میں جدوجہد اور انگریزی میں "اسٹرگل" کہا جاتا ہے۔

موجودہ دنیا امتحان کی دنیا ہے۔ اس لئے یہاں جب ایک شخص ایمان قبول کرتا ہے تو یہ اس کے لئے کوئی سادہ بات نہیں ہوتی۔ یہ دراصل غیر مومنانہ حالات میں مومنانہ زندگی گزارنے کا فیصلہ ہوتا ہے۔ اس طرح اس کی پوری زندگی جدوجہد کی زندگی بن جاتی ہے۔ سوچ اور عمل ہر اعتبار سے اس کو یہ کرنا پڑتا ہے کہ اپنے آپ کو غیر خدائی طریقہ سے ہٹائے، اور جو خدائی طریقہ ہے اس کو پوری طرح اپنی زندگی میں اختیار کرے۔

قرآن کی سورہ العنکبوت میں عمل اسلام کو عملِ جہاد کہا گیا ہے۔ حالاں کہ العنکبوت ایک مکی سورہ ہے۔ اور مکی دور میں ابھی قتال کا حکم آیا ہی نہیں تھا۔ ارشاد ہوا ہے:

کیا لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ محض یہ کہنے پر چھوڑ دئے جائیں گے کہ ہم ایمان لائے اور ان کو جانچا نہ جائے گا۔ اور ہم نے ان لوگوں کو جانچا ہے جو ان سے پہلے تھے۔ پس اللہ ان لوگوں کو جان کر رہے گا جو سچے ہیں اور وہ جھوٹوں کو بھی ضرور معلوم کرے گا۔ کیا جو لوگ برائیاں کر رہے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ وہ ہم سے بچ جائیں گے۔ بہت برا فیصلہ ہے جو وہ کر رہے ہیں۔ جو شخص اللہ سے ملنے کی امید رکھتا ہے تو اللہ کا وعدہ ضرور آنے والا ہے، اور وہ سننے والا، جاننے والا ہے۔ اور جو شخص جہاد کرے تو وہ اپنے ہی لئے جہاد کرتا ہے۔ بے شک اللہ دنیا والوں سے بے نیاز ہے (العنکبوت ۱-۶)

یہاں "جہاد" سے مراد یقینی طور پر قتال نہیں ہے۔ یہاں جہاد سے مراد وہ غیر معمولی محنت ہے

جو آدمی کو ایمان اور عمل صالح والی زندگی اختیار کرنے کے لئے اس دنیا میں کرنا پڑتا ہے۔ یہ شخصی جہاد ہر آدمی کو لازماً کرنا ہے، اس کے بغیر وہ ایمان اور عمل صالح کی روش پر قائم نہیں رہ سکتا۔

ایک شخص جب مومن بنتا ہے تو اس کو فوراً محسوس ہوتا ہے کہ اس نے عام روش سے الگ ایک زندگی اختیار کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ لوگ خدا کو رسمی طور پر مان رہے ہوتے ہیں، وہ خدا کو زندہ عقیدہ کے طور پر ماننا چاہتا ہے۔ لوگ پیغمبر کو اپنا فخر بنائے ہوئے ہوتے ہیں، وہ پیغمبر کو اپنا عملی نمونہ بنانا چاہتا ہے۔ لوگ آخرت سے بے خوفی میں پڑے ہوتے ہیں، وہ آخرت سے خوف والی زندگی کو اختیار کرنا چاہتا ہے۔ لوگ ماحول کی بھلائی اور برائی سے بے تعلق ہو کر اپنا ذاتی آشیانہ بنا کر مطمئن رہتے ہیں، وہ چاہتا ہے کہ اچھے کو اچھا کہے اور برے کو برا بتائے۔ لوگ اپنے بڑوں کو معیار بنائے ہوئے ہوتے ہیں، وہ چاہتا ہے کہ بڑے اور چھوٹے دونوں کو یکساں طور پر خدا کے معیار حق پر جانچے۔ لوگ زمانہ سے مصالحت کر کے زندگی گزار رہے ہوتے ہیں، وہ چاہتا ہے کہ زمانہ سے بے پروا ہو کر صداقت کو مرکز توجہ بنائے۔ لوگ ظواہر پر اپنی زندگی کھڑی کئے ہوئے ہوتے ہیں، وہ چاہتا ہے کہ حقائق کے اوپر اپنی زندگی کی تعمیر کرے۔

یہ فرق ایک سچے مومن کے لئے اس کی پوری زندگی کو مشقت اور قربانی کی زندگی بنا دیتا ہے۔ اس کی مثال اس شخص کی سی ہو جاتی ہے جو آندھی اور طوفان کے الٹے رخ پر چلنا چاہتا ہو۔ ایسے آدمی کے لئے سفر سخت محنت کے ہم معنی بن جاتا ہے۔ اسی طرح سچے مومن کے لئے موجودہ دنیا میں زندگی گزارنا محنت و مشقت کا ایک عمل ہے۔ اسی پر مشقت عمل کا نام جہاد ہے۔

جہاد نفس اور شیطان سے لڑنے کا ہتھیار ہے۔ جہاد با اصول زندگی گزارنے کی قیمت ہے۔ جہاد دار الامتحان میں اپنے امتحان کے پرچہ کو صحیح طور پر کرنے کی کوشش ہے۔ جہاد کسی خارجی نظام کو نافذ کرنے کا عمل نہیں، جہاد خود اپنے آپ کو خدا کی مرضی پر کھڑا کرنے کی محنت ہے۔ جہاد کی لازمی شرط فی سبیل اللہ ہے، جو جہاد، فی سبیل غیر اللہ ہو وہ ہرگز جہاد نہیں اور نہ اس پر خدا کی وہ برکتیں نازل ہونے والی ہیں جو صرف جہاد فی سبیل اللہ کے لئے مقدر کی گئی ہیں۔

ایک لفظ کافی نہیں

جو لوگ جہاد کو جنگ اور قتال کے ہم معنی ثابت کرنا چاہتے ہیں، ان کا حال یہ

ہے کہ اگر کسی آیت یا حدیث میں قتال یا اس کے ہم معنی لفظ مل جائے تو اس کو اپنے حق میں کافی دلیل سمجھ لیتے ہیں۔ حالاں کہ کسی کلام میں قتال یا اس کے ہم معنی کسی لفظ کا آجانا اس بات کا کافی ثبوت نہیں کہ اس سے مراد شمشیری جنگ ہے۔ بعض اوقات کلام میں شدت پیدا کرنے کے لئے بھی قتال کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ مثلاً عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے ایک معاملہ میں ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے اختلاف کیا۔ حضرت عمر کا انداز شدید ہو گیا تو حضرت ابو بکر نے فرمایا: اتحاربنی یا ابن الخطاب (اے خطاب کے بیٹے، کیا تم مجھ سے جنگ کرو گے)

حضرت ابو بکر کے اس قول (اتحاربنی) سے مراد نیزہ اور تلوار کی جنگ نہیں ہے۔ یہاں دراصل حضرت عمر کے انداز کے خلاف شدت اظہار کے لئے حرب کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ کلام کا یہ اسلوب ہر زبان میں رائج ہے۔

علمی و فکری جنگ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ارشاد، الفاظ کے معمولی فرق کے ساتھ حدیث کی مختلف کتابوں میں نقل کیا گیا ہے۔ ابو داؤد کے الفاظ یہ ہیں:

عن عمران بن حصین قال، قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: لا تزال طائفة من امتی یقاتلون علی الحق ظاھرین علی من ناوأھم حتی یقاتل آخرھم المسیح الدجال

عمران بن حصین رضؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری امت کا ایک گروہ ہمیشہ حق کے لئے لڑتا رہے گا، وہ ان پر غالب رہے گا جو ان سے دشمنی کرے گا، یہاں تک کہ ان کا آخری گروہ مسیح دجال سے جنگ کرے گا۔

بعض لوگ اس حدیث سے جنگ کا مسئلہ نکالتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہمارا فرض ہے کہ ہم ہر زمانہ میں مخالفین سے جنگ کا سلسلہ جاری رکھیں۔ ان حضرات کے اس استدلال کی بنیاد یہ ہے کہ اس حدیث میں "قتال" کا لفظ آیا ہے۔ مگر یہاں قتال سے مراد ہتھیاروں کا مقابلہ نہیں ہے بلکہ اس سے مراد فکری اور نظریاتی مقابلہ ہے چنانچہ محدثین نے اس روایت میں قتال سے یہی مراد لیا ہے۔

صحیح البخاری میں "کتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ" کے تحت جو ابواب ہیں، ان میں سے ایک باب کے تحت امام بخاری نے مذکورہ مفہوم کی دو روایتیں نقل کی ہیں۔ اس کا ترجمۂ باب انھوں نے ان الفاظ

ہیں قائم کیا ہے ـــــ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول کے بیان میں کہ میری امت کا ایک گروہ ہمیشہ حق پر قائم رہتے ہوئے جنگ کرتا رہے گا ، اور وہ اہل علم ہیں (باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم لاتزال طائفۃ من امتی ظاھرین علی الحق یقاتلون وھم اھل العلم) اس سے معلوم ہوا کہ مذکورہ حدیث میں قتال کا لفظ ، امام بخاری کے نزدیک ، مجازی معنوں میں ہے ، وہ حقیقی معنوں میں نہیں ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ مذکورہ حدیث میں قتال سے انھوں نے علماء کی جدوجہد کو مراد لیا ہے ۔

حافظ ابن حجر العسقلانی نے فتح الباری میں لکھا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ اپنے دشمنوں پر غالب رہیں گے ، ان کی مخالفت کرنے والا ان کو نقصان نہ پہنچا سکے گا (قاھرین لعدوھم لایضرھم من خالفھم)

حافظ ابن حجر نے علی بن المدینی کا قول نقل کیا ہے کہ اس سے مراد علماء حدیث ہیں (ھم اصحاب الحدیث) اسی طرح انھوں نے امام احمد بن حنبل کا قول اس حدیث کی تشریح میں نقل کیا ہے ۔ انھوں نے کہا کہ اس سے مراد اگر علماء حدیث نہیں تو مجھ کو نہیں معلوم کہ اور کون لوگ اس سے مراد ہیں (ان لم یکونوا اھل الحدیث فلاادری من ھم) فتح الباری ، جزء ۱۳ ، القاھرہ ۱۳۴۸ھ ، صفحہ ۲۵۰

حقیقت یہ ہے کہ اس حدیث میں قتال کا لفظ مقابلہ یا مجاہدہ کے مفہوم میں ہے ۔ ایسے مواقع پر قتال یا جنگ کا لفظ مفہوم میں شدت پیدا کرنے کے لئے آتا ہے نہ کہ اپنے ظاہری لغوی مفہوم میں ۔ ایک اخبار نویس کا انتقال ہوا تو اس کے حالات کے تحت لکھا گیا کہ ـــــ " وہ ساری عمر فرقہ واریت سے لڑتے رہے " ۔ ظاہر ہے کہ یہاں لڑنے کا لفظ قلمی جدوجہد کے معنی میں ہے نہ کہ حربی ٹکراؤ کے معنی میں ۔

مذکورہ حدیث رسول میں جو بات کہی گئی ہے وہ یہ کہ امت محمدی کبھی علماء حق سے خالی نہیں ہوگی ۔ اس میں ہمیشہ ایسے افراد موجود رہیں گے جو دین کا صحیح علم رکھتے ہوں ، اپنی زبان وقلم سے اس کا اعلان کریں ۔ اور جو لوگ دین کے تصور کو بگاڑیں ، ان سے فکری مقابلہ کرکے ان کا غلط ہونا ثابت کریں ۔ یہ صورت حال جاری رہے گی یہاں تک کہ قیامت آجائے ۔

جہاد وقتال سے مراد اصلاً اور اولاً یہی فکری جدوجہد ہے ۔ متشددانہ جنگ تو بہت بعد کو

آتی ہے ، اور وہ بھی بطور دفاع نہ کہ بطور اقدام۔

اعلاء کلمۃ اللہ

سورہ التوبہ میں ہجرت کے واقعہ کو یاد دلاتے ہوئے کہا گیا ہے کہ جب مکہ کے منکرین نے پیغمبر کو مکہ سے نکال دیا۔ جب وہ صرف دو میں کا دوسرا تھا۔ جب وہ دونوں غار میں تھے۔ جب پیغمبر اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا کہ غم نہ کرو ، بے شک اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ پس اللہ نے اپنی سکینت اس کے اوپر اتاری اور اس کی مدد ایسے لشکروں سے کی جو تم کو نظر نہ آتے تھے۔ اور اللہ نے منکروں کا کلمہ نیچا کر دیا اور اللہ کا کلمہ ہی اونچا ہے۔ اور اللہ عزیز و حکیم ہے (التوبہ ۴۰)

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا کہ انکار کرنے والوں کے کلمہ سے مراد شرک ہے اور کلمۃ اللہ سے مراد لا الٰہ الا اللہ ہے (قال ابن عباس : یعنی بکلمۃ الذین کفروا الشرك و کلمۃ اللہ ھی لا الٰـہ الا اللّٰہ ، تفسیر ابن کثیر ۲/ ۳۵۸) اس سلسلہ میں ایک حدیث بھی آتی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں :

عن ابی موسیٰ قال ۔ جاء رجل الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال ۔ الرجلُ یقاتل للمغنم والرجل یقاتل للذکر و الرجل یقاتل لیریٰ مکانہ فمن فی سبیل اللہ ، قال : من قاتل لتکون کلمۃ اللہ ھی العلیا فھو فی سبیل اللہ (متفق علیہ)

ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ ایک شخص رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہا کہ کوئی آدمی مال کے لئے لڑتا ہے۔ کوئی آدمی شہرت کے لئے لڑتا ہے۔ کوئی آدمی اس لئے لڑتا ہے تاکہ اس کو ممتاز مقام حاصل ہو۔ ان میں سے کون اللہ کے راستہ میں لڑنے والا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ وہ جو اس لئے لڑے کہ اللہ کا کلمہ ہی بلند کلمہ ہو جائے۔

اس آیت، اور اس حدیث میں اعلاء کلمۃ اللہ سے مراد اعلاء کلمہ ہے نہ کہ اقامت نظام۔ یعنی اس سے مراد یہ ہے کہ نظریہ شرک فکری حیثیت سے دب جائے اور نظریۂ توحید فکری حیثیت سے بالا و برتر ہو جائے۔

فکری غلبہ کا یہ واقعہ اصلاً فکری جد و جہد کے ذریعہ ہوتا ہے۔ دلائل کے میدان میں توحید کو شرک کے اوپر غالب کیا جاتا ہے۔ تاہم کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اہل باطل دلیل کے میدان میں مغلوب

ہونے کے بعد جارحیت کا انداز اختیار کرتے ہیں۔ وہ اہل حق کے اوپر ہتھیاروں کے ذریعہ حملہ کر دیتے ہیں۔ اس وقت اہل حق کو اپنے اور حق کے دفاع میں جوابی کارروائی کرنی پڑتی ہے۔

خودساختہ تعبیر

موجودہ زمانہ میں کچھ لوگوں نے جہاد فی سبیل اللہ کو جہاد سیاسی کے ہم معنی بنا دیا ہے۔ مثلاً "جہاد فی سبیل اللہ" نامی ایک کتاب میں جہاد کی تشریح ان الفاظ میں کی گئی ہے:

"اسلامی جہاد کا مقصود غیر اسلامی نظام کی حکومت کو مٹا کر اسلامی حکومت قائم کرنا ہے۔ اسلام یہ انقلاب صرف ایک ملک یا چند ملکوں میں نہیں بلکہ تمام دنیا میں برپا کرنا چاہتا ہے۔ اگرچہ ابتداءً مسلم پارٹی کے ارکان کا فرض یہی ہے کہ جہاں جہاں وہ رہتے ہوں وہاں کے نظام حکومت میں انقلاب پیدا کریں۔ لیکن ان کی آخری منزل مقصود ایک عالمگیر انقلاب کے سوا کچھ نہیں (مسلم پارٹی ہر جگہ) لڑ کر غیر اسلامی حکومتوں کو مٹا دے گی اور ان کی جگہ اسلامی حکومت قائم کرے گی (۲۲-۲۳)

اسلامی جہاد کا یہ تصور سراسر بے بنیاد ہے۔ اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ سارے قرآن میں کوئی ایک آیت بھی ایسی موجود نہیں جس کے براہ راست مفہوم کے طور پر سیاسی انقلاب کا یہ نظریہ برآمد ہوتا ہو۔

مذکورہ کتاب میں اس نظریہ کے حق میں جو "دلائل" دئے گئے ہیں، وہ سب انشا پردازی کی نوعیت کے ہیں۔ کچھ آیتیں اور حدیثیں پیش کی گئی ہیں۔ مگر وہ سب اصل مسئلہ سے غیر متعلق ہیں۔ حتی کہ ایک کو چھوڑ کر کسی آیت یا حدیث میں جہاد کا صیغہ تک موجود نہیں۔

نقل کردہ آیتوں میں صرف ایک آیت ایسی ہے جس میں یجاھدوا باموالھم وانفسھم کا لفظ آیا ہے۔ یہ سورہ التوبہ کی آیت ۴۴ ہے۔ مگر اس آیت میں مذکورہ نظریہ کے حق میں کوئی دلیل نہیں۔ یہاں دشمنان اسلام کی جارحیت کے مقابلہ میں دفاعی جنگ لڑنے کے لئے نکلنے کا ذکر ہے۔ "مکمل نظام قائم کرنے کے لئے جہاد کرو" اس قسم کے نام نہاد انقلابی نظریہ کا ذکر نہ اس آیت میں ہے اور نہ قرآن کی کسی دوسری آیت میں۔

اصل بات حذف

اس نظریۂ جہاد کا غلط ہونا اسی سے ثابت ہے کہ وہ پورے دین سے ٹکرا جاتا ہے۔ اس کو اختیار کرنے کی صورت میں پورے دین کا نقشہ بگڑ جاتا ہے۔ اس بات کو سمجھنے کے لئے اس نظریۂ جہاد کے مشہور

ترین وکیل کا اقتباس دیکھئے :

"یہیں سے یہ سوال بھی حل ہو جاتا ہے کہ کسی ملک پر اسلامی نظام کی حکومت قائم ہو جانے کی صورت میں ان لوگوں کی کیا حیثیت ہو گی جو کسی دوسرے عقیدہ و مسلک کے متبع ہوں۔ اسلام کا جہاد لوگوں کے عقیدہ و مسلک اور ان کے طریق عبادت یا قوانین معاشرت سے تعرض نہیں کرتا۔ وہ ان کو پوری آزادی دیتا ہے کہ جس عقیدہ پر چاہیں قائم رہیں اور جس مسلک پر چاہیں چلیں۔ البتہ وہ ان کے اس حق کو تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہے کہ ان کی خاطر کسی ایسے طریقہ پر حکومت کا نظام چلایا جائے جو اسلام کی نگاہ میں فاسد ہے۔ نیز وہ ان کے اس حق کو بھی نہیں مانتا کہ وہ معاملات کے ان طریقوں کو اسلامی نظام حکومت میں جاری رکھیں جو اسلام کے نزدیک اجتماعی فلاح کے لئے مہلک ہیں (مثلاً سود، چوری، جوا، وغیرہ) جہاد فی سبیل اللہ، صفحہ ۲۵-۲۶

اس نظریۂ جہاد کے مطابق، اسلامی جہاد لوگوں کے عقیدہ اور عبادت سے کوئی تعرض نہیں کرتا۔ اس کا سارا مقصد یہ ہے کہ لوگوں کے اوپر اسلام کے اجتماعی اور سیاسی قانون کی حکومت قائم ہو جائے۔ یہ سراسر ایک خودساختہ نظریہ ہے۔ اس میں جہاد کا اصل مقصد حذف ہو گیا ہے، اور جہاد کا جو مقصد سارے قرآن و حدیث میں کہیں مذکور نہیں، وہی اس کا اصل مقصد قرار دیا گیا ہے۔

سورہ الفرقان میں توحید (آیت ۲) اور اللہ کی عبادت (آیت ۵۵) کا ذکر ہے اور توحید اور عبادت کی اس دعوت کے خلاف منکرین جو شبہات پھیلا رہے تھے، ان کو دلائل سے رد کیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں ارشاد ہوا ہے کہ قرآن کے ذریعہ سے ان کے اوپر جہاد کبیر (۵۲) کرو۔ یہاں واضح طور پر جہاد سے مراد وہ عمل ہے جو توحید اور عبادت الٰہی کی تبلیغ کے لئے کیا جاتا ہے۔

اس طرح کی دوسری بہت سی آیتیں اور حدیثیں ہیں جو دعوت توحید کے عمل کو جہاد کا عمل بتاتی ہیں۔ جب کہ قرآن اور حدیث کے پورے ذخیرے میں کوئی بھی آیت یا حدیث موجود نہیں جس میں مذکورہ نوعیت کے سیاسی عمل کو جہاد قرار دیا گیا ہو۔

جہاد کا مذکورہ نظریہ در اصل جہاد کی سیاسی تعبیر ہے۔ اس میں جہاد کا تصور بنیادی طور پر بدل جاتا ہے اور دین کا پورا نقشہ تلپٹ ہو جاتا ہے۔

دین میں اصل اہمیت تواضع کی نفسیات کی ہے، مگر جہاد کا مذکورہ نظریہ اس کے برعکس، سرکشی کی نفسیات پیدا کر دیتا ہے۔ اس میں دین کا روحانی پہلو غائب ہو جاتا ہے اور سیاسی پہلو غیر متناسب طور

پر ابھرتا ہے۔ جن لوگوں کا مزاج اس نظریہ کے تحت بنتا ہے، ان کی نظریں داخلی احتساب سے ہٹ جاتی ہیں اور ساری توجہ خارجی احتساب کی طرف چلی جاتی ہیں۔ ایسا آدمی عین اپنے مزاج کے مطابق اپنی ذات پر لفظی تنقید بھی برداشت نہیں کرے گا، اور دوسروں کے اوپر گولی اور بم کی بارش کرنا اپنا پیدائشی حق سمجھے گا۔ تعمیری میدان میں سرگرم ہونا اس کو غیر اہم نظر آئے گا البتہ تخریب کے پروگرام سے اس کو بہت زیادہ دلچسپی ہوگی۔ اسلام یہ مزاج دیتا ہے کہ اہل ایمان دوسرے بندگان خدا سے محبت کریں، وہ ان کی زیادتیوں کے باوجود ان کے لئے دعائیں کریں۔ مگر مذکورہ قسم کے سیاسی مجاہدین کا حال یہ ہوگا کہ ان کے پاس دوسروں کے لئے صرف نفرت ہوگی۔ وہ دوسروں کو بددعا دینے والے ہوں گے نہ کہ ان کے حق میں دعا کرنے والے۔

ناقص استدلال

یہ انقلابی نظریہ ساز اپنے نظریہ کے حق میں قرآن کی جو آیتیں پیش کرتے ہیں، ان کی حیثیت محض بے جا جسارت کی ہے۔ کیوں کہ ان آیتوں کا ان کے "انقلابی نظریہ" سے کوئی تعلق نہیں۔

مثلاً مذکورہ کتاب (جہاد فی سبیل اللہ) کا ایک حوالہ یہ ہے: "اسلامی دعوت عالمگیر اور کلی انقلاب کی دعوت تھی۔ اس نے پکار کر کہا کہ ان الحکم الا للہ۔ یعنی حکومت سوائے خدا کے اور کسی کی نہیں ہے۔ کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ بذات خود انسانوں کا حکمراں بن جائے اور اپنے اختیار سے جس چیز کا چاہے حکم دے اور جس چیز سے چاہے روک دے۔ کسی انسان کو بالذات امر و نہی کا مالک سمجھنا در اصل خدائی میں اسے شریک کرنا ہے اور دنیا میں یہی اصل بنائے فساد ہے۔" ۱۲ - ۱۳

اس اقتباس میں قرآن کی آیت (ان الحکم الا للہ) کو اپنے انقلابی نظریہ کے حق میں بطور دلیل پیش کیا گیا ہے۔ مگر اس آیت کا مذکورہ نظریہ سے کوئی تعلق نہیں۔

ان الحکم الا اللہ کا فقرہ قرآن میں تین جگہ (الانعام ۵۷، یوسف ۴۰، یوسف ۶۷) آیا ہے۔ تینوں مقامات پر واضح طور پر وہ فوق الطبیعی حکم کے معنی میں ہے، وہ ہرگز سیاسی حکم کے معنی میں نہیں۔ قرآن کی اس آیت کو کوئی ایسا شخص ہی مذکورہ انقلابی اور سیاسی مفہوم میں لے سکتا ہے جو خدا کی کتاب کے بارہ میں سنجیدہ نہ ہو۔

اسی طرح اس سیاسی نظریہ کے ایک حامی اس سیاسی نظریہ کے حق میں شہادت کی آیت (لتکونوا

شــهــداء علی الناس) پیش کرتے ہیں۔ان کی دلیل یہ ہے کہ امت محمدی کو سارے عالم کے سامنے دین حق کی گواہی دینا ہے۔یہ گواہی مکمل دین کی ہونی چاہئے۔ اس لئے امت پر لازم ہے کہ وہ دین کے پورے نظام کو عملاً زمین پر قائم کرے تاکہ دنیا کے سامنے تمام دینی احکام اور پورے دینی نظام کا مظاہرہ ہوسکے۔ اس مکمل عملی مظاہرہ کے بعد ہی لوگوں کے اوپر خدا کے دین کی حجت پوری ہوسکتی ہے اور امت محمدی قیامت میں یہ کہہ سکتی ہے کہ اس کو جو دین ملا تھا، اس کو اس نے خدا کے بندوں تک پہنچادیا۔

یہ سارا استدلال خود ساختہ مفروضہ پر قائم ہے۔امت محمدی کو جو شہادت دینا ہے اس کا قانونی نظام اور سیاسی اقتدار سے کوئی تعلق نہیں۔اس شہادت کا تعلق دین کے فکری اور تصوراتی پہلو سے ہے نہ کہ دین کے عملی نظام سے۔ اگر مکمل عملی نظام کے مظاہرہ کو ضروری قرار دیا جائے تو کسی بھی پیغمبر نے کبھی کامل شہادت نہیں دی اور نہ اپنی قوموں پر اتمام حجت کیا۔ تاریخ سے ثابت ہے کہ کسی بھی نبی نے مکمل عملی نظام قائم نہیں کیا۔ حتی کہ پیغمبر اسلام کا معاملہ بھی یہی ہے۔ قرآن و حدیث کے مطابق پیغمبر اسلام نے مکہ کے لوگوں پر اتمام حجت کی حد تک شہادت کا کام انجام دے دیا۔ اس کے بعد آپ نے مکہ سے ہجرت فرمائی۔ مگر، جیسا کہ معلوم ہے، مکہ میں صرف فکری تبلیغ کا کام ہوا، وہاں کے منکروں کے سامنے کبھی مکمل عملی نظام پیش نہیں کیا گیا۔

حقیقت یہ ہے کہ شہادت کا کام تمام تر ایک فکری پیغام رسانی کا کام ہے۔ اس کام کے لئے مزید جو چیز درکار ہے، وہ مکمل عملی نظام کا مظاہرہ نہیں۔بلکہ داعی کا اخلاص ہے۔داعی کو یہ کام اس طرح کرنا ہے کہ وہ آخری حد تک مدعو کا خیر خواہ ہو۔ وہ نصح اور امانت کے جذبہ کے تحت یہ کام کرے۔ وہ حرص کی حد تک مدعو کی ہدایت کا طلب گار بن گیا ہو۔ وہ یک طرفہ طور پر مدعو کی اذیتوں کو سہے۔ وہ مدعو کے ظلم و سرکشی کے باوجود اس کے لئے نیک دعائیں کرے۔

جہاد کی مختلف صورتیں

قرآن و حدیث کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جہاد کی مختلف صورتیں ہیں۔اس کا تعلق صرف جنگ کے میدان سے نہیں ہے، بلکہ زندگی کے ہر میدان اور ہر سرگرمی سے اس کا تعلق ہے۔اس سلسلہ میں یہاں قرآن و حدیث سے چند حوالے نقل کئے جاتے ہیں۔

۱۔ قرآن میں ہے کہ جو لوگ ہمارے واسطہ مجاہدہ کریں گے ان کو ہم ضرور اپنے راستے دکھائیں گے (الذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا ، العنکبوت) اس کی تشریح یہ کی گئی ہے کہ جو لوگ ہماری

طلب میں مجاہدہ کریں گے ان کو ہم اپنی طرف پہنچنے کے راستے دکھائیں گے (الذین جاھدوا فی طلبنا لنھدینھم سبل الوصول الینا ، تفسیر النسفی)

اس آیت میں جہاد کا لفظ اس جد وجہد کے لئے استعمال ہوا ہے جو آدمی خدا کو پانے کے لئے روحانی سطح پر کرتا ہے۔ یہ جہاد ابتداءً تلاش حق کی صورت میں آدمی کے اندر ظاہر ہوتا ہے اور اس کے بعد ساری عمر زیادہ سے زیادہ معرفت رب حاصل کرنے اور تعلق باللہ کو بڑھانے کے لئے جاری رہتا ہے۔

۲ . جہاد کا سب سے بڑا محاذ جو آدمی کی زندگی میں ہر وقت جاری رہتا ہے، وہ خود اپنے نفس کا محاذ ہے۔ حدیث میں ارشاد ہوا ہے کہ مجاہد وہ ہے جو اپنے نفس سے اللہ کی اطاعت کے لئے لڑے (المجاھد من جاھد نفسہ فی طاعۃ اللہ) دوسری حدیث میں ہے کہ اپنی خواہشوں سے جہاد کرو جس طرح تم اپنے دشمنوں سے لڑتے ہو (جاھدوا اھواءکم کما تجاھدون اعداءکم) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک بار دشمنوں سے مقابلہ کے بعد واپس آئے تو آپ نے فرمایا کہ ہم چھوٹے جہاد کے بعد اب بڑے جہاد کی طرف واپس آئے ہیں (رجعنا من الجھاد الاصغر الی الجھاد الاکبر)

موجودہ دنیا میں ہر وقت اصول اسلام اور خواہش نفس کے درمیان مقابلہ جاری رہتا ہے۔ اس مقابلہ میں آدمی کو اصول اسلام کا حامی بن کر اپنی خواہش نفس سے لڑنا ہے اور اسے زیر کرنا ہے یہ سب سے زیادہ عام جہاد ہے اور وہ بلاشبہ سب سے بڑا جہاد ہے۔ یہ اپنے نفس کو کنٹرول کرنا اور اپنی خواہشوں پر روک لگانے کا جہاد ہے۔ اس جہاد کے بغیر کسی آدمی کے لئے خدا پرستی کی زندگی پر قائم رہنا ممکن نہیں۔

۳ . الترمذی ، ابوداؤد اور الدارمی نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معاذ بن جبل رض کو یمن کا حاکم بنا کر بھیجا۔ بھیجتے ہوئے آپ نے ان سے پوچھا کہ کوئی معاملہ پیش آئے تو تم اس کا فیصلہ کس طرح کرو گے۔ انھوں نے کہا کہ میں کتاب اللہ کے ذریعہ فیصلہ کروں گا۔ آپ نے فرمایا کہ اگر تم کتاب اللہ میں نہ پاؤ تو تم کیا کرو گے۔ انھوں نے کہا کہ پھر میں اللہ کے رسول کی سنت سے فیصلہ کروں گا۔ آپ نے فرمایا کہ اگر تم اللہ کے رسول کی سنت میں بھی نہ پاؤ۔ انھوں نے کہا کہ پھر میں اپنی رائے پر محنت کروں گا اور اس میں کمی نہیں کروں گا (اجتھد رأیی ولا آلو ، ۲/۱۱۳۰

اس حدیث میں جہاد کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ کسی معاملہ میں شریعت کا حکم معلوم کرنے کے لئے مطالعہ اور غور و فکر میں محنت کرنا بھی جہاد ہے۔ یہ عمل کا وہی میدان ہے جس کو دوسری حدیث میں تفقہ فی الدین کہا گیا ہے۔

۴۔ حضرت انس بن مالک کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ مشرکوں سے جہاد کرو اپنے مال سے اور جان سے اور زبان سے (جاھدوا المشرکین باموالکم وانفسکم والسنتکم، مشکوٰۃ المصابیح ۲/۱۱۲۴)

اہل اسلام کا غیر اہل اسلام کے ساتھ جہاد (مقابلہ) بنیادی طور پر فکر کے میدان پیش آتا ہے۔ وہ اسلام کے فکر کو نیچا دکھانا چاہتے ہیں تاکہ ان کا غیر اسلامی فکر دنیا میں اونچا رہے۔ اس مقابلہ میں اہل اسلام کو کبھی مال خرچ کرنا پڑتا ہے۔ کبھی زبان سے ان کی باتوں کا توڑ کرنا پڑتا ہے۔ کبھی تقاضا ہوتا ہے کہ پوری جسمانی طاقت کو اس راہ میں لگادیا جائے۔ اس قسم کی ہر کوشش مذکورہ حدیث کے مطابق جہاد کی فہرست میں داخل ہے۔

۵۔ عبداللہ بن عمرو کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک آدمی آیا۔ اس نے آپ سے جہاد کی اجازت مانگی۔ آپ نے پوچھا کہ کیا تمہارے والدین زندہ ہیں۔ اس نے کہا ہاں۔ آپ نے فرمایا کہ پھر تم انھیں میں جہاد کرو (جاء رجل الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاستأذنہ فی الجہاد فقال أحيٌّ والداك۔ قال نعم۔ قال ففیھما فجاھد، متفق علیہ) ۲/۱۱۲۳

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنے ماں باپ کی خدمت کرنا اور ان کے ساتھ اچھا سلوک کرنا بھی جہاد ہے۔ بوڑھے ماں باپ کی خدمت کرنے میں جو نفسیاتی یا جسمانی مشقت اٹھانی پڑتی ہے وہ سب اللہ کے یہاں جہاد کا عمل قرار پائے گی۔

۶۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جہاد کی اجازت طلب کی۔ آپ نے فرمایا کہ عورتوں کا جہاد حج کرنا ہے (قالت استأذنت النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی الجہاد۔ فقال: جھادکن الحج، متفق علیہ) ۲/۳،۷۷

اس سے معلوم ہوا کہ ایک عورت حج کے سفر میں اور جہاد کی ادائگی میں جو مشقت اٹھاتی ہے۔ اس کے لئے وہی جہاد کا عمل بن جاتا ہے۔ حج روحانیت کو بڑھانے والا عمل ہے۔ اس اعتبار سے یہ کہا جا سکتا

ہے کہ اپنے اندر روحانیت اور ربانیت کو بڑھانے کے لئے جو محنت کی جائے وہ بھی اللہ کے نزدیک جہاد کی نوعیت کا عمل شمار ہوگا۔

۷ . قرآن میں حکم دیا گیا ہے کہ اے نبی، تم منکرین کے اوپر قرآن کے ذریعہ جہاد کرو، بڑا جہاد (وجاھدھم بہ جھاداً کبیرا، الفرقان ۵۲)

ظاہر ہے کہ قرآن کوئی تلوار نہیں ہے، وہ ایک کتاب ہے جس میں اسلام کی تعلیمات درج ہیں۔ قرآن کے ذریعہ جہاد کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ تبلیغ قرآن کے عمل میں محنت کرو۔ یہ جہاد اللہ کی نظر میں اتنا اہم ہے کہ اس کو جہاد کبیر کہا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ فکری پیغام رسانی کا کام نہ صرف جہاد ہے بلکہ وہ تمام جہادوں سے بڑا ہے، وہ جہاد کبیر کا درجہ رکھتا ہے۔

۸ . قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ اے ایمان والو، تم میں سے جو شخص اپنے دین سے پھر جائے تو اللہ ایسے لوگوں کو اٹھائے گا جو اللہ کو محبوب ہوں گے اور اللہ ان کو محبوب ہوگا۔ وہ ایمان والوں کے لئے نرم اور انکار کرنے والوں کے اوپر سخت ہوں گے۔ وہ اللہ کی راہ میں جہاد کریں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈریں گے۔ یہ اللہ کا فضل ہے، وہ جس کو چاہتا ہے عطا کرتا ہے (المائدہ ۵۴)

ایک سماج جہاں لوگوں کے اندر غیر اسلامی مزاج ہو، جہاں غیر اسلامی طریقے رائج ہوگئے ہوں، وہاں اسلام کے مطابق بولنا اور اسلامی اصولوں کے مطابق چلنا بے حد مشکل کام ہے۔ ایسے ماحول میں اسلام کو اختیار کرنے والا آدمی پورے ماحول میں اجنبی بن جاتا ہے۔ اس کو ہر طرف سے ملامت کے الفاظ سننے پڑتے ہیں۔ اس بنا پر اس کو بھی جہاد کہا گیا ہے۔ ملامت کو سہتے ہوئے کوئی کام کرنا اس دنیا کا سب سے زیادہ مشکل کام ہے۔

ملامت اور اجنبیت کے اس ماحول میں بے لچک انداز میں اسلام پر قائم رہنا بلاشبہ بہت بڑا جہاد ہے۔ مجاہدانہ جذبہ کے بغیر کوئی شخص ایسے ماحول میں اصول اسلام پر قائم نہیں رہ سکتا۔

۹ . قرآن میں اگرچہ جہاد یا جہد کا مادہ چالیس سے زیادہ بار استعمال ہوا ہے۔ مگر سارے قرآن میں کوئی ایک آیت ایسی نہیں ہے جس میں جہاد کا لفظ خاصۃً صرف جنگ کے معنی میں آیا ہو۔ قرآن میں کہیں بھی "جاھدوا" کا لفظ "قاتلوا" کے مرادف کے طور پر استعمال نہیں ہوا ہے۔

قرآن میں جب خاصۃً صرف جنگ کا حکم بتانا ہو تو وہاں قتال کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ مثلاً

یقاتلون فی سبیل اللہ فیقتلون ویقتلون (التوبہ ۱۱۱) یا فاذا انسلخ الاشہر الحرم فاقتلوا المشرکین (التوبہ ۵) یا فان قاتلوکم فاقتلوھم (البقرہ ۱۹۱) یا ان اللہ یحب الذین یقاتلون فی سبیلہ صفاً (الصف ۴) یا وقاتلوھم حتی لاتکون فتنۃ (البقرہ ۱۹۳) وغیرہ۔

قرآن میں جن آیتوں میں بھی جہاد کا حکم آیا ہے، وہاں جہاد سے یا تو غیر حربی میدان کی جدوجہد مراد ہے، مثلاً الفرقان (آیت ۵۲) جس میں جہاد سے مراد دعوتی و تبلیغی جہاد ہے۔ یا اگر جنگی نوعیت کے جہاد کا حکم ہے تو وہ عمومی جہاد کے تحت ہے، مثلاً التوبہ (آیت ۴۱) قرآن کے مطابق، جہاد میں جنگ کا عمل بھی شامل ہے مگر جنگی عمل ہی کا نام جہاد نہیں ہے۔

جہاد بمعنی قتال

جنگ کی دو قسمیں ہیں: جارحانہ اور مدافعانہ۔ مثلاً غزوۂ احد (۳ ھ) کے موقع پر اہل مکہ نے ۳۰۰ میل سے آکر مدینہ پر حملہ کیا۔ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ساتھیوں کو لے کر اہل مکہ کا مقابلہ کیا۔ اس مثال میں اہل مکہ کا اقدام جارحانہ تھا اور رسول اور اصحاب رسول کا اقدام مدافعانہ۔

اسلام میں مخصوص شرائط کے تحت صرف مدافعانہ جنگ کی اجازت ہے۔ جارحانہ جنگ اسلام میں جائز نہیں۔ البتہ اگر کوئی فریق جارحیت کا آغاز کر دے تو اس کے بعد جارحانہ اور مدافعانہ کا فرق ختم ہوجاتا ہے۔ اب فریق ثانی کے مخالفانہ عزائم کو توڑنے کے لئے اقدامی حملہ بھی حسب حالات جائز ہوگا۔ اسی طرح اگر کسی مبینہ دشمن کے متعلق معلوم ہو کہ وہ تیاری کر رہا ہے اور وہ بہت جلد حملہ کرنے والا ہے تو ایسی صورت میں پیشگی اقدام جائز ہوگا اور وہ باعتبار حقیقت دفاع ہی سمجھا جائے گا۔

جنگ کے بارے میں اسلام کا یہ اصول قرآن کی متعدد آیتوں سے ثابت ہے۔ مثلاً سورۃ التوبۃ (آیت ۱۳) میں مسلمانوں کو مشرک قوم کے ساتھ جنگ کا حکم دیا گیا ہے، اور اس کا سبب یہ بتایا گیا ہے کہ وہی ہیں جنھوں نے پہلے جنگ کا آغاز کیا (وھم بدؤکم اول مرۃ)۔ اسی طرح دوسری جگہ مشرکوں سے جنگ کا حکم دیتے ہوئے یہ کہا گیا ہے کہ اللہ کے راستہ میں ان لوگوں سے جنگ کرو جو تم سے جنگ کرتے ہیں: وقاتلوا فی سبیل اللہ الذین یقاتلونکم (البقرہ ۱۹۰)۔ اسی طرح ایک اور جگہ ارشاد ہوا ہے کہ ان لوگوں کو جنگ کی اجازت دی جا رہی ہے جن کے ساتھ ظلم کیا گیا ہے: اذن للذین

یقاتلون بانهم ظلموا (الحج ۳۹) اسی طرح اہل ایمان کی یہ صفت بتائی کہ وہ ہمیشہ ظلم کے بعد کسی سے بدلہ لیتے ہیں: وانتصروا من بعد ما ظلموا (الشعراء ۲۲۷)

اس معاملہ میں اسلامی تعلیم کی آخری حد یہ ہے کہ جارحانہ جنگ چھیڑنا تو درکنار، جارحانہ جنگ چھیڑنے کی تمنا سے بھی منع کیا گیا ہے۔ یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے معلوم ہوتی ہے جس کو بخاری اور مسلم دونوں نے اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے:

ایها الناس، لا تتمنوا لقاء العدو۔ واسألوا الله العافية۔ فاذا لقيتموهم فاضربوا واعلموا ان الجنة تحت ظلال السيوف (ریاض الصالحین، صفحہ ۳۲۸)

اے لوگو، تم دشمن سے مڈبھیڑ کی تمنا نہ کرو۔ اور اللہ سے عافیت مانگو۔ البتہ جب مڈبھیڑ ہو جائے تو انھیں مارو۔ اور جان لو کہ (اس وقت) جنت تلواروں کے سایہ کے نیچے ہے۔

ایک جامع آیت

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: اے ایمان لانے والو، رکوع کرو اور سجدہ کرو اور اپنے رب کی عبادت کرو اور بھلائی کے کام کرو تاکہ تم کامیاب ہو اور تم اللہ کی راہ میں جہاد کرو جیسا کہ جہاد کرنے کا حق ہے۔ اسی نے تم کو چنا ہے، اور اس نے دین کے معاملہ میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی۔ تمہارے باپ ابراہیم کا دین۔ اسی نے تمہارا نام مسلم رکھا، اس سے پہلے اور اس قرآن میں بھی، تاکہ رسول تمہارے اوپر گواہ بنے اور تم لوگوں کے اوپر گواہ بنو۔ پس تم نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو اور اللہ کو مضبوط پکڑو، وہی تمہارا مالک ہے۔ پس کیسا اچھا مالک ہے اور کیسا اچھا مددگار (الحج ۷۷-۷۸)

قرآن کے اس بیان پر غور کیجئے۔ اس میں اہل ایمان کے لئے چار قسم کی چیزوں کا حکم دیا گیا ہے خدا کی عبادت، عمل خیر (عمل صالح) اتحاد اور شہادت علی الناس۔ ان چار احکام کے درمیان میں کہا گیا ہے کہ وجاهدوا فی الله حق جهاده (اور اللہ کے راستہ میں جہاد کرو، جیسا کہ جہاد کرنے کا حق ہے)

ان الفاظ اور اس ترتیب پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جہاد کا تعلق ان چاروں احکام سے ہے۔ ان چاروں احکام پر اپنے آپ کو کھڑا کرنے کے لئے مجاہدہ درکار ہے۔ اس کے لئے نفس کی خواہشوں کو دبانا ہے۔ اس کے لئے وقت اور مال خرچ کرنا ہے۔ اس کے لئے لوگوں کی زیادتیوں کو برداشت

کرنا ہے۔ کیوں کہ جو شخص لوگوں کی زیادتیوں کو برداشت نہ کرے وہ مشتعل ہو جائے گا، اور مشتعل آدمی اس دنیا میں کبھی کوئی صحیح اور سنجیدہ کام نہیں کر سکتا۔

اس قسم کی ضروری صفات کا ثبوت وہی شخص دے سکتا ہے جو مومن ہونے کے ساتھ مجاہد بن جائے، جو قربانی کی سطح پر اپنی ذمہ داریوں کو ادا کرنے کے لئے تیار ہو۔

تصدیق رسالت

ہندستان ٹائمس (۱۹ اگست ۱۹۹۰) نے امریکی صحافی (Karen Tumulty) کی ایک رپورٹ شائع کی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ امریکہ کے پاس اس وقت اتنے زیادہ ہتھیار ہیں جو دنیا کی پوری آبادی کو پانچ ہزار بار ہلاک کرنے کے لئے کافی ہیں:

Enough to kill everyone in the world 5,000 times.

رپورٹ میں مزید بتایا گیا ہے کہ سوویت روس کے پاس بھی تقریباً اتنے ہی ہتھیار ہیں۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ امریکہ اور روس پچھلے ۷۰ سال سے ایک دوسرے کے سخت ترین دشمن بنے ہوئے تھے۔ ہر ایک دوسرے کو ہلاک کرنے کی دھمکی دے رہا تھا۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ہتھیاروں کے اتنے بڑے ڈھیر کا مالک ہو کر وہ ان کو ایک دوسرے کے خلاف استعمال نہ کر سکے۔ بلکہ دونوں نے باہم یہ معاہدہ کر لیا کہ وہ کبھی ایک دوسرے سے لڑائی نہیں کریں گے۔

اس کی وجہ زمانہ کا فرق ہے۔ قدیم زمانہ میں لڑائی تلواروں کے ذریعہ ہوتی تھی۔ تلوار صرف اس آدمی کی گردن کاٹتی ہے جس کے اوپر تلوار چلائی گئی ہے۔ اس سے زیادہ تلوار کا کوئی مزید نقصان نہیں۔ مگر موجودہ زمانہ کے ہتھیاروں کا معاملہ یہ ہے کہ اگر ان کو استعمال کیا جائے تو ان کا نقصان تباہ کن گیسوں، ہلاکت خیز شعاعوں اور دوسرے مضر اثرات کی صورت میں ساری زمین پر پھیل جاتا ہے۔ حتیٰ کہ اس کا نقصان خود اس قوم تک پہنچ جاتا ہے جس نے اپنے دشمن کے خلاف ان مہلک ہتھیاروں کو استعمال کیا تھا۔

اس واقعہ نے اب ہتھیاروں کی جنگ کو بے معنی بنا دیا ہے۔ چنانچہ موجودہ دنیا کے تمام انسان اختلافی معاملات میں پر امن بات چیت پر زور دے رہے ہیں۔ اب ساری دنیا میں کوئی بھی شخص جنگ و قتال کی وکالت کرنے والا نہیں۔

زمانہ کی اس تبدیلی نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کو ایک نئے عنوان سے ثابت شدہ

بنادیا ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے مقصد کی جدوجہد (یا جہاد) کا طریقہ یہ بتایا تھا کہ اس کو مبنی بر دعوت (*daw'ah*-based) ہونا چاہئے۔ اس کے بعد مارکس جیسے مفکرین اٹھے۔ انھوں نے پر امن طریق عمل کو بے کار بتایا اور مقصد کے حصول کے لئے مبنی بر تشدد (violence-based) طریقہ کی پر زور وکالت کی۔ بیسویں صدی کے نصف اول میں مارکسی نظریہ کا اتنا غلبہ ہوا کہ بعض مسلم مفکرین نے اس سے متاثر ہو کر اسلامی جہاد کی متشددانہ تعبیر شروع کر دی۔

مگر موجودہ صدی کے خاتمہ پر جو حقائق سامنے آئے ہیں، انھوں نے حیرت انگیز طور پر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی رہنمائی کی تصدیق کی ہے اور کارل مارکس کے نظریہ کو باطل ٹھہرایا ہے۔ اس طرح دوبارہ ثابت ہوا کہ پیغمبر اسلام کی رھنمائی الہامی رہنمائی ہے اور دوسرے تمام لوگوں کے نظریات ان کے اپنے محدود ذہن کی پیداوار ہیں جو ابدی حقائق کے سامنے ٹھہرنے کی طاقت نہیں رکھتے۔

پیغمبر اسلامؐ کی صداقت کی یہ کیسی عجیب دلیل ہے کہ آپ کا پیغام زندگی کی تبدیلیوں کے باوجود اپنی صداقت کو مسلسل باقی رکھے ہوئے ہے۔ جب کہ دوسرے انسانوں کے نظریات بار بار زمانی حقائق سے ٹکرا جاتے ہیں۔ وہ وقتی طور پر اپنی چمک دکھاتے ہیں اور اس کے بعد حرف باطل ثابت ہو کر تاریخ کی الماری میں چلے جاتے ہیں۔

باب دوم

کاروانِ ملّت

غالباً ۱۹۳۶ کی بات ہے جب کہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ (۱۹۳۵) کے تحت ہندستان کا پہلا الکشن ہوا۔ ہر طرف انتخابی سرگرمیوں کی دھوم تھی۔ لوگ نہایت جوش وخروش میں تھے۔ اسی زمانہ میں مولانا اقبال احمد سہیل (۱۹۵۵ - ۱۸۸۷) کا یہ شعر پہلی بار میرے کانوں نے سنا:

اے کاروانِ ملّت اٹھ تو بھی گام زن ہو ہر سمت سے صدائیں آتی ہیں طرّقو کی

۱۹۳۶ سے پہلے اور اس کے بعد کی تاریخ بتاتی ہے کہ ملّت کے قافلے اٹھے۔ مسلم رہنماؤں نے بے شمار تعداد میں طوفان خیز تحریکیں چلائیں۔ ان سرگرمیوں سے لوگوں نے بہت بڑی بڑی امیدیں وابستہ کرلیں جس کا ریکارڈ ماضی کے نظم ونثر کے ذخیرہ میں اب بھی موجود ہے۔ طفیل احمد منگلوری نے "روشن مستقبل" کے نام سے ضخیم کتاب لکھی۔ مولانا ظفر علی خاں (۱۹۵۶ - ۱۸۷۱) نے اپنی ایک نظم میں یہ اعلان کیا:

عنقریب اسلام کی فصلِ بہار آنے کو ہے

ان سرگرمیوں پر نصف صدی سے زیادہ کی مدت گزر چکی ہے۔ مگر ابھی تک اس کا کوئی نتیجہ سامنے نہ آسکا۔ اب ہمارے لکھنے اور بولنے والے دشمنانِ اسلام کی ان "سازشوں" کے انکشاف میں مشغول ہیں جنھوں نے ہماری پچھلی نسل کی طوفانی کوششوں کو بے نتیجہ کردیا۔ مگر یہ صرف خود فریبی ہے۔ کیوں کہ خدا کا اٹل قانون ہے کہ اس دنیا میں کوئی قوم ہمیشہ اپنی داخلی کمیوں کی بنا پر بازی ہارتی ہے نہ کہ بیرونی سازشوں کی بنا پر۔

موجودہ زمانہ کے مسلم رہنماؤں نے اپنی قوم کو جو رہنمائی دی، وہ ایک لفظ میں یہ تھی کہ —— ایک ہاتھ میں قرآن اور دوسرے ہاتھ میں تلوار لے کر آگے بڑھو اور ساری دنیا میں اسلام کا جھنڈا گاڑ دو۔ چنانچہ سو سال سے بھی زیادہ عرصہ سے مسلمان لفظی یا عملی تلوار بازی کے اسی مشغلہ میں مصروف رہے ہیں۔ آجکل پاکستان اور کشمیر میں یہی منظر دیکھا جاسکتا ہے جہاں مسلم نوجوان دہشت گردی کے عمل میں مشغول ہیں اور پرجوش طور پر یہ ترانہ گا رہے ہیں:

دل میں ہے اللہ کا خوف ہاتھ میں ہے کلاشنکوف (Kalashnikov)

اس رہنمائی میں بیک وقت دو غلطیاں تھیں۔ اس میں انتہائی معصومانہ طور پر یہ فرض کر لیا گیا کہ مسلمانوں کے ہاتھ میں قرآن ہے اور ان کے دل میں اللہ کا خوف موجود ہے۔ حالاں کہ اصل واقعہ یہ تھا کہ صدیوں کے زوال کے نتیجہ میں قرآن سے مسلمانوں کا رشتہ ٹوٹ چکا تھا، اور قساوت کے نتیجہ میں ان کے دل اللہ کے خوف سے خالی ہو چکے تھے۔

ایسی حالت میں ضرورت تھی کہ لمبی اور خاموش جد وجہد کے ذریعہ جدید مسلم نسلوں کے دماغ میں دوبارہ قرآن کی روشنی پیدا کی جائے اور ان کے دلوں کو دوبارہ خدا کے خوف سے کانپنے والا بنایا جائے۔ یہ ایک بے حد صبر آزما کام تھا۔ مگر مسلم رہنماؤں نے اس داخلی محاذ پر محنت کیے بغیر خارجی نعروں پر قوم کو دوڑانا شروع کر دیا۔ چنانچہ ان کی ساری کوششوں کا انجام اس چھت کا سا ہوا جو دیمک زدہ لکڑی کے اوپر کھڑی کر دی گئی ہو۔

اس رہنمائی میں دوسری بھیانک غلطی یہ تھی کہ انھوں نے زمانہ کے فرق کو نہیں سمجھا۔ قدیم زمانہ میں "تلوار" طاقت کا نشان تھی، موجودہ زمانہ میں "علم" طاقت کا نشان ہے۔ مگر مسلم رہنما اندوہناک حد تک اس فرق سے بے خبر رہے۔ انھوں نے ناقابل فہم نادانی کے تحت سائنس کے دور میں ہر طرف تلوار کا ترانہ گانا شروع کر دیا۔

اس غلط رہنمائی کا نتیجہ یہ ہوا کہ پوری کی پوری نسل جنگ جویانہ ذہنیت میں مبتلا ہو گئی۔ ہر شخص بس جنگ اور ٹکراؤ کی اصطلاحوں میں سوچنے لگا۔ جس کے پاس تلواری جنگ چھیڑنے کا موقع تھا۔ اس نے اپنے مفروضہ دشمنوں کے خلاف تلواری جنگ چھیڑ دی۔ اور جن لوگوں کے پاس صرف الفاظ تھے، انھوں نے الفاظ کی لامتناہی بم باری کا مشغلہ اپنے لیے اختیار کر لیا۔

اس انداز کار کے نتیجہ میں نوبت یہاں تک پہونچی ہے کہ اب مسلمانوں میں وہی آوازیں مقبولیت کا درجہ حاصل کرتی ہیں جو جنگ جویانہ لہجے میں بولی گئی ہوں۔ تعمیر اور حقیقت پسندی کی بات مسلمانوں کو اپیل نہیں کرتی۔ جنگ جویانہ نعروں پر فی الفور ان کی بھیڑ جمع کی جا سکتی ہے مگر پرامن اور خاموش پروگرام کے نام پر انھیں بلائیے تو آپ کا پنڈال بالکل سونا پڑا رہے گا۔

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کا پورا ادب اور ان کی تمام سرگرمیاں اسی نہج پر قائم ہو گئی ہیں۔ ان کی ہر تحریک میں کسی نہ کسی اعتبار سے یہی روح کارفرما ہے۔ آپ ان کے جس

فکری یا عملی رخ کا مطالعہ کیجئے ، ہر جگہ آپ کو اسی کی جھنکار سنائی دے گی ۔

نثر کے دور میں شاعری ، خاموش تدبیر کے دور میں خطابت ، عملی منصوبہ بندی کے دور میں لفظی ہنگامہ آرائی ۔ تعمیر کے دور میں تخریب ، پُر امن جدوجہد کے دور میں عسکری سرگرمی ، سائنسی تفکیر کے دور میں روایتی تفکیر ، حقائق کی بنیاد پر اٹھنے کے دور میں خوش خیالیوں کی بنیاد پر اٹھنے کا خواب ——— سب اسی کے مظاہر ہیں ، اور یہی مختصر طور پر موجودہ زمانہ کے تمام مسلم رہنماؤں کی رہنمائی کا خلاصہ ہے ۔ اس قسم کی ہر کوشش خلاف زمانہ حرکت (anachronism) کی مصداق تھی ، اور خلاف زمانہ حرکت کبھی کسی کے لیے نتیجہ خیز نہیں ہو سکتی ۔

ملّت کے کاروان کو دوبارہ متحرک کرنے کے لیے شاعری اور خطابت اور انشا پردازی کا انداز صرف الٹا نتیجہ پیدا کرنے والا ہے ۔ اس قسم کی پرجوش لفاظی کا نتیجہ صرف یہ ہو سکتا ہے کہ ایک پچھڑی ہوئی قوم دوبارہ خوش فہمیوں کے گڑھے میں گر کر رہ جائے ۔

اس وقت کرنے کا کام یہ ہے کہ ملّت کے افراد میں دوبارہ سچی دینی روح پیدا کی جائے ۔ ان کو "کلمہ گو" کی سطح سے اٹھا کر "کلمہ فہم" کی سطح پر لایا جائے ۔ تقلیدی ایمان کی جگہ ان کے اندر زندہ اور شعوری ایمان پیدا کیا جائے ۔ ان کے عقیدہ کو دوبارہ فکری انقلاب بنا دیا جائے ۔

دوسرا کام یہ ہے کہ ملّت کو عصر حاضر کے تقاضوں سے باخبر کیا جائے ۔ ایک روایت میں مومن کو بصیراً بزمانہ (اپنے زمانہ سے باخبر انسان) بتایا گیا ہے ۔ یہ بلاشبہ انتہائی اہم ہے ۔ اس کے بغیر ملّت کا قافلہ اپنی مطلوبہ منزل تک نہیں پہونچ سکتا ۔

اسی کے ساتھ یہ بھی لازمی طور پر ضروری ہے کہ مسلمانوں کو ایک داعی گروہ کی حیثیت سے اٹھایا جائے ۔ کسی قوم کے اندر بلند فکری اور اعلیٰ حوصلگی کی خصوصیات ہمیشہ اس وقت پیدا ہوتی ہیں جب کہ اس کے پاس کوئی برتر عالمی پیغام ہو جس کی تمام قوموں کو ضرورت ہو ۔ کسی قوم کی سب سے بڑی نفسیاتی دولت اس کا یہ احساس ہے کہ اس کے پاس ایک اعلیٰ نظریہ ہے ، ایک ایسا نظریہ جو اپنی صداقت اور نفع بخشی کی بنا پر اس قابل ہے کہ وہ تمام اقوام عالم تک پہنچے ۔ یہ احساس ہی در اصل وہ سب سے بڑا سرچشمہ ہے جو کسی قوم کے افراد میں بلند ہمتی اور اولوالعزمی کے تمام اعلیٰ اوصاف پیدا کرتا ہے ۔

مسلمانوں کو دعوت کی بنیاد پر کھڑا کرنا ایک طرف خدا کے پیغام کو اس کے بندوں تک پہنچانے کا

انتظام ہے۔ دوسری طرف یہی وہ عمل ہے جو مسلمانوں کے موجودہ جمود کو ختم کر کے انھیں سیلاب کی مانند رواں بنانے والا ہے۔ یہی عمل انھیں اس قابل بناتا ہے کہ وہ زندگی کی ہر شاہراہ میں داخل ہو جائیں۔

لارڈ لوتھین (۱۸۸۲ – ۱۹۴۰) برطانیہ کے اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ اپنی وفات سے دو سال پہلے ۱۹۳۸ میں ہندستان آئے اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں تقسیم اسناد کے موقع پر خطبہ پڑھا۔ اس خطبہ میں انھوں نے مسلمان نوجوانوں کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا:

"یورپ اپنے سیاسی، معاشی، تمدنی اور عائلی مسائل کا تسلی بخش حل دریافت کرنے میں ناکام ہو چکا ہے۔ آپ حضرات کا دعوی ہے کہ اسلام زندگی کا مکمل دستور العمل ہے۔ اور اس میں اجتماعی مسائل کا بہترین حل موجود ہے۔ اس لیے میں آپ کو مشورہ دیتا ہوں کہ آپ بلاد مغرب میں جا کر وہاں کے باشندوں کو اسلام کی تعلیمات سے آگاہ کریں۔"

یورپ کے ایک ذمہ دار شخص نے ایک مسلم ادارہ میں یہ بات اب سے ۵۰ سال پہلے کہی تھی۔ مگر نصف صدی گزر گئی اور اس پوری مدت میں کوئی ایک بھی قابل ذکر مسلمان نہیں اٹھا جو خدا کا دین لے کر اہلِ یورپ کے درمیان دیوانہ وار داخل ہو جائے۔ موجودہ زمانہ میں مختلف اسباب کے تحت مسلم شخصیتوں کے یورپ کے سفر ہوتے رہتے ہیں۔ مگر یہ تمام اسفار صرف یورپ میں قیام کرنے والے مسلمانوں کے درمیان ہوتے ہیں نہ کہ حقیقۃً یورپ کے ان اصل باشندوں کے درمیان جن کے ایک فرد لارڈ لوتھین تھے۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے "اسلامی کیرکٹر" کی حفاظت کے لیے ہمارے تمام چھوٹے بڑے لیڈر میدان جہاد میں سرگرم ہیں۔ مگر کسی لیڈر کو یہ سوچنے کی توفیق نہیں ہوئی کہ کیا وجہ ہے کہ پچھلے ۵۰ سال کے اندر علی گڑھ نے کوئی ایک قابل ذکر فرد ایسا پیدا نہیں کیا جو انگریزی زبان اور نئے علوم سے واقفیت حاصل کر کے یورپ جائے اور وہاں کے غیر مسلم باشندوں کو اسلام کا پیغام پہونچائے "اسلامی کیرکٹر" کی حفاظت کا مطلب اگر صرف یہ ہے کہ مسلم یونیورسٹی میں مسلمانوں کے لیے داخلہ اور ملازمت کا حق محفوظ رہے تو یہ اسلام کے ساتھ مذاق کرنا ہے۔ یہ اپنے قومی اغراض کے لیے اسلام کا نام استعمال کرنا ہے۔ اور جو لوگ اپنے قومی اغراض کے لیے اسلام کا نام استعمال کریں

وہ اللہ کے یہاں غضب کے مستحق ہوتے ہیں نہ کہ رحمت و نفرت کے مستحق۔

لارڈ لوتھین کی مذکورہ تجویز پر عمل کرنے کے لیے انگریزی دانی کی ضرورت تھی، اس لیے عام مسلم رہنماؤں کے لیے یہ عذر ہو سکتا ہے کہ وہ انگریزی نہیں جانتے تھے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے یہاں ایک اور دعوتی موقع پیدا کیا تھا، اور اس موقع کو استعمال کرنے کے لیے اپنی مادری زبان ہی کافی تھی۔ مگر یہاں بھی ہمارے رہنما صد فی صد ناکام رہے۔

یہ امکان نوآبادیاتی نظام نے پیدا کیا تھا۔ یورپ کی قومیں جدید طاقت کے زور پر ساری دنیا میں پھیل گئیں۔ اور جگہ جگہ انھوں نے اپنا اقتدار قائم کیا۔ اس قسم کے لوگ خود اپنی ضرورت اور مصلحت کے تحت ہر جگہ کی مقامی زبان بھی سیکھتے تھے۔ مثلاً جو انگریز اس زمانہ میں ہندستان آئے انھوں نے یہاں کی مقامی زبان بھی سیکھی اور یہ حیثیت اس زمانہ میں جس زبان کو حاصل تھی وہ اردو زبان تھی۔

جن ہندستانیوں کی عمریں پچاس سال سے اوپر ہیں وہ بخوبی طور پر اس واقعہ کو جانتے ہیں کہ ۱۹۴۷ کے انقلاب سے پہلے ہندستان میں سب سے زیادہ بولی اور سمجھی جانے والی زبان اردو تھی۔ تاہم جو لوگ بعد کے زمانہ کی پیداوار ہیں، ان کے سمجھنے کے لیے یہاں میں ایک حوالہ نقل کرتا ہوں۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) نے اردو زبان (Urdu Language) کے تحت جو کچھ لکھا ہے اس میں سے ایک بات یہ ہے کہ ۱۹۴۷ کی ملکی تقسیم سے پہلے اردو زبان شمالی ہند کی عمومی طور پر بولی جانے والی زبان تھی جو اس وقت ہندستانی یا کھڑی بولی کہی جاتی تھی:

> The spoken language, referred to before the 1947 partition as Hindustani or Khari Boli, was the lingua franca of northern India (X/297).

ایک واقعہ

میجر جنرل اجیت انیل رد را ۱۹۱۵ میں ہندستانی فوج میں داخل ہوئے۔ اب ان کی عمر ۹۰ سال ہو چکی ہے۔ ٹائمس آف انڈیا (۱۵ اکتوبر ۱۹۸۶) کے ایک اسٹاف رپوٹر سے بات چیت کرتے ہوئے انھوں نے پچھلے زمانہ کی اپنی بہت سی یادداشتیں بتائیں۔ انھوں نے

اس سلسلے میں جو واقعات بتائے ان میں سے ایک واقعہ یہ تھا۔

۱۹۴۷ سے پہلے جب وہ فوج کی باقاعدہ سروس میں تھے تو فیض احمد فیض بھی ان کے تحت کام کرتے تھے۔ فیض کا تعلق فوج کے رابطۂ عامہ (Public relations) کے شعبہ سے تھا۔ ایک بار فیض کے ذمہ یہ کام سپرد ہوا کہ وہ اس وقت کے وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی تقریر کا ہندستانی زبان میں ترجمہ کریں۔ فیض نے ترجمہ کر کے بھیج دیا۔ اس کے بعد فیض احمد فیض اور میجر جنرل ردرا دونوں وائسریگل لاج (راشٹرپتی بھون) بلائے گئے تاکہ وہ ادائیگی الفاظ کے معاملہ میں وائسرائے کی رہنمائی کر سکیں۔ اس کے بعد میجر جنرل ردرا کے الفاظ یہ ہیں:

> When Faiz and myself called on the Viceroy to help him with the diction, Mountbatten was pacing up and down his room in the now christened Rashtrapati Bhawan rehearsing his speech. He was speaking Hindustani quite well, much to our surprise.

جب فیض احمد فیض اور میں وائسرائے کی ملاقات کے لیے گیے تاکہ الفاظ کی ادائیگی کے معاملہ میں ان کی مدد کریں، تو ماونٹ بیٹن اپنے موجودہ راشٹرپتی بھون کے کمرہ میں اِدھر سے اُدھر چل رہے تھے اور اپنی تقریر کو دہرا رہے تھے۔ اس وقت وہ بالکل صاف ہندستانی بول رہے تھے۔ یہ دیکھ کر ہم کو سخت تعجب ہوا۔

یہ واقعہ ۱۹۴۷ سے پہلے اس دور کی یاد دلاتا ہے جب کہ ملک میں ہندستانی (یا اردو) کا غلبہ تھا۔ ملک کے اعلیٰ ترین حکام بھی اردو اور ہندستانی کو بولتے اور سمجھتے تھے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ ہندستان کی اردو بولنے والی قوم اور حکمرانوں کے درمیان زبان کا وہ فاصلہ (Language gap) موجود نہ تھا جو آج پایا جا رہا ہے۔ اس بات کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ اس وقت داعی کی جو زبان تھی وہی مدعو کی زبان بھی تھی۔ مگر کیسی عجیب بات ہے کہ داعیوں کے گروہ نے اس امکان کو ایک فیصد بھی استعمال نہیں کیا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ ہمارے لیڈروں نے اس زمانہ میں ان حکمرانوں سے بے شمار ملاقاتیں کیں۔ مگر یہ تمام لیڈر ان حکمرانوں سے صرف مانگنے کے لیے ملتے تھے نہ کہ انھیں دینے کے لیے۔ وہ یہی کرتے رہے یہاں تک کہ وہ دور ختم ہو گیا جس میں اردو زبان نے عوامی اہمیت حاصل کی تھی۔

اردو اگرچہ اب بھی اس ملک میں باقی ہے اور انشاء اللہ ہمیشہ باقی رہے گی۔ مگر یہ ایک واقعہ ہے کہ داعی اور مدعو کے درمیان رابطہ کی زبان کی حیثیت سے اس کی سابقہ اہمیت ختم ہو چکی ہے۔ اب مسلمانوں کو ماضی کا نوحہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ اب انھیں یہ کرنا ہے کہ ملک کی قومی زبان نیز علاقائی زبانوں کو سیکھیں۔ تاکہ اردو کی سطح پر جو رشتہ ختم ہو گیا ہے اس کو دوسری زبانوں کی سطح پر دوبارہ حاصل کیا جا سکے۔

یہی ماضی کی غلطی کی واحد تلافی ہے۔ مسلمانوں کو بین اقوامی زبان بھی سیکھنا ہے اور اسی کے ساتھ ملکی اور قومی زبان بھی۔ اس طرح وہ موجودہ دنیا میں اپنی ذمہ داریوں کو ادا کر سکتے ہیں۔ اور آج کی دنیا میں ایک داعی گروہ کی حیثیت سے نمایاں ہو سکتے ہیں۔

صراطِ مستقیم سے انحراف

وَاَنَّ ھٰذا صراطی مستقیماً فاتبعوہ ولا تتبعوا السُّبلَ فتفرق بکم عن سبیلہ ذالکم وصّاکم بہ لعلکم تتقون (الانعام ۱۵۴)

اور کہدو کہ یہ میری سیدھی شاہراہ ہے، پس تم اسی پر چلو اور دوسرے راستوں پر نہ چلو کہ وہ تم کو اللہ کے راستہ سے جدا کر دیں گی۔ یہ اللہ نے تم کو حکم دیا ہے تاکہ تم بچو۔

یہ حکم قرآن میں ایک سے زیادہ مقام پر آیا ہے۔ موجودہ زمانہ کے بعض مفسرین نے اس کا یہ مطلب بیان کیا ہے کہ صراط مستقیم یا السبیل سے مراد خدا کا دین اسلام ہے، اور متفرق راستوں (سُبل) سے مراد زندگی کے وہ راستے اور نظام ہیں جو انسان نے بطور خود وضع کئے ہوں۔ مگر یہ صحیح نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ السبیل اور سُبل دونوں سے مراد اسلام ہی کے طریقے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ السبیل سے مراد اصل دین ہے اور سُبل سے مراد فروع دین۔ اس حکم کا مطلب یہ ہے کہ تعلیم و دعوت میں سب سے زیادہ زور "السبیل" پر دیا جانا چاہئے نہ کہ "سُبل" پر۔

راستوں میں ایک راستہ وہ ہوتا ہے جو سیدھا اور چوڑا ہو۔ ایسا راستہ السبیل یا صراط مستقیم ہے۔ اور دوسرے راستے وہ ہیں جو تنگ ہوتے ہیں اور اصل شاہراہ کے دائیں اور بائیں سے نکلتے ہیں۔ ان دوسرے راستوں کو سُبل کہا جاتا ہے۔ اسی طرح خدا کے دین کی ایک اصل اور اساس ہے۔ اور اس کے علاوہ اس کے کچھ فروع ہیں۔ اول الذکر کی حیثیت دین میں شاہراہ (صراط مستقیم) کی ہے، اور ثانی الذکر کی حیثیت اطراف کے راستوں (سُبل) کی۔

جو آدمی شاہراہ پر چلے وہ اپنی منزل پر پہنچتا ہے۔ اور جو آدمی متفرق راستوں پر دوڑے وہ درمیان ہی میں بھٹک جائے گا، وہ اپنی منزل پر نہیں پہنچ سکتا۔ اسی طرح دین کا جو اصلی اور اساسی حصہ ہے وہ گویا دین کی شاہراہ ہے۔ آدمی کو چاہئے کہ وہ اسی کو سب سے زیادہ اپنی توجہ کا مرکز بنائے۔ اپنے قول و عمل میں وہ سب سے زیادہ اسی کا اہتمام کرے۔ اس کے بعد جو فروع دین ہیں وہ گویا اس کی سُبل ہیں۔ اہل دین کو اِس سے منع کیا گیا کہ وہ ان فروع پر زیادہ توجہ دینے لگیں۔ وہ اصل دین کے بجائے فروع دین کو اپنے لئے زور و تاکید کا موضوع بنالیں۔

ابن عطیہ نے اتباعِ سُبل کی تشریح الشذوذ فی الفروع (القرطبی ۱۳۸/۷) کے لفظ سے کی ہے۔ یعنی اصولی چیزوں کے بجائے فروعی چیزوں کی طرف چل پڑنا۔ یہ نہایت صحیح تفسیر ہے۔ آجکل کی زبان میں اس کو تغیر تاکید (shift of emphasis) کہا جاسکتا ہے۔

تغیر تاکید (shift of emphasis) کیا ہے، اس کو سمجھنے کے لئے ایک مثال لیجئے۔ امام بخاری اور امام مسلم دونوں نے روایت کیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سن لو، آدمی کے جسم میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے۔ یہ ٹکڑا درست ہو تو پورا جسم درست رہتا ہے، اور اس ٹکڑے میں خرابی آجائے تو پورا جسم خراب ہو جاتا ہے۔ سن لو کہ گوشت کا یہ ٹکڑا انسان کا دل ہے (اَلَا وَاِنَّ فِی الجَسَدِ مُضْغَۃً اِذَا صَلَحَتْ صَلَحَ الْجَسَدُ كُلُّہٗ وَاِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّہٗ اَلَا وَهِیَ الْقَلْبُ)

یہ حدیث واضح طور پر ثابت کرتی ہے کہ نظام (system) کے بگاڑ کا اصل سبب فرد (individual) کا بگاڑ ہے۔ اب اگر نظام میں بگاڑ پیدا ہو اور اس کے بعد لوگ ایسا کریں کہ وہ نظام کی اصلاح کے نام پر نظام سے ٹکرانے لگیں تو یہ اتباعِ سُبل کی مثال ہوگی۔ اور اگر نظام کے بگاڑ کی اصلاح کے لئے فرد کی درستگی پر زور دیا جائے تو یہ وہ مطلوب چیز ہوگی جس کو قرآن میں صراطِ مستقیم کا اتباع کہا گیا ہے۔

اہل ایمان کو اس سے منع کیا گیا ہے کہ وہ اصولی چیزوں کو غیر اہم حیثیت دے دیں اور ان چیزوں پر زیادہ زور دینے لگیں جن پر حقیقۃً زیادہ زور نہیں دینا چاہئے۔ ایسا کرنے سے دین کا فوکس بدل جاتا ہے۔ اس کے بعد لوگوں کے درمیان ایسی سرگرمیاں جنم لیتی ہیں جو بظاہر غیر اسلامی نہیں ہوتیں۔ مگر اپنے نتیجہ کے اعتبار سے وہ لوگوں کو حقیقی مطلوب الٰہی سے دور کرنے کا سبب بن جاتی ہیں۔

یہ برائی اکثر ایک "اور" کے ذریعہ آتی ہے۔ یعنی ایک عطف (conjunction) کے ذریعہ اصل کے ساتھ فرع کو جوڑ لیا جاتا ہے۔ مثلاً ایک مسلم جماعت اٹھی۔ اس نے "اور" کی تدبیر سے انقلاب کو ایمان کے ساتھ شامل کر دیا۔ اس نے "ایمان اور انقلاب" کا نعرہ دیا۔ اس جملہ میں "اور" بظاہر ایک سادہ سا عطف کا معاملہ ہے۔ مگر اس عطف نے پورے دین کا ڈھانچہ بدل دیا۔ اس نے سیاسی

انقلاب کو وہ اہمیت دے دی جو فرد انسانی میں نفسیاتی انقلاب کی ہوتی ہے۔ حالاں کہ دونوں کی حیثیت دین میں یکساں نہیں۔ اس عطف کا نتیجہ یہ ہوا کہ پورے دین کا نقشہ بگڑ کر رہ گیا۔

دین میں ایمان کی حیثیت مطلوب اصلی کی ہے۔ اور سیاسی انقلاب کی حیثیت مطلوب اضافی کی۔ مگر اس عطف نے دونوں کو برابر کا درجہ دے دیا۔ بلکہ بگڑے ہوئے ذوق کا نتیجہ یہ ہوا کہ سیاست نے عملاً ہر دوسری چیز پر فوقیت حاصل کر لی۔ اس کے بعد سیاسی انقلاب کے لئے وہ دھوم بر پا کی جانے لگی جس کا خدا نے اہل ایمان کو مکلّف نہیں کیا تھا۔ اور جب محسوس ہوا کہ شرعی حدود کے اندر حریف لیڈروں کا مقابلہ مشکل ہے تو اس کے بعد ایسے طریقے اختیار کئے گئے کہ خدا کا دین ایک کھیل بن کر رہ گیا۔

نعرے اور جھنڈے اور جلوس اور مظاہرہ کی سیاست کو پہلے گندا قرار دے کر اس کو قابل ترک بتایا گیا تھا مگر بعد کو پوری طرح اس کو اختیار کر لیا گیا۔ پہلے یہ کہا گیا تھا کہ اسلامی حکومت معاشرہ کی تدریجی اصلاح کے ذریعہ بنتی ہے اور اب اچانک سیاسی انقلاب کا نظریہ اپنا لیا گیا۔ پہلے الکشن میں امیدواری کے طریقہ کو ناجائز بتایا گیا تھا مگر اب اس کو عین جائز قرار دے لیا گیا۔ پہلے عورت کی حکمرانی کو غیر شرعی بتایا گیا تھا اور اب عورت کی حکمرانی کے حق میں شریعت سے فتویٰ حاصل کر لیا گیا۔ وغیرہ۔

اس قسم کی تمام خرابیاں جو اس تحریک کے اندر پیدا ہوئیں، ان کا اصل سبب وہی انحراف تھا جس کو قرآن میں اتباع سُبل کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

اسی طرح اتباع سبل کی ایک مثال وہ لوگ ہیں جو اسلامی دعوت کو "ایمان اور احترام اکابر کی دعوت" کے الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے اسلام میں صحابۂ کرام، علماءِ عظام، اکابر ملت، سب کا احترام ضروری ہے۔ ان میں سے کسی پر تنقید نہیں کی جا سکتی۔ ان کا صرف اتباع کیا جا سکتا ہے۔

ان حضرات کی غلطی یہ ہے کہ جہاں فُل اسٹاپ تھا، وہاں انھوں نے کا ما لگا دیا۔ اصحاب رسول بلاشبہہ تنقید سے بالاتر ہیں، ان کا مطلق احترام ضروری ہے۔ مگر رسول اور اصحاب رسول کے بعد اس معاملہ میں فل اسٹاپ لگا ہوا ہے۔ ان کے بعد کا ما لگا کر کسی بھی گروہ کو اس صف میں شامل

کرنا درست نہیں۔ اس معاملہ میں صحیح شرعی مسلک وہی ہے جو امام ابوحنیفہ سے منقول ہے۔ یعنی صحابہ کے بعد جو لوگ ہیں وہ بھی آدمی اور ہم بھی آدمی (ھم رجال ونحن رجال)

" ایمان اور احترام اکابر " کے الفاظ میں اسلامی دعوت کی تعبیر اتباع سُبل کی سب سے زیادہ خطرناک صورت ہے۔ اس انحراف سے سادہ طور پر صرف ذہن کا فوکس نہیں بدلتا، بلکہ وہ آدمی کو شرک کے قریب پہنچا دیتا ہے۔

اسلام میں حُبّ شدید صرف اللہ کے لئے ہے، مگر یہ ذہن آدمی کی حُبّ شدید کا رخ مزعومہ اکابر کی طرف کر دیتا ہے۔ اسلام میں غیر مشروط اتباع کا حق صرف اللہ کے رسول کے لئے ہے، مگر یہ ذہن آدمی کو اپنے اکابر کا غیر مشروط متّبع بنا دیتا ہے۔ اسلام میں صرف اللہ اور رسول کا کلام حجت کی حیثیت رکھتا ہے، مگر اس ذہن کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی اپنے اکابر کے ملفوظات اور اقوال کو آخری حجت کا درجہ دے دیتا ہے۔ اسلامی عقیدہ کے مطابق، اللہ نے صرف اپنے رسول کو معصوم عن الخطا کا درجہ دیا ہے، مگر اس ذہن کے لوگ اپنے خودساختہ اکابر کو معصوم عن الخطا افراد کی فہرست میں شامل کر دیتے ہیں۔ وغیرہ

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے درمیان جو اصلاحی تحریکیں اٹھیں، وہ زیادہ تر" اتباع سبل" کی اسی غلطی کا شکار رہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تحریکوں کی غیر معمولی دھوم کے باوجود، ان سے حقیقی دینی نتیجہ برآمد نہ ہو سکا۔ غور کیجئے تو اتباع سُبل کی ان تمام مثالوں میں " عطف " کی مذکورہ تدبیر ہی کارفرما نظر آئے گی۔

کسی نے کہا کہ مسلمانوں کو دو چیزوں کی ضرورت ہے ـــــ " قرآن اور سائنس " بظاہر یہ ایک بے ضرر ترکیب ہے۔ مگر اس کا عطف درست نہیں۔ اس عطف نے سائنس کو قرآن کے مساوی قرار دے دیا۔ حالاں کہ سائنس خادم قرآن ہے نہ کہ مساویٔ قرآن۔ کسی نے " ایمان اور عسکریت " کا نعرہ دیا۔ یہ تسویہ بھی درست نہ تھا۔ کیوں کہ عسکریت ایمان کا مساوی حصہ نہیں ہے۔ وہ بوقت ضرورت دفاع کے لئے اختیار کی جاتی ہے۔ ایمان اصلی ہے اور عسکریت صرف ضمنی۔ ان چیزوں نے مسلمانوں کے فکر و عمل کا رخ ایسی سمت میں موڑ دیا جو سچے دین کی طرف جانے والا نہ تھا۔

"عطف" کے ذریعہ اتباع سبل کی خرابی پیش آنے کی بے شمار صورتیں ہیں۔ مثلاً اگر آپ

ایک اسلامی تحریک اٹھائیں اور اس کو " ایمان ویقین کی دعوت " کا نام دیں۔ تو یہ بھی اتباع سبل ہی کی ایک صورت ہوگی۔ کیوں کہ اسلامی دعوت کی یہ تعبیر اسلام کی ثابت شدہ تعبیر کے مطابق نہیں۔

اگر آپ قرآن کو یہ جاننے کے لئے پڑھیں کہ اس کا نکتۂ دعوت کیا ہے تو سارے قرآن میں کہیں بھی آپ یہ نہ پائیں گے کہ قرآن اسلام کی دعوت کو " ایمان اور یقین کی دعوت " کے الفاظ میں بیان کر رہا ہے۔ اس کے بجائے قرآن میں اس سلسلہ میں جو الفاظ ملتے ہیں، ان کے مطابق، اسلامی دعوت کی زیادہ صحیح تعبیر یہ ہے کہ اس کو " ایمان اور تقویٰ کی دعوت " یا " ایمان اور عمل صالح کی دعوت " کہا جائے۔

اسلامی دعوت کی تعبیر کے لئے اگر قرآنی لفظ کا استعمال کیا جائے تو اس سے صحیح ذہن بنتا ہے اور اگر قرآنی تعبیر کے علاوہ کوئی دوسری تعبیر اختیار کی جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ذہن کا فوکس بدل جائے گا۔ اس کے بعد صحیح اور مطلوب ذہن کی تشکیل ممکن نہیں۔

اسلام کی دعوت کو " ایمان ویقین کی دعوت " کے اسلوب پر چلانے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ لوگوں کا ذہن پوری طرح قرآن وسنت کے انداز پر نہیں بنے گا۔ بلکہ زیادہ تر ایک اور ڈھنگ پر بنے گا جس کا یہ اسلوب تقاضا کرتا ہے۔

ایسے لوگوں کے اندر یقین (صحیح تر لفظ میں خوش فہمی) کا مزاج تو آئے گا، مگر حقیقی معنوں میں خوفِ خدا کا مزاج ان کے اندر نہیں آئے گا۔ ذکر اور عبادت جیسے کچھ ظاہری اعمال تو ان میں پیدا ہوں گے مگر وسیع تر معنوں میں عمل صالح ان کی زندگیوں کے اندر پیدا نہیں ہوگا۔ اپنے اکابر کی عظمت سے تو وہ ضرور سرشار ہوں گے مگر خداوند ذوالجلال کی عظمت سے سرشاری ان کے یہاں پائی نہیں جائے گی۔ وہ تلاوت قرآن یا حفظ قرآن کے شائق تو نظر آئیں گے مگر تدبر قرآن یا مطالعہ قرآن سے انھیں کوئی دلچسپی نہ ہوگی۔ کمیاتی اعمال کی اہمیت ان کی سمجھ میں آئے گی مگر کیفیاتی اعمال کی اہمیت کو وہ نہ سمجھ سکیں گے۔ وہ سکون واطمینان والے دین کو جانیں گے مگر وہ اس دین سے واقف نہیں ہوں گے جو آدمی کو اندیشہ اور اضطراب کے طوفان میں مبتلا کر دیتا ہے۔

قرآن میں پیغمبر کی زبان سے ارشاد ہوا ہے کہ بے شک میرا رب ایک سیدھے راستہ پر ہے (اِنَّ رَبِّیْ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْم (ہود ۵۶) دوسری جگہ ہے کہ اللہ نے فرمایا کہ یہ راستہ سیدھا مجھ

تک پہنچاتا ہے (هٰذا صراطٌ عَلَیَّ مستقیم ، الحجر ۴۱) اسی طرح فرمایا کہ اللہ تک سیدھی راہ پہنچاتی ہے اور بعض راستے کج ہیں (وعلی اللہ قَصْدُ السَّبِیْلِ ومنْهَا جَائِرٌ ، النحل ۹)

سیدھی شاہراہ اپنے مسافر کو بے روک ٹوک منزل تک پہنچا دیتی ہے۔ لیکن اگر آدمی اطراف کی پگڈنڈیوں پر چل پڑے تو وہ اِدھر اُدھر بھٹک جائے گا ، وہ مطلوبہ منزل پر نہیں پہنچ سکتا۔ اسی تمثیل سے مذکورہ آیتوں میں دین کے معاملہ کو سمجھایا گیا ہے۔

دین کی اصل تعلیمات نہایت واضح ہیں۔ وہ سیدھی شاہراہ کی مانند ہیں۔ جو آدمی ان تعلیمات کو ان کی اصل صورت میں پکڑ لے وہ ان پر چلتے ہوئے خدا تک پہنچ جائے گا۔ اور جو شخص فروعی مسائل اور خود ساختہ تعبیرات کو لے کر دوڑنے لگے ، وہ راستہ ہی میں بھٹک کر رہ جائے گا۔ وہ کبھی خدا تک نہیں پہنچ سکتا۔

خدا کے دین میں کسی بھی قسم کی تبدیلی آدمی کو منحرف کر دیتی ہے ، وہ صحیح رخ کے بجائے غلط رخ پر چل پڑتا ہے۔ حتی کہ دین میں معمولی قسم کا فرق کرنا بھی آخر کار بھیانک نتائج تک پہنچانے کا سبب بن جاتا ہے۔

مثلاً قرآن کے مطابق اگر آپ لوگوں کو اقامت دین کی طرف بلائیں تو اس سے عمل کا صحیح رخ بنے گا۔ لیکن اگر آپ اپنی خود ساختہ تشریح سے اقامت دین کو تنفیذ دین کے ہم معنی قرار دینے لگیں تو آپ کا سارا عمل غلط رخ پر پڑ جائے گا۔ حدیث کے مطابق ، اگر آپ محاسبۂ نفس پر زور دیں تو اس سے صحیح دینی مزاج زندہ ہوگا ، لیکن اگر آپ محاسبۂ نفس کے بجائے محاسبۂ کائنات کا نعرہ لگانا شروع کر دیں تو ایسا نعرہ پورے دین میں خلل ڈالنے کا باعث بن جائے گا۔

اسی طرح محبت رسول کے لئے عشق رسول کا لفظ بولنا ، مسجد اقصیٰ کو بتانے کے لئے قبلۂ اول کی زبان استعمال کرنا ، جہاد دین کے ساتھ جہاد حریت کا اضافہ کرنا ، مرنے والوں کے نام کے ساتھ "شہید" کا لفظ شامل کرنا ، اطاعت رسول کے بجائے حرمت رسول پر تقریر کرنا ، اتحاد ملی کے ساتھ غیرت ملّی کی پکار بلند کرنا ، اور اس طرح کی دوسری تمام تبدیلیاں بلاشبہہ بدعت اور اتباع سبل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ وہ آدمی کو بے راہ کرنے والی ہیں ، وہ ہدایت کے راستہ پر لے جانے والی نہیں۔

اسی طرح شہادتِ کلمہ کو تلفظِ کلمہ کے ہم معنی بتانا، اطاعت الٰہی کو حکومت الٰہیہ بناکر پیش کرنا، عبادت میں خشوع پر زور دینے کے بجائے فضائل اور مسائل پر زور دینا، ایمان اور تقویٰ کے پیغام کو ایمان اور یقین کا پیغام بتانا، غیر مسلموں کو دعوت کے بجائے جہاد کا موضوع قرار دینا، مسلمانوں کی داخلی خرابیوں کے نام پر خارجی احتجاج کے ہنگامے برپا کرنا، وغیرہ۔ یہ سب کی سب دین کی شاہراہ سے ہٹ کر متفرق راستوں میں دوڑنے کی صورتیں ہیں۔ ایسی ہر سرگرمی صرف ہلاکت کی طرف لے جاتی ہے، وہ ہدایت اور فلاح کی طرف لے جانے والی نہیں۔

خدا کے دین کو اس کی خالص صورت میں لیا جائے تو وہ آدمی کو خدا تک پہنچاتا ہے۔ اور اگر خدا کے دین میں تبدیلی کرکے اس کو اختیار کیا جائے، تو یہ تبدیلی خواہ بظاہر کتنی ہی چھوٹی کیوں نہ ہو، وہ آدمی کو صحیح راستہ سے بھٹکا کر خدا سے دور کرنے کا سبب بن جائے گی۔

حدیث میں یہ انتباہ دیا گیا ہے کہ پچھلی امتوں میں بعد کے زمانہ میں بگاڑ آیا، اسی طرح امت مسلمہ پر بھی بعد کے زمانہ میں بگاڑ آئے گا۔ تاہم یہ بگاڑ کبھی اس معنی میں نہیں آتا کہ امت کے افراد دین کو بالکل چھوڑ دیں۔ وہ ہمیشہ اُس صورت میں آتا ہے جس کو قرآن میں اتباع صراط کے بجائے اتباع سُبل کا نام دیا گیا ہے۔ یعنی لوگوں کے نزدیک اصول دین کا غیر اہم بن جانا، اور ان کے درمیان فروع دین کا اہمیت اختیار کر لینا۔

امت کے زوال اور بگاڑ کے زمانہ میں ہمیشہ یہ ہوتا ہے کہ فروع دین پر زور بڑھ جاتا ہے اور کلیات دین کو پس پشت ڈال دیا جاتا ہے۔ ایسے وقت میں کرنے کا کام یہ ہے کہ دین کی کلیات کو زندہ کیا جائے۔ سارا زور لوگوں کے اندر اساسی باتیں بیدار کرنے پر دیا جانے لگے۔

دین کی اساس کو زندہ کیا جائے تو اس کی فروع اپنے آپ زندہ ہو جائیں گی۔ لیکن اگر فروع کو زندہ کرنے پر سارا زور دیا جانے لگے تو لوگوں میں کچھ ظاہری چیزیں تو پیدا ہو سکتی ہیں، مگر حقیقی دین کا اس طرح زندہ ہونا ممکن نہیں۔

الامر بالمعروف والنہی عن المنکر

عبدالحکیم انصاری ایم اے سرائمیر (ضلع اعظم گڑھ) کے رہنے والے ہیں۔ انھوں نے اپنے وطن قصبہ سرائمیر کے بارہ میں بتایا کہ ۱۹۴۷ کے انقلاب سے پہلے کی بات ہے۔ وہاں ہمارے محلہ کی مسجد میں لیموں کا ایک درخت تھا۔ وہ خوب پھلتا تھا۔ صبح کو جب ہم لوگ فجر کی نماز کے لیے مسجد میں داخل ہوتے تو ہم دیکھتے کہ درخت کے نیچے کی زمین پکے پکے لیموؤں سے پٹی ہوئی ہے۔

موذن کے ذمہ یہ کام تھا کہ وہ تمام لیموؤں کو چن کر مسجد کی ایک کھلی الماری میں رکھ دیتا۔ محلہ کے جس آدمی کو لیموں کی ضرورت ہوتی وہ ایک پیسہ مسجد کی الماری میں رکھ کر ایک لیموں اپنے لیے لے لیتا۔ یا درخت سے لیموں توڑ کر فی لیموں ایک پیسہ کے حساب سے اس کی قیمت الماری میں ڈال دیتا۔ یہ جمع شدہ پیسہ مسجد کی ضرورتوں میں کام آتا تھا۔

عبدالحکیم صاحب نے بتایا کہ مسجد کا یہ نظام میرے بچپن سے جاری تھا۔ کبھی اس میں فرق نہیں آیا۔ مگر آزادی کے انقلاب کے بعد دنیا بدل گئی۔ لیموں تو اب ختم ہو گیا تھا۔ اس کی جگہ مسجد کے ذمہ داروں نے پپیتہ کا درخت لگا دیا۔ حسن اتفاق سے پپیتہ بھی خوب پھل دینے لگا۔ مگر میں نے دیکھا کہ پپیتہ کا ایک پھل بھی پیڑ پر نہیں بچتا تھا۔ محلہ کے لوگ ایک ایک کر کے سارا پھل توڑ لے جاتے۔ کسی کے دل میں شاید اس کا خیال بھی نہیں آتا تھا کہ یہ مسجد کی چیز ہے اور اس کی قیمت اس کو مسجد میں جمع کرنا چاہیے۔ پپیتہ توڑنے والے ایک لڑکے کو ایک بار دیکھ لیا گیا۔ اس سے کسی نے پوچھا کہ تم مسجد کا پھل کیوں اس طرح توڑتے ہو۔ اس کا جواب یہ تھا: سارے لوگ توڑتے ہیں۔ کیا صرف ہم توڑتے ہیں جو آپ ہم سے سوال کر رہے ہیں (الجمعیۃ ویکلی، دہلی، ۱۱ اکتوبر ۱۹۶۸)

یہ ایک علامتی مثال ہے جو بتاتی ہے کہ پچاس سال پہلے مسلمانوں کی اخلاقی حالت کیا تھی اور اب مسلمانوں کی اخلاقی حالت کیا ہو گئی۔ اس معاملہ کو سمجھنے کے لیے، ۱۹۴۷ کو حد فاصل قرار دیا جا سکتا ہے۔ ۱۹۴۷ سے پہلے کے دور میں ہر جگہ کے مسلمانوں کا اخلاقی حال وہی تھا جو مذکورہ مثال میں نظر آتا ہے، اور ۱۹۴۷ کے بعد ہر جگہ کے مسلمانوں کا اخلاقی حال دوبارہ وہی ہو گیا ہے جو مذکورہ مثال میں بعد کے دور کے لیے بتایا گیا ہے۔

دو دوروں میں اس فرق کا سبب کیا ہے۔ اس کا سبب بالکل سادہ ہے۔ ۱۹۴۷ سے پہلے کے دور میں مسلم آبادیوں میں وہ نظام کم و بیش موجود تھا جو اس معاملہ میں سماجی چیک کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ ہے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا نظام۔ یہ نظام کسی سماج میں گویا سماج کا اخلاقی چیک ہے۔ جہاں یہ نظام قائم ہو، وہاں کے لوگوں میں اجتماعی اخلاقیات موجود رہیں گی۔ اور جہاں یہ نظام ختم ہو جائے وہاں اجتماعی اخلاقیات کا بھی خاتمہ ہو جائے گا۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اسلام کا ایک مستقل اصول ہے۔ یعنی باہمی زندگی میں ایک دوسرے کو معروفات کی تلقین کرنا اور لوگوں کو منکرات سے روکنا۔ اس کا مقصد وہی چیز ہے جس کو ہم نے اخلاقی چیک کہا ہے۔ اس نظام کو ہر حال میں مسلم سماج کے اندر قائم رہنا چاہیے۔ کسی مسلم سماج کا اس سے خالی ہونا پورے سماج کو خدا کے عذاب کا مستحق بنا دیتا ہے۔

یہاں "نظام" سے مراد کوئی رسمی یا قانونی ڈھانچہ نہیں ہے۔ اس سے مراد تقریباً وہی چیز ہے جس کو موجودہ زمانہ میں سماجی روایت کہا جاتا ہے۔ یعنی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا مزاج معاشرہ کے افراد میں مستقل روایت کے طور پر شامل ہو جائے۔ سماج کا اجتماعی ضمیر اس حد تک بیدار ہو کہ وہ ماحول کی اخلاقی برائی کے معاملہ میں غیر جانبدار نہ رہ سکے۔ وہ بے چین ہو کر اس کی اصلاح کے لیے اٹھ کھڑا ہو۔

یہ ایک لازمی فریضہ ہے۔ اس فریضہ کی اہمیت خدا کے دین میں اتنی زیادہ ہے کہ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ بنی اسرائیل نے اس حکم پر عمل نہیں کیا تو وہ اللہ کے نزدیک لعنت کے مستحق ہو گئے (المائدہ ۷۹) امام ابو داؤد نے عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے ایک طویل حدیث روایت کی ہے۔ اس کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر تم لوگوں نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو چھوڑ دیا تو یقیناً اللہ تم پر اسی طرح لعنت کرے گا جس طرح اس نے یہود کے اوپر لعنت کی (و لیلعننکم کما لعنھم) الجامع لاحکام القرآن ۲۵۳/۶

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کیا ہے۔ یہ داخلی اصلاح کا ایک عمل ہے۔ موجودہ زمانہ میں کچھ لوگ اس کو احتساب عالم کے ہم معنی قرار دے کر تقریر و خطابت کی دھوم مچائے ہوئے ہیں۔ یہ ایک لغو بات ہے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے مراد احتساب معاشرہ ہے نہ کہ احتساب عالم۔ مزید یہ کہ اس کا تعلق حکومت سے بھی نہیں۔ یہ ہر مسلم معاشرہ میں اسی طرح جاری رہنے والا عمل ہے جس طرح اذان

اور نماز کا عمل ہر مسلم معاشرہ میں ہمیشہ جاری رہتا ہے۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا مطلب یہ ہے کہ مسلم معاشرہ کے افراد اپنے آس پاس کے مسلمانوں کی حالت سے بے تعلق بن کر نہ رہیں۔ وہ ہمیشہ ایک دوسرے کے محتسب بنے رہیں۔ جب بھی ایک مسلمان دوسرے مسلمان پر کوئی زیادتی کرے۔ جب بھی ایک مسلمان دوسرے مسلمان کی جان، مال، آبرو کو کوئی نقصان پہنچائے تو فوراً دوسرے مسلمان حرکت میں آجائیں۔ وہ ظالم کے مقابلہ میں مظلوم کے حامی بن جائیں اور ہر قیمت پر معروف کو قائم کرنے اور منکر کو مٹانے کی کوشش کریں۔

اس معاملہ میں پہلی کوشش یہ ہونی چاہیے کہ مسلم معاشرہ کے لوگ اپنے افراد کا سختی سے محاسبہ کریں۔ وہ عملی دباؤ کے ذریعہ ظالمانہ حالت کو ختم کریں اور حق دار کو اس کا حق دلوائیں۔ اگر بالفرض اس قسم کی عملی کارروائی کا موقع نہ ہو تو مسلمانوں کے اوپر فرض کے درجہ میں یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی زبان سے غلط کار شخص کی کھلی مذمت کریں۔ وہ تحریر و تقریر کے تمام ممکن ذرائع کو استعمال کر کے اس کے خلاف بے اعتمادی کا اظہار کریں۔

جس مسلم معاشرہ کے افراد اپنی داخلی خرابیوں کے معاملہ میں ایسا نہ کریں وہ بلاشبہہ مجرم ہیں۔ قرآن و حدیث کی صراحتوں کے مطابق، وہ خدا کی رحمت سے محروم کر دیے جائیں گے، خواہ دین کے نام پر بظاہر ان کے یہاں کتنی ہی دھوم مچی ہوئی ہو۔ خدا کو وہ دین مطلوب ہے جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ساتھ ہو نہ کہ وہ دین جو اس کے بغیر ہو۔

ہجرت سے پہلے مدینہ کے جن لوگوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ ان کے اوپر آپ نے انھیں میں سے کچھ نگراں افراد مقرر کیے جن کو نقیب یا کفیل کہا جاتا تھا۔ یہ لوگ مدینہ کے مسلمانوں کی دینی اور اخلاقی نگرانی کا فریضہ انجام دیتے تھے۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب کہ مدینہ میں مسلمانوں کی حیثیت صرف ایک "اقلیت" کی تھی، جب کہ مدینہ میں ابھی "اسلامی حکومت" قائم نہیں ہوئی تھی (البدایہ والنہایہ ۳/۶۲-۱۶۱)

یہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا پہلا نظام تھا جو اسلام کی تاریخ میں باقاعدہ طور پر قائم کیا گیا۔ اس کے بعد مسلمان جہاں بھی آباد ہوئے اور دنیا کے جس حصہ میں بھی انھوں نے اپنی بستیاں بنائیں ہر جگہ یہ نظام بھی ضرور قائم رہا۔ کہیں باقاعدہ صورت میں کسی شخص کو مقرر کیا گیا اور اس کو حق دیا گیا کہ وہ مسلمانوں کے معاملات کی دینی اور اخلاقی نگرانی کرے۔ جہاں اس قسم کا تقرر نہیں کیا گیا وہاں بھی رسمی

کوئی بزرگوں کے وسیلہ کو سب سے زیادہ اہم بنا کر پیش کر رہا ہے۔ کوئی سیاسی اسلام کا جھنڈا اٹھائے ہوئے ہے۔ کوئی فضائلِ اسلام کا چرچا کرنے میں مشغول ہے۔ کوئی مسائل اسلام کا دفتر کھولے ہوئے ہے۔ کسی کا اسلام تاریخی فخر ہے۔ کوئی احتساب کائنات کا نعرہ لگا رہا ہے۔ کوئی ملی تشخص کی حفاظت کے نام پر لوگوں کو جمع کر کے تقریر کر رہا ہے۔ کوئی دوسروں کے ساتھ مناظرہ بازی میں مشغول ہے، وغیرہ۔

مگر تحریکوں اور جماعتوں اور اداروں کے اس طوفان میں کوئی بھی نہیں جو ملت کے اندر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا دینی فریضہ ادا کرے۔ یا لوگوں کے اندر اس کی روح بیدار کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ ہر ایک کی نظر صرف اپنے مفاد پر ہے۔ دوسرے مسلمانوں کے بارہ میں ہر ایک غیر جانب دار بنا ہوا ہے۔

آج ہر مقام پر ایک مسلمان دوسرے مسلمان کی زیادتی کا شکار ہو رہا ہے۔ ہر جگہ ایک مسلمان کی جان اور مال اور آبرو دوسرے مسلمان کے ہاتھوں غیر محفوظ ہے۔ مگر کوئی قابلِ ذکر مسلمان یا کوئی قابلِ ذکر مسلم گروہ مظلوم مسلمان کی مدد پر نہیں آتا۔ حتیٰ کہ لفظی مذمت کے درجہ میں بھی کوئی اس کے لیے کھڑا ہونے والا نہیں۔ ہر ایک اپنے اپنے خود ساختہ اسلام میں مگن ہو کر قرآن کی اس آیت کی تصویر بنا ہوا ہے : انھوں نے اپنے دین کو آپس میں ٹکڑے ٹکڑے کر لیا۔ ہر گروہ کے پاس جو کچھ ہے اسی پر وہ نازاں ہے (المومنون ۵۳)

۱۹۴۷ سے پہلے کے دور میں مسلم معاشروں میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا جو ماحول تھا وہ ماضی کے تسلسل کا نتیجہ تھا۔ وہ دور اول سے ایک اسلامی رواج کے طور پر چلا آ رہا تھا۔ مگر اس طرح کے رواج ہمیشہ مرورِ زمانہ سے کمزور ہوتے رہتے ہیں، یہاں تک کہ آخر کار ختم ہو جاتے ہیں "۱۹۴۷" گویا انحطاط کے اس لمبے عمل کی تکمیل تھی۔ "آزادی" کا انقلاب "پابندی" کی ہر روایت کو بہا لے گیا۔ اس انقلاب کے نتیجہ میں عام ملکی سماج کی بھی تمام بندش والی روایتیں ٹوٹ پھوٹ گئیں۔ اسی طرح مسلم سماج سے بھی مذکورہ اسلامی روایات کا خاتمہ ہو گیا۔

اب ضرورت تھی کہ اس روح کو از سر نو زندہ کیا جائے۔ مسجد اور مدرسے اور جماعتیں اور ادارے سب کے سب زور و شور کے ساتھ اس کے لیے تحریک اٹھائیں۔ جس طرح زلزلہ زدہ بستی کو از سرِ نو بنانے کے لیے ہر طرف تعمیری سرگرمیاں جاگ اٹھتی ہیں، اسی طرح مسلم سماج میں از سرِ نو

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا نظام قائم کرنے کے لیے تمام اہل دین متحرک ہو جاتے۔ یہاں تک کہ دوبارہ گزری ہوئی روایت معاشرہ میں قائم ہو جائے۔ مگر عملاً ایسا نہیں ہوا۔

اس مدت میں مسلم رہنماؤں نے اسلام کے نام پر بہت سی دھواں دھار تحریکیں اٹھائی ہیں۔ مثال کے طور پر خلافت تحریک، جہاد حریت کی تحریک، تقسیم ملک کی تحریک، شاہ بانو (مسلم پرسنل لا) تحریک، بابری مسجد تحریک، وغیرہ۔ مگر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے مقصد کے تحت کبھی کوئی حقیقی تحریک نہیں اٹھائی گئی۔ اگر بروقت اسی نوعیت کی طاقت ور تحریک امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لیے بھی اٹھائی جاتی تو اس کے بعد یقیناً ایسا ہوتا کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی یہ روایت دوبارہ نئی طاقت کے ساتھ مسلم معاشرہ میں قائم ہو جاتی۔ دوبارہ ہمارے معاشرہ میں وہی اخلاقی دور لوٹ آتا جو ۱۹۴۷ سے پہلے "سرائمیر" کے قصبہ میں موجود تھا۔ مگر آج وہ کہیں موجود نہیں۔

تقسیم کے بعد جب ہندو اکثریت نے مسلمانوں کے اوپر "زیادتیاں" کیں تو ان زیادتیوں کے خلاف مسلمانوں میں طوفان خیز ہنگامے جاری ہو گئے۔ تمام مسٹر قائد اور تمام مولوی قائد باہر نکل آئے۔ ہر طرف سرگرمیوں کا سیلاب امنڈ پڑا۔ دوسری طرف ایک مسلمان دوسرے مسلمان پر جو زیادتیاں کر رہا ہے وہ مذکورہ ہندو زیادتیوں سے ہزاروں گنا زیادہ ہے، مگر ان مسلم زیادتیوں کے خلاف آج تک کوئی ایک بھی باقاعدہ تحریک نہیں اٹھی، کسی بھی قابل ذکر مسلمان کی نیند اس کی وجہ سے حرام نہیں ہوئی۔ اس صورت حال کے باقی رہتے ہوئے مسلمانوں کا کوئی مسئلہ حل ہونے والا نہیں۔ ان کا کوئی بھی معاملہ درست ہونے والا نہیں۔

ملّت مسلمہ کے احیاء نو کے لیے ہمارا کوئی بھی منصوبہ صرف اس وقت کامیاب ہو سکتا ہے جب کہ اس کے ساتھ مسلم معاشرہ میں امر بالمعروف، نہی عن المنکر کا نظام قائم کیا جائے اور اس کو موثر انداز میں چلایا جائے۔ ایسا صرف اس وقت ممکن ہے جب کہ مسلم رہنما اور مسلمانوں کا لکھنے اور بولنے والا طبقہ اس دینی شعبہ کو بھی اسی طاقت کے ساتھ رائج کرے جس طاقت کے ساتھ وہ دوسرے مسلم مسائل کے لیے کام کر رہا ہے۔

۱۔ مسلمانوں کے درمیان جب تک معروف کی تلقین کرنے اور منکر سے روکنے کا ماحول قائم نہ ہو مسلمانوں کی آپس کی رنجشیں ختم نہ ہوں گی، اور آپس کی رنجشوں کو ختم کیے بغیر ان کے درمیان حقیقی اتحاد

قائم نہیں ہو سکتا۔ اور جب ملّت کسی منصوبہ کے لیے متحدہ کوشش کرنے کی پوزیشن ہی میں نہ ہو تو اس میں وہ کامیابی کس طرح حاصل کر سکتی ہے۔

بار بار کا تجربہ ہے کہ ملّت کے افراد ایک ملّی کام کے لیے اٹھے مگر افراد ملت کے عدم اتحاد کی وجہ سے اس کام کے لیے موثر جد وجہد نہ کی جا سکی۔ اگر کبھی بظاہر وقتی اتحاد قائم ہوا تو باہمی رنجشوں کی وجہ سے بہت جلد وہ ٹوٹ پھوٹ کر ختم ہو گیا۔ باہمی رنجشیں اتحاد کی قاتل ہیں، اور امر بالمعروف نہی عن المنکر باہمی رنجشوں کا قاتل۔

حقیقت یہ ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا نہایت گہرا تعلق اتحاد کے مسئلہ سے ہے۔ اتحاد کسی قوم کی طاقت ہے۔ اور اتحاد کسی قوم میں صرف اس وقت قائم ہوتا ہے جب کہ اس کے درمیان باہمی اصلاح کا وہ نظام قائم ہو جس کا شرعی نام الامر بالمعروف والنهي عن المنكر ہے۔

ہر انسانی گروہ میں ایسا ہوتا ہے کہ کچھ لوگ اپنے شخصی عزائم کے تحت سرکشی کرتے ہیں۔ وہ اپنے ایک بھائی کے اوپر زیادتی کے مرتکب ہوتے ہیں۔ ایسے موقع پر اگر قوم کے دوسرے افراد فوراً مظلوم بھائی کی مدد کے لیے پہنچیں۔ وہ زیادتی کرنے والے شخص کی مذمت کریں۔ اس کو اس کے ظالمانہ عمل سے روکیں۔ تو ماحول اِس سے بچ جاتا ہے کہ اُس کے اندر باہمی نفرتیں جنم لیں جو اتحاد کی قاتل ہیں۔ اس کے برعکس ماحول میں ایک دوسرے کے ساتھ ہمدردی اور خیر خواہی کی فضا پیدا ہوتی ہے جو گویا قومی اتحاد کی موافق زمین ہے۔

۲۔ ہندستانی مسلمانوں کا سب سے بڑا مسئلہ فرقہ دارانہ فساد ہے۔ یہ فسادات ملت کی ترقی کے ہر منصوبہ کو ناکام بنائے ہوئے ہیں۔ اور ان فسادات کے نہ رکنے کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ مسلمانوں کے اندر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا نظام قائم نہیں۔

یہ فسادات کیوں ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ تقریباً ہمیشہ یہ ہوتی ہے کہ اکثریتی فرقہ کے کچھ لوگ ایک مظاہرہ کرتے ہیں۔ مثلاً وہ جلوس نکالتے ہیں اور اس میں نامناسب نعرے لگاتے ہیں۔ اس قسم کے جلوس اور نعروں کا واحد حل اعراض ہے۔ جہاں بھی اعراض کیا گیا وہاں کبھی کوئی فساد نہیں ہوا۔ پورے ملک میں ایسی کوئی ایک مثال موجود نہیں کہ مسلمانوں نے فی الواقع اعراض کیا ہو، اس کے باوجود فساد ہو جائے۔

مگر عملاً یہ ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے کچھ جاہل اور نادان لوگ غیر ضروری طور پر جلوس والوں سے الجھ جاتے ہیں۔ اس کے بعد دونوں طرف حمیت جاہلیہ کا ماحول قائم ہو جاتا ہے جو بالآخر تباہ کن فساد تک جا پہنچتا ہے۔ اس مہلک صورت حال کو ختم کرنے کی واحد کارگر تدبیر یہ ہے کہ مسلمان اپنی قوم کے ان غلط کاروں کا ہاتھ پکڑیں۔ مگر تقسیم کے بعد چھوٹے بڑے پچاس ہزار فسادات ہو چکے ہیں، اور ایک بار بھی مسلم ذمہ داروں نے ایسا نہیں کیا کہ وہ اپنے ان ناعاقبت اندیش نوجوانوں پر نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دیں۔

۲۴ اکتوبر ۱۹۸۹ کو بھاگل پور میں ہندؤوں کا جلوس نکلا۔ جلوس مسلم محلہ سے گزرنے والی سڑک پر پہنچا تو مسلم نوجوانوں نے اس کو روک دیا۔ کلکٹر گھنٹوں مقامی مسلم رہنماؤں کے پاس دوڑتا رہا کہ آپ اپنے نوجوانوں سے کہئے کہ وہ جلوس کو نہ روکیں۔ وہ جلوس کو سڑک سے گزرنے دیں۔ ہم اس کے ذمہ دار ہیں کہ یہاں کسی بھی قسم کا کوئی تشدد نہیں ہونے پائے گا۔ مگر مقامی مسلم رہنماؤں نے اپنے نوجوانوں کو نہیں روکا، یہاں تک کہ انھوں نے یہ آخری نادانی کی کہ جلوس کے اوپر بم مارے۔ اس کے بعد وہی کچھ ہونا تھا جو بعد کو پیش آیا۔

یہی کسی ایک یا دوسری صورت میں تمام فرقہ وارانہ فسادات کی کہانی ہے۔ ان فسادات کی سزا اگرچہ مسلم عوام کو بھگتنی پڑتی ہے۔ مگر مسلم عوام یا خواص براہ راست طور پر ان میں ملوث نہیں ہوتے۔ ان فسادات کو بھڑکانے کے اصل ذمہ دار وہ پُرجوش مسلم نوجوان ہیں جو ناعاقبت اندیشانہ طور پر ان میں کود پڑتے ہیں اور عدم اعراض کا طریقہ اختیار کر کے آگ کو بھڑکانے کا باعث بنتے ہیں۔

یہاں مسلمانوں کی شرعی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے ان نوجوانوں کا ہاتھ پکڑیں۔ وہ متفقہ طور پر ان کی مذمت کریں تاکہ ان کی حوصلہ شکنی ہو۔ مگر ۱۹۴۷ سے لے کر آج تک ایک بار بھی ایسا نہیں ہوا۔ ان فرقہ وارانہ فسادات پر حدیث رسول کے یہ الفاظ مکمل طور پر صادق آتے ہیں :

إنّ الناس إذا رأوا الظّالم فلم يأخذوا على يديه أوشكَ أن يَعُمَّهم الله بعقاب	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : لوگ جب ظالم کو (ظلم کرتے ہوئے) دیکھیں، پھر وہ اس کا ہاتھ نہ پکڑیں تو قریب ہے کہ اللہ ان کو

عمومی عذاب میں بتلا کر دے۔ (جامع الاصول فی احادیث الرسول، صفحہ ۳۱ - ۲۳۰)

مسلم آبادیوں میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ماحول نہ ہونے ہی کی وجہ سے بار بار فساد کی صورت پیش آرہی ہے۔ جب تک یہ فسادات باقی ہیں، ملّی تعمیر کا کوئی گہرا کام نہیں کیا جاسکتا۔ ملی تعمیر کے منصوبہ پر عمل کرنے کے لیے پُرامن حالات کی ضرورت ہے اور فسادات مسلسل طور پر پُرامن فضا کو درہم و برہم کیے ہوئے ہیں۔

قرآن میں اعلان کیا گیا ہے کہ اگر تم ہدایت پر قائم رہو تو کوئی نقصان پہنچانے والا تم کو نقصان نہیں پہنچا سکتا (المائدہ ۱۰۵) اگر تم خوفِ خدا پر رہو گے تو تمہارے لیے کسی اور خوف کا خطرہ نہیں (المائدہ ۳) یہاں ہدایت سے مراد یہی ہے کہ مسلمان اپنی زندگی کو حکم خداوندی کے مطابق منظم کریں۔

۳۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا نظام قائم نہ رہنے ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ آج دعوت الی اللہ کا کام تقریباً معطل ہو کر رہ گیا ہے۔ دعوت الی اللہ مسلمانوں کی لازمی ذمہ داری ہے۔ مگر دعوت کا کام جاری ہونے کی پہلی اہم ترین شرط یہ ہے کہ مسلمانوں اور غیر مسلموں (داعی اور مدعو) کے درمیان کشیدگی اور نفرت کی فضا نہ پائی جارہی ہو۔

مگر مسلمانوں کے کچھ جاہل عناصر غیر مسلموں سے کسی ایک یا دوسری بات پر نزاع قائم کرتے رہتے ہیں۔ اس کے نتیجہ میں مسلمانوں اور ان کے مدعو غیر مسلموں کے درمیان مستقل طور پر نفرت اور تلخی کی فضا قائم رہتی ہے۔ اس طرح کی فضا کے باقی رہتے ہوئے دعوتی کام کبھی انجام نہیں پاسکتا۔

مسلمانوں پر فرض کے درجہ میں ضروری ہے کہ وہ اپنے گروہ کے ان نادان لوگوں کا ہاتھ پکڑیں جو اپنی غلط روش سے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان دعوت کی فضا کو بگاڑ رہے ہیں۔ اگر مسلمانوں نے اپنے ان افراد کو نہیں روکا تو یقینی ہے کہ اس کے بعد پوری قوم عتاب خداوندی کی زد میں آجائے گی۔ اس فریضہ کو ترک کرنے کے بعد کوئی بھی دوسرا عمل اس کو خدا کی پکڑ سے بچانے والا نہیں۔

دورجدید کی تحریکیں

موجودہ زمانہ میں مختلف مسلم ملکوں میں بہت سی بڑی بڑی تحریکیں اٹھیں جو اپنے دعوے کے مطابق تجدید کی تحریکیں تھیں۔ مزید یہ کہ ان تحریکوں کو بہت بڑی مقدار میں ساتھ دینے والے افراد بھی ملے اور مادی وسائل بھی، حتی کہ اس سے بھی زیادہ جتنا قدیم زمانہ میں پیغمبروں کو ملے تھے۔ اس کے باوجود یہ تحریکیں عملی طور پر سراسر بے نتیجہ رہیں۔ وہ اُس منزل پر پہونچنے میں ناکام رہیں جس کو انھوں نے اپنا نشانہ بنایا تھا۔

ان تحریکوں کے معتقدین نے بطور خود اگرچہ بہت بڑے بڑے الفاظ بولے ہیں جو وہ اپنی تحریک یا اپنی شخصیتوں کے بارہ میں بول سکیں۔ مگر یہ محض الفاظ ہیں، اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔ مثلاً سید ابوالاعلیٰ مودودی کے معتقدین موجودہ عہد کو "سید مودودی کا عہد" کہتے ہیں۔ مگر اس کی حقیقت لفظی بازیگری سے زیادہ اور کچھ نہیں۔ میں نے ان حضرات سے کئی بار پوچھا کہ جس چیز کو آپ سید موددودی کا عہد کہتے ہیں وہ کہاں ہے تاکہ میں بھی وہاں جاکر اسے دیکھوں۔ کیا وہ سید ابوالاعلیٰ مودودی کے اپنے مکان میں ہے۔ کیا وہ اس شہر میں یا اس ملک میں ہے جہاں وہ رہتے تھے۔ کیا وہ اس جماعت میں ہے جس کو انھوں نے قائم کیا اور چلایا۔ اس کا جواب ان حضرات کے پاس کچھ نہیں۔ اس کے باوجود وہ اپنے اس محبوب تخیل (سید مودودی کا عہد) کو بدستور لکھے اور چھاپے چلے جارہے ہیں ——— یہ مردہ قوم کی مخصوص علامت ہے کہ جس چیز کو وہ حقیقت میں نہ پائے اس کو وہ الفاظ میں پاکر کامیابی کا جشن مناتی ہے۔

موجودہ زمانہ کی تجدیدی تحریکوں کی ناکامی کی وجہ کیا تھی، اس کی سادہ سی وجہ یہ تھی کہ یہ تحریکیں تجدیدی تحریکیں تھیں ہی نہیں۔ تجدید دین، ابدیت کی بنیاد پر اٹھنے کا نام ہے، جب کہ ان مسلم مفکرین کے پاس آخری سرمایہ صرف یہ تھا کہ وہ وقتی مسائل سے متاثر ہوکر اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ یہ تحریکیں دراصل ردعمل کی تحریکیں تھیں جن کو خوش خیال مفکرین نے بطور خود تجدیدی تحریک کا نام دے دیا۔

یہاں ہم اس سلسلہ میں صرف ایک مثال دیں گے۔ اسی مثال پر دوسرے مسلم مفکرین کو

قیاس کیا جاسکتا ہے۔ یہ مثال مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی ہے ۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے اپنے حالات بیان کرتے ہوئے لکھا ہے :

"مارچ ۱۹۳۷ میں جب میں دہلی گیا اور میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ سیاسی حالات کے تغیّر سے مسلمانوں پر کیا اثرات مرتب ہو رہے ہیں تو میں نے یہ فیصلہ کیا کہ جس قدر بھی طاقت خدا نے مجھے دی ہے اس کو اسی انقلاب کے مقابلہ میں صرف کروں۔ چنانچہ میں نے دہلی سے حیدرآباد پہونچتے ہی اس نئی مہم کی ابتدا ترجمان القرآن کے مضامین (مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش) سے کردی۔ آج کل میرے خیالات میں ایک ہلچل برپا ہے جس نے مجھے پرسکون تفکر کے قابل نہیں رکھا۔ دہلی سے ایک آگ اپنے سینہ میں لایا ہوں اور ہر لمحہ یہ فکر دامن گیر ہے کہ اب کیا کروں۔ جو طوفان ہمارے سر پر آگیا ہے کیا وہ ہمیں اتنی فرصت دینے کے لیے تیار ہے کہ ہم اس طرح اطمینان سے بیٹھے ہوئے اپنی ٹوٹی ہوئی کشتی کو ازسرِ نو تیار کریں۔ ایک طرف ایک منظم طاقت ہے جو نیشنلزم اور ڈیماکریسی کے مجموعہ کو پراونشل اٹانومی کے زبردست وسائل سے ہندستانِ جدید کی تعمیر اس نقشہ پر شروع کر چکی ہے جس میں مسلمان قوم کے لیے بحیثیت مسلمان ہونے کے کوئی جگہ نہیں۔ دوسری طرف مسلمان ایک ریوڑ کی طرح ہندستان کے طول وعرض میں بھٹک رہے ہیں" (ملخصاً) حکمت قرآن (لاہور) ستمبر اکتوبر ۱۹۸۴

یہ اور اس طرح کے دوسرے واقعات واضح طور پر یہ ثابت کرتے ہیں کہ سید ابوالاعلیٰ مودودی حقیقتہً "واقعات انسانی" سے متاثر ہو کر اٹھے نہ کہ "واقعاتِ خداوندی" سے متاثر ہو کر۔ اور اسی کا نام ردعمل کی نفسیات کے تحت اٹھنا ہے۔ یہی معاملہ موجودہ زمانہ میں تمام مسلم رہنماؤں کے ساتھ پیش آیا ہے۔

موجودہ زمانہ میں جو مسلم تحریکیں اٹھیں ان کی دو قسمیں کی جاسکتی ہیں۔ ان کی پہلی قسم وہ ہے جو انیسویں صدی کے نصف ثانی میں ظاہر ہوئی۔ اور دوسری قسم وہ ہے جو بیسویں صدی کے نصف اول میں پیدا ہوئی اور پھیلی۔

موجودہ زمانہ میں مغربی قومیں جدید قوتوں سے مسلح ہو کر ابھریں اور انھوں نے پوری دنیا کو براہِ راست یا بالواسطہ طور پر مغلوب کرلیا۔ اس کی زد سب سے زیادہ مسلمانوں پر

پڑی۔ کیوں کہ مسلمان ہی اس وقت سب سے بڑی عالمی قوت کی حیثیت رکھتے تھے۔ اس عمل کی انتہا انیسویں صدی میں ہوئی۔ اس صورت حال نے مسلمانوں کو متاثر کیا۔ ہر مسلم ملک میں ایسے لوگ ابھرے جو ماضی کی عظمت کو دوبارہ واپس لانے کا پیغام دیتے تھے۔

سید جمال الدین افغانی (۱۸۹۷-۱۸۳۸) اور محمد علی جوہر (۱۹۳۱-۱۸۷۸) کو اس دور کا نمائندہ کہا جا سکتا ہے۔ ان لوگوں کی زندگی کے حالات پڑھیے تو واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ وہ چیز جس نے انھیں ابھارا اور عمل کے میدان میں کھڑا کیا وہ مغربی قوموں کا اسلامی ممالک پر غلبہ تھا۔ ان قوموں نے نہ صرف مسلم ملکوں کو سیاسی طور پر مغلوب کیا تھا بلکہ اسلامی آثار اور اسلامی امتیازات کو مٹانے کی ایک مسلسل مہم جاری کر دی تھی، اس صورتِ حال نے سید جمال الدین افغانی اور محمد علی جوہر جیسے لوگوں کو تڑپایا اور وہ مغربی قوموں سے لڑنے کے لیے کھڑے ہو گیے۔ باعتبار محرک وہ جوابی ذہن کے تحت ابھرے تھے نہ کہ مثبت ذہن کے تحت۔

دوسرے مرحلہ کی تحریکیں وہ ہیں جن کی نمائندگی سید ابوالاعلیٰ مودودی (۱۹۷۹-۱۹۰۳) اور سید قطب شہید (۱۹۶۶-۱۹۰۶) جیسے لوگوں نے کی۔ اس دوسرے مرحلہ کے افراد کے حالاتِ زندگی کو پڑھیے تو دوبارہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ بھی اسی سیاسی اور تہذیبی المیہ سے متاثر ہو کر ابھرے جس سے متاثر ہو کر پہلے مرحلہ کے لوگ ابھرے تھے۔ دونوں ہی یقینی طور پر ردعمل کی پیداوار تھے۔ فرق صرف یہ ہے کہ پہلے مرحلہ کے افراد نے اپنے ردعمل کو سادہ طور پر صرف ردعمل کے انداز میں پیش کیا اور دوسرے مرحلہ کے افراد نے اپنے ردعمل کے ساتھ وہ معاملہ کیا جس کو انگریزی میں "فیلوسوفائز" کرنا کہتے ہیں۔ یعنی انھوں نے اپنے ردعمل کو فکر اور فلسفہ بنا کر پیش کیا۔ انھوں نے اس کو ایک مستقل تعبیر کی حیثیت دے دی۔ پہلے مرحلہ کے لوگوں کا عمل اگر سیاسی دفاع تھا تو دوسرے مرحلہ کے افراد کا عمل سیاسی تعبیر۔

ردعمل کی نفسیات کے تحت اٹھنے والے آدمی کی بنیادی کمزوری یہ ہے کہ وہ ہمیشہ پیشِ نظر مسئلہ کو دیکھتا ہے نہ کہ اصل حقیقتِ واقعہ کو۔ اس کی نظر وقتی صورت حال پر ہوتی ہے نہ کہ ابدی صورت حال پر۔ یہی موجودہ زمانہ کے مسلم رہنماؤں کے ساتھ پیش آیا۔ ان کی ردعمل کی نفسیات نے ان سے مثبت طرز فکر کو چھین لیا۔ ان کی پوری سوچ منفی سوچ بن گئی۔ جس کا نتیجہ یہ

ہوا کہ ان کی تفکیر بھی صراط مستقیم سے ہٹ گئی اور ان کی عملی منصوبہ بندی بھی ۔ یہاں ہم اس معاملہ کے چند پہلوؤں کا ذکر کریں گے ۔

۱۔ ایک حدیث ہے جس کے الفاظ یہ ہیں :

الا ان فی الجسد مضغۃ اذا صلحت صلح الجسد کلہ و اذا فسدت فسد الجسد کلہ الا وھی القلب ۔ (متفق علیہ)	آگاہ، جسم کے اندر گوشت کا ایک ٹکڑا ہے ۔ وہ درست ہو تو پورا جسم درست رہتا ہے ۔ وہ بگڑ جائے تو پورا جسم بگڑ جاتا ہے ۔ آگاہ، اور وہ قلب ہے ۔

یہ حدیث بتاتی ہے کہ اصلاحی عمل کا مقام آغاز کیا ہے ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مقامِ آغاز انسان کا دل ہے ۔ قلب (یا ذہن) کی اصلاح سے اعمال کی اصلاح ہوتی ہے ۔ جب بھی لوگوں کے اندر عمل کی کمی نظر آئے تو اس قول رسول کے مطابق ہمیں پیشگی طور پر یہ یقین کرنا چاہیے کہ اس کا سبب انسان کے قلب میں ہوگا ۔ عمل کا بگاڑ قلب کے بگاڑ کا نتیجہ ہے اور عمل کی اصلاح قلب کی اصلاح کا نتیجہ ۔

یہ نکتہ مخصوص نفسیات کی بنا پر ہمارے رہنماؤں سے اوجھل ہوگیا ۔ وہ اس راز کو سمجھنے میں ناکام رہے جو قرآن و حدیث میں اور رسول اللہ کی سیرت میں واضح طور پر موجود تھا ۔ چنانچہ موجودہ زمانہ کے مسلم رہنماؤں نے اپنے تجدیدی کام کا آغاز تجدید نظام سے کیا ۔ حالاں کہ تجدیدی کام کا صحیح آغاز یہ تھا کہ اس کو تجدید روح سے شروع کیا جاتا ۔

دور زوال میں ہمیشہ قوموں سے جو چیز غائب ہوتی ہے وہ اسلامی روح ہے ۔ اس لیے اسلامی روح کو از سرِ نو زندہ کرنا ہی تجدید دین کا پہلا کام ہے ۔ مگر موجودہ زمانہ کے مسلم رہنماؤں کے ذہن پر چوں کہ سیاسی نظام کے ٹوٹنے کا غم سمایا ہوا تھا اس لیے اپنی نفسیات کے تقاضے کے تحت انھوں نے یہ سمجھا کہ اس وقت کرنے کا اصل کام یہ ہے کہ اسلام کے سیاسی نظام کو دوبارہ بحال کیا جائے ۔ چنانچہ انھوں نے اپنی ساری کوششیں تجدید نظام کے محاذ پر وقف کر دیں ۔ مگر یہ ایسا ہی تھا جیسے ایک ٹوٹے ہوئے گھر کو دوبارہ بنانے کے لیے یہ کیا جائے کہ اس کو بنیادوں اور دیواروں کے بغیر چھت کی طرف سے کھڑا کرنے کی کوشش کی جائے ۔ ظاہر ہے کہ

ایسی چھت کبھی کھڑی نہیں ہوتی اور نہ ایسا مکان کبھی وجود میں آتا۔ چنانچہ بے پناہ قربانیوں کے باوجود ان رہنماؤں کا تجدید نظام کا منصوبہ بھی کامیاب نہ ہو سکا۔

یہ مسلم رہنما اپنے رد عمل کی نفسیات کی بنا پر یہ سمجھنے سے قاصر رہے کہ "نظام اسلام" ہمیشہ روح اسلام کی بنیاد پر قائم ہوتا ہے۔ موجودہ زمانہ میں نظامِ اسلام کی بربادی اسی لیے ہوئی کہ مسلمانوں میں روحِ اسلام کمزور ہو گئی تھی۔ یہ رہنما اگر رد عمل کی نفسیات کا شکار نہ ہوتے تو ان کے لیے اس حقیقت کو سمجھنا کچھ بھی مشکل نہ تھا۔ اور اگر وہ اس حقیقت کو سمجھ لیتے تو وہ اپنے کام کا آغاز تجدید روح سے کرتے نہ کہ تجدید نظام سے، جس کا موجودہ اسباب کی دنیا میں کوئی نتیجہ نکلنے والا نہیں تھا اور نہ اس کا کوئی نتیجہ نکلا۔

۲۔ قرآن میں مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے کہ اگر تم پھر جاؤ تو اللہ تمہاری جگہ دوسری قوم کو لائے گا جو تمہارے جیسے نہ ہوں گے۔ (فان تتولوا یستبدل قوماً غیرکم ثم لایکونوا امثالکم) اس آیت میں اس بات کا اشارہ ہے کہ مسلمانوں پر جب زوال طاری ہو تو ان کو دوبارہ زندہ اور فعال بنانے کی ایک ضروری تدبیر یہ ہے کہ ان کے اندر نئی قومیں داخل کی جائیں۔ گویا ان کے لیے وہ چیز فراہم کی جائے جس کو آج کل کی زبان میں نیا خون (New blood) کہا جاتا ہے۔

یہ قدرت کا ایک عالم گیر قانون ہے کہ ہر چیز پر تنزل طاری ہوتا ہے۔ ہر چیز ایک مدت گزرنے کے بعد اپنی ابتدائی قوت کھو دیتی ہے۔ یہی معاملہ قوموں کا ہے۔ قوموں پر بھی آخر کار زوال آتا ہے۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کا معاملہ بھی یہی تھا۔ موجودہ زمانہ کے مسلمان حقیقتہً ایک زوال یافتہ قوم تھے۔ وہ اس قابل نہیں رہے تھے کہ تنہا اپنی قوت سے اسلام کے حامل بن سکیں۔ ایسی حالت میں کرنے کا کام یہ تھا کہ مسلمانوں کی داخلی اصلاح کرتے ہوئے یکساں قوت کے ساتھ غیر مسلم اقوام میں اسلام کی دعوت پہونچائی جائے تاکہ ان کے اندر سے اسلام کی حمایت کے لیے نیا خون مل سکے۔

مگر یہاں دوبارہ مسلم رہنماؤں کی رد عمل کی نفسیات حائل ہو گئیں۔ وہ غیر مسلم اقوام کو ظالم قرار دے کر ان کے خلاف شدید نفرت میں مبتلا تھے۔ دعوتی عمل کی لازمی شرط مدعو کے حق میں محبت ہے مگر مسلمانوں کی رد عمل کی نفسیات نے ان کے لیے مدعو کو نفرت اور حقارت کا

موضوع بنا دیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی ساری دل چسپیاں صرف مسلمانوں کی اصلاح کے دائرہ میں محدود ہو کر رہ گئیں۔ موجودہ زمانہ کے مسلمان اپنے دور زوال کو پہونچ کر بالکل بے جان ہو چکے تھے مگر مسلم رہنماؤں کی خوش فہمی نے انھیں برعکس طور پر یہ دکھایا کہ :

نہیں ہے ناامید اقبال اپنی کشتِ ویراں سے ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

مسلمانوں کے بارہ میں اس اندازہ کی غلطی اس واقعہ سے ثابت ہو چکی ہے کہ پچھلے سو برس کے اندر بے شمار اعاظم واکابر (بشمول اقبال) اس "مٹی" کو نم کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ انھوں نے اس کو صرف "ذرا سا نم" نہیں کیا بلکہ اس کو جل تھل کر دیا۔ مگر مسلمانوں کے اندر سے وہ جاندار گروہ نہ ابھر سکا جو جدید تاریخ میں اسلام کو اس کا واقعی مقام دلانے والا بن سکے۔ حتیٰ کہ خود اقبال کو آخر میں یہ کہنا پڑا :

تیرے محیط میں کہیں گوہرِ زندگی نہیں ڈھونڈ چکا میں موج موج دیکھ چکا صدف صدف

دورِ جدید کے مسلم رہنما اگر ردعمل کی نفسیات میں مبتلا نہ ہوتے تو یقیناً وہ اس راز کو سمجھ لیتے کہ موجودہ زمانہ میں تجدید دین اور احیاء اسلام کا سب سے بڑا کام یہ ہے کہ اسلام کی دعوت کو غیر مسلم اقوام تک پہونچایا جائے تاکہ ان کی صفوں سے ایسے افراد حاصل ہوں جو نومسلمانہ جوش کے ساتھ اسلام کی نمائندگی کر سکیں۔ مگر غیر مسلم اقوام میں دعوتی کام کرنے کے لیے ان کے حق میں محبت اور خیر خواہی کا جذبہ درکار تھا اور ہمارے رہنما ردعمل کی نفسیات کے نتیجہ میں پہلے ہی اس کو کھو چکے تھے۔ پھر وہ غیر مسلم اقوام کے درمیان خدا کے دین رحمت کے داعی بن کر اٹھتے تو کیسے اٹھتے۔

۳۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جتنے پیغمبر بھیجے، سب ان کی قوموں کی زبان میں بھیجے (وَمَا اَرْسَلْنَا مِن رَّسُولٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِہٖ) اس آیت سے یہ اصول اخذ ہوتا ہے کہ دعوتی کام کی لازمی شرط یہ ہے کہ وہ مدعو کی اپنی زبان اور اس کے قابل فہم اسلوب میں ہو۔

اس اعتبار سے غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں جس طرح دوسری چیزوں میں انقلاب آیا ہے اسی طرح زبان وادب میں بھی زبردست انقلاب آیا ہے۔ سائنس کے زیر اثر موجودہ زمانہ میں بالکل ایک نیا انداز بیان وجود میں آیا ہے۔ آج کا انسان اسی بات

کو اہمیت دیتا ہے جو جدید سائنسی اسلوب میں ڈھال کر اس کے سامنے پیش کی جائے۔ اور جو چیز سائنسی اسلوب میں ڈھلی ہوئی نہ ہو وہ جدید انسان کو اپیل نہیں کرتی، وہ اس کے دل ودماغ میں اپنی جگہ نہیں بناتی۔

اس صورتِ حال کا تقاضا تھا کہ موجودہ زمانہ میں جدید اسلامی لٹریچر تیار کیا جائے۔ جو وقت کے علمی اور ادبی اسلوب کے مطابق ہو۔ اس کی اہمیت غیر مسلم قوموں کے لیے بھی تھی اور خود مسلمانوں کے اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ کے لیے بھی۔ مگر یہاں دوبارہ مسلمانوں کی ردعمل کی نفسیات رکاوٹ بن گئی۔ جدید علمی انداز یا نیا ادبی اسلوب پیدا کرنے والی قومیں عین وہی تھیں جن سے ہمارے مسلم رہنما نفرت میں مبتلا تھے۔ اور جن کو وہ حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے ان کی اس نفسیات کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ توجہ اور دل جمعی کے ساتھ جدید اسلوب کو سمجھنے کی کوشش نہ کر سکے۔ نتیجۃً وہ جدید اسلوب میں اسلامی لٹریچر پیش کرنے میں بھی ناکام رہے۔

دورِ جدید میں اسلام کے احیار اور تجدید کے کام کی یہ ایک بنیادی ضرورت تھی۔ مگر کتابوں کے ان گنت انبار کے باوجود یہ ضرورت ابھی تک غیر تکمیل شدہ حالت میں پڑی ہوئی ہے۔ حتی کہ لوگوں کے اندر اس کا شعور تک موجود نہیں۔ میری ملاقات ایک مشہور حلقہ کے ایک صاحب سے ہوئی۔ میں نے کہا کہ مسلمان ابھی تک یہ نہ کر سکے کہ وہ وقت کے فکری مستویٰ پر اسلامی لٹریچر تیار کریں۔ انھوں نے اس سے اختلاف کیا اور کہا کہ فلاں عظیم شخصیت نے یہ کام انجام دیدیا ہے۔ ان کی کتابیں وقت کے فکری مستویٰ پر اسلامی تعلیمات کو پیش کر رہی ہیں۔ میں نے کہا کہ آپ مذکورہ شخصیت سے قریبی تعلق رکھتے ہیں۔ آپ ان سے چند سطریں صرف یہ لکھوا کر بھیج دیجئے کہ "وقت کا فکری مستویٰ" کیا ہے اور اس سے کیا مراد ہے۔ مگر آج تک ان کی طرف سے اس کا کوئی جواب نہیں آیا۔

میں اردو، عربی، فارسی اور انگریزی میں اپنے چالیس سالہ مطالعہ کی بنا پر یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس پورے دور میں مسلمانوں کا دینی طبقہ کوئی ایک بھی ایسی قابل ذکر کتاب وجود میں نہ لاسکا جو جدید سائنٹفک اسلوب اور وقت کے فکری مستویٰ پر اسلامی تعلیمات کو پیش کرنے والی ہو۔ شخصیتوں سے عقیدت رکھنے والے کسی خوش فہم دماغ میں ایسی کتابوں کا وجود ہو سکتا

ہے، مگر حقیقی دنیا میں ایسے لٹریچر کا وجود نہیں۔ اور اگر بالفرض کسی صاحب کو اصرار ہو کہ ایسی کتابیں موجود ہیں تو میں ان سے گزارش کروں گا کہ وہ ایسی صرف ایک کتاب راقم الحروف کے پتہ پر روانہ فرمائیں۔ اس کے بعد انشاء اللہ میں بتاؤں گا کہ اس کی حقیقت جدید اسلوب اور سائنٹفک طرز تحریر کے اعتبار سے کیا ہے، بشرطیکہ یہ کتاب کسی ذمہ دار شخص کی طرف سے ان کی اپنی تحریر کے ساتھ بھیجی گئی ہو۔

۱۹۸۰ میں میری ملاقات امریکہ کے ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ شخص مسٹر اسٹیو اسکلر (Steve Sklar) سے ہوئی۔ وہ فلوریڈا کے ایک عیسائی خاندان میں ۱۹۴۷ میں پیدا ہوئے ان کو تقابلی مطالعہ کا شوق ہوا، اور انہوں نے تمام بڑے بڑے مذاہب سے متعلق کتابیں پڑھ ڈالیں۔ گفتگو کے دوران انھوں نے کہا کہ میں نے ان مسلم مصنفوں کی کتابوں کے انگریزی ترجمے پڑھے ہیں جو موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے درمیان بڑے مفکر سمجھے جاتے ہیں۔ مگر یہ کتابیں میرے نزدیک بالکل کوڑا (Rubbish) ہیں۔ مغربی ملکوں میں ان کے ذریعہ سے اسلام کے تعارف کا کام نہیں کیا جا سکتا۔

انھوں نے کہا کہ یہ انگریزی ترجمے زبان کے اعتبار سے ناقص ہیں۔ ان کی زبان جاندار زبان نہیں۔ تاہم اس سے قطع نظر مضمون کے اعتبار سے بھی ان کتابوں میں ایسی کمیاں ہیں کہ وہ مغربی انسان پر کوئی گہرا اثر نہیں چھوڑ سکتیں۔ اس سلسلہ میں انھوں نے چند باتیں بتائیں

انھوں نے کہا کہ ان کتابوں کے پڑھنے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کا لکھنے والا مغرب کے خلاف شدید نفرت میں مبتلا ہے۔ وہ مغرب اور مغربی تہذیب کو حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ ان کے اس مزاج کی وجہ سے ان کی کتابیں غیر سائنٹفک ہو کر رہ گئی ہیں۔ ہندو مفکرین کی کتابوں میں اپنے مخاطب کے لیے محبت کا جذبہ ملتا ہے مگر موجودہ زمانہ کے مسلم مفکرین کی کتابوں میں کم از کم مغربی مخاطب کے لیے نفرت اور حقارت کے سوا اور کچھ نہیں۔

چنانچہ ان کتابوں کی ایک کمی یہ ہے کہ ان میں غلط قسم کی تعمیم (Generalisation) پائی جاتی ہے۔ یہ لوگ مغربی سوسائٹی سے کوئی منفرد اور استثنائی واقعہ لیں گے اور اس کو اس طرح بیان کریں گے گویا کہ یہی مغربی سوسائٹی کی عام حالت ہے۔ مثلاً ایک مسلم مصنف نے اپنی کتاب

میں یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ ایک شخص ایک مغربی خاتون کے گھر پر اس سے ملنے کے لیے گیا۔ اس نے گھنٹی بجائی، اس وقت مغربی خاتون غسل خانہ میں نہا رہی تھی۔ وہ گھنٹی کی آواز سن کر بالکل ننگی باہر نکل آئی۔ اس قسم کا واقعہ کوئی استثنائی واقعہ ہو سکتا ہے مگر یہی مغربی سوسائٹی کی عام حالت نہیں۔ ان مصنفین کا حال یہ ہے کہ وہ مغربی سوسائٹی کا کوئی برا واقعہ لیں گے اور اس کو مغربی سوسائٹی کی عام حالت بتائیں گے۔ دوسری طرف یہی لوگ اسلام کے بارہ میں یہ کرتے ہیں کہ وہ اس کا ایک نہایت اچھا واقعہ منتخب کرتے ہیں اور اس کو اسلامی سوسائٹی کی عام حالت بتاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کا تقابل علمی اعتبار سے صحیح نہیں۔

اسی طرح ان کتابوں میں ایک عام کمی یہ پائی جاتی ہے کہ اس میں آئیڈیل کا تقابل پریکٹس سے کیا جاتا ہے۔ مثلاً اسلام کے تصور مساوات کو بتانے کے لیے وہ خطبہ حجۃ الوداع کے الفاظ نقل کریں گے اور مغرب کے تصور مساوات کو بتانے کے لیے ساؤتھ افریقہ کی مثال دیں گے۔ حالاں کہ یہ تقابل سراسر غلط ہے۔ ان کو چاہیے کہ آئیڈیل کا تقابل آئیڈیل سے اور پریکٹس کا تقابل پریکٹس سے کریں۔ مثلاً پیغمبر کے حجۃ الوداع کی تقریر کا تقابل انھیں اقوام متحدہ کے حقوق انسانی کے چارٹر سے کرنا چاہیے نہ کہ کسی ملک کی عملی صورت حال سے۔ وغیرہ وغیرہ۔

مسٹر اسٹیو اسکلر کی مذکورہ نشاندہی بالکل درست ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ جدید قومیں ہمارے مسلم رہنماؤں کے لیے نفرت اور حقارت کا موضوع بن گئیں۔ یہ ذہن اتنا عام ہوا کہ مسلمانوں کی غیر سیاسی شخصیتیں بھی اس نفسیات سے محفوظ نہیں رہیں۔ اس کی ایک عبرت ناک مثال وہ ہے جس کو مولانا سعید احمد اکبر آبادی (۱۹۸۵-۱۹۰۸) نے نقل کیا ہے۔

مولانا ابو البرکات عبد الرؤف داناپوری نے سیرت نبوی پر اپنی کتاب "اصح السیر" کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ چوں کہ طبقات ابن سعد کو ایک عیسائی نے ایڈٹ کیا اور چھاپا ہے اور اس نے ضرور کتاب کے اصل مخطوطہ میں ردوبدل کیا ہوگا۔ اس لیے میرے نزدیک وہ معتبر اور قابل استناد نہیں ہے۔ اصح السیر میں یہ بات پڑھ کر مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی کی طرف رجوع کیا جن کی نظر مخطوطات پر بڑی وسیع اور عمیق ہے۔ مولانا اعظمی نے جواب

میں تحریر فرمایا کہ طبقات ابن سعد کا اڈیشن جس مخطوطہ پر مبنی ہے، اس کو میں نے دیکھا اور مطبوعہ اڈیشن اور مخطوطہ دونوں کا حرفاً حرفاً مقابلہ کیا ہے اور کہیں ایک حرف کا فرق بھی نہیں پایا ہے (ماہنامہ برہان، دہلی جون ۱۹۸۲)

اس نفسیات کی بنا پر مسلمانوں کے لیے یہ ممکن نہ ہو سکا کہ وہ جدید اسلوب یا جدید معیار ادب کو سمجھیں جن کو پیدا کرنے والی خود یہی قومیں تھیں۔ جدید قوموں سے نفرت مسلمانوں کے لیے اس میں مانع ہو گئی کہ وہ جدید اسلوب کو سمجھیں اور اس میں مہارت پیدا کر کے لسانِ قوم میں اسلامی لٹریچر فراہم کریں۔

خلاصہ

اوپر جو باتیں عرض کی گئیں، ان کا خلاصہ یہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں سب سے بڑا کام یہ ہے کہ مسلمانوں اور دوسری قوموں کے درمیان حریف اور رقیب کا رشتہ ختم کیا جائے اور ان کے درمیان داعی اور مدعو کا رشتہ قائم کیا جائے۔ جس دن ایسا ہو گا کہ مسلمان اپنے آپ کو داعی اور دوسری قوموں کو مدعو سمجھنے لگیں، اسی دن مسلمانوں کے اندر وہ تمام اعلیٰ صفات پیدا ہونا شروع ہو جائیں گی جو موجودہ زمانہ میں اسلام کے احیاء کی جدوجہد کرنے کے لیے ضروری ہیں۔

اس سلسلہ میں یہ بھی جان لینا چاہیے کہ داعی اور مدعو کا رشتہ پرجوش تقریری الفاظ بول دینے کا نام نہیں ہے۔ یہ موجودہ دنیا میں سب سے بڑی قربانی ہے۔ اس کے لیے ہمیں دوسری قوموں سے اپنی تمام شکایتوں کو یک طرفہ طور پر ختم کر دینا ہو گا۔ اس کے لیے ضروری ہو گا کہ دوسری قوموں سے محبت کی جائے خواہ وہ ہماری دشمن بنی ہوئی ہوں۔ دوسری قوموں کے لیے نیک دعائیں کی جائیں، خواہ وہ ہمارے خلاف سازش کر رہی ہوں۔ دوسری قوموں کو خیر خواہی کا موضوع بنایا جائے خواہ ہمارے نزدیک وہ ہماری بدخواہی میں مشغول ہوں۔

کامیابی کی شرط

آدمی خارجی دنیا کی جو معلومات حاصل کرتا ہے اس کا ۸۰ فی صد حصہ اس کو آنکھ کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے۔ خدا جب سورج کے ذریعہ دنیا میں روشنی پھیلاتا ہے تو گویا وہ اس بات کا امکان کھولتا ہے کہ آدمی اپنی آنکھ سے دنیا کی چیزوں کو دیکھے اور اپنے معلومات کے ذخیرہ میں اضافہ کرے۔ مگر اس امکان سے فائدہ اٹھانا ایک شرط کے ساتھ بندھا ہوا ہے۔ وہ شرط یہ کہ آدمی اپنی آنکھ کو کھولے۔ اگر آدمی اپنی آنکھیں بند کرے تو سورج کی کامل روشنی کے باوجود وہ کچھ بھی نہ دیکھے گا۔ اس کی معلومات میں ایک فی صد اضافہ بھی نہ ہوگا۔

اسی طرح خدا جب ہوا کو چلاتا ہے تو گویا وہ اس بات کا امکان کھولتا ہے کہ آدمی اس سے آکسیجن لے اور اپنے لیے زندگی کا سامان کرے۔ مگر آکسیجن کو پانے کی یہ شرط ہے کہ آدمی اس کو فطرت کے مقرر راستہ سے اپنے اندر داخل ہونے دے۔ جو آدمی اس شرط کو پورا نہ کرے اس کے لیے آکسیجن سے لدی ہوئی ہواؤں کا چلنا اور نہ چلنا برابر ہوگا۔ وہ ان سے کچھ بھی فائدہ حاصل نہ کر سکے گا۔

فطرت کا یہی اصول انسانی زندگی کا اصول بھی ہے۔ انسانی زندگی میں کامیاب ہونے کا اصول بھی وہی ہے جو فطرت کی دنیا میں خدا نے قائم کر رکھا ہے۔

کامیابی کیا ہے۔ کامیابی مواقع کو استعمال کرنے کا دوسرا نام ہے۔ ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ آدمی کے سامنے کچھ مواقع کھلتے ہیں۔ اگر وہ ان مواقع کو استعمال کرے تو یقینی طور پر وہ کامیابی کی منزل تک پہونچ سکتا ہے۔ اور اگر وہ ان مواقع کو استعمال کرنے میں غفلت کر جائے تو اسی کے نتیجہ کا دوسرا نام ناکامی ہے۔ یہی اس دنیا کے لیے خدا کا ابدی اصول ہے۔

تاہم ہر موقع اپنے ساتھ کچھ شرط لیے ہوئے ہوتا ہے۔ اس شرط کو ملحوظ رکھ کر ہی آپ اس موقع سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں، اگر آپ متعلقہ شرط کو ملحوظ رکھنے میں ناکام رہیں تو آپ اس موقع کا فائدہ اٹھانے میں بھی ناکام رہیں گے۔ یہ دنیا خود اپنے اصولوں پر قائم ہے۔ دنیا کبھی ہماری خواہشوں کی پابندی نہیں کرے گی۔ بلکہ ہمیں اپنے آپ کو دنیا کے قائم شدہ اصولوں کا پابند بنانا پڑے گا۔ یہی موجودہ دنیا میں کامیابی

کا واحد راز ہے۔ اس کے سوا کوئی اور طریقہ نہیں جس سے یہاں کامیابی حاصل کی جا سکے۔

ایک مثال لیجئے۔ موجودہ زمانہ میں ایک بہت بڑا امکان کھلا ہے جو اس سے پہلے کبھی دنیا میں اس وسعت کے ساتھ موجود نہ تھا۔ یہ ہے آزادیٔ رائے کا حق۔ موجودہ دور معلوم تاریخ کا پہلا دور ہے جب کہ عالمی سطح پر یہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ ہر آدمی کو یہ حق ہے کہ وہ اپنی پسند کا عقیدہ رکھے۔ اور اگر وہ اپنے عقیدہ کی تبلیغ کرنا چاہتا ہے تو دوسروں میں اس کی تبلیغ کرے۔ عقیدہ اور اظہارِ رائے کی یہ آزادی موجودہ زمانہ میں کامل طور پر ہر شخص کو حاصل ہے۔ اس میں کمیونسٹ ملکوں کے سوا کسی ملک کا کوئی استثنا نہیں۔

تاہم یہ آزادی پر امن ذرائع (Peaceful means) کی شرط کے ساتھ مشروط ہے۔ یعنی آپ جو کچھ کریں سمجھانے بجھانے کے انداز میں کریں۔ زور زبردستی کے انداز میں نہ کریں۔ اگر آپ اس شرط پر قائم ہوں تو آج کی دنیا میں اپنے عقیدہ اور نظریہ کی تبلیغ سے آپ کو کوئی روکنے والا نہیں۔

"پر امن ذرائع" کی شرط کوئی غیر متعلق شرط نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ شرط خود مذکورہ اصولِ آزادی ہی کا ایک لازمی حصہ ہے۔ کیوں کہ یہ آزادی کسی ایک شخص کے لیے نہیں ہے بلکہ ہر شخص کے لیے ہے۔ اور جب ہر شخص کو یکساں آزادی دی جائے تو پر امن ذرائع کی شرط لازمی طور پر مطلوب ہو جاتی ہے۔ کیوں کہ کسی شخص کا غیر پر امن ذریعہ اختیار کرنا یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ دوسرے شخص کی آزادی چھین رہا ہے۔ اس طرح غیر پر امن ذرائع کا طریقہ آزادی کا الٹا ہو جاتا ہے۔ وہ اس کی نفی بن جاتا ہے وہ ایک کے حق میں آزادی اور دوسرے کے حق میں پابندی بن جاتا ہے۔ ایسی حالت میں کیوں کر ممکن ہے کہ لوگوں کو اس کی اجازت دی جائے۔

اس جدید انقلاب نے موجودہ زمانہ میں اسلامی دعوت کے حق میں ایسے امکانات کھول دیئے ہیں جو اس سے پہلے تاریخ میں کبھی پائے نہیں جاتے تھے۔ تاہم اس امکان کو حاصل کرنے کی ہمیں ایک لازمی قیمت دینی پڑے گی۔ وہ یہ کہ ہم اپنے آپ کو کامل طور پر پر امن ذرائع کے دائرہ میں محدود رکھیں۔ اگر ہم اس لازمی شرط کو پورا کرنے میں ناکام رہیں تو یقینی طور پر ہم موجودہ مواقع کو استعمال کرنے میں بھی ناکام رہیں گے۔ اگر ہم مذکورہ شرط کو پورا نہ کرنے کی وجہ سے اس امکان سے فائدہ نہ اٹھا سکیں تو ہم اللہ کے یہاں مجرم ٹھہریں گے خواہ بطور خود ہم نے دوسروں کو مجرم ٹھہرا رکھا ہو۔

غیر خونی انقلاب

خونی انقلاب در اصل انقلاب کی نفی ہے۔ حقیقی انقلاب وہ ہے جو غیر خونی انقلاب ہو۔ اسلام اس کی واحد اعلیٰ مثال ہے۔ انسان انقلاب چاہتا ہے۔ اسی کے ساتھ وہ چاہتا ہے کہ یہ انقلاب غیر خونی طور پر آئے۔ مگر تاریخ بتاتی ہے کہ کوئی بھی شخص غیر خونی انقلاب لانے پر قادر نہ ہوسکا۔ تمام معلوم انقلابات قتل اور خون کے جنگل کو پار کرکے ہی ظہور میں آئے ہیں۔ محمد صلے اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا انقلاب تمام معلوم تاریخ کا واحد انقلاب ہے جو حقیقی معنوں میں غیر خونی انقلاب (bloodless revolution) ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اگر تاریخ سے حذف کر دیا جائے تو نہ صرف غیر خونی انقلاب کی یہ بات افسانہ بن کر رہ جاتی ہے بلکہ اس کے بعد کوئی ایسی عملی مثال باقی نہیں رہتی جس کی روشنی میں کوئی انسان بعد کے زمانوں میں غیر خونی انقلاب کی بات سوچ سکے۔

فرانس میں جدید جمہوری انقلاب آیا۔ اس میں عوام اور شاہی نظام کے درمیان جو مقابلے ہوئے ان میں مرنے والوں کی تعداد ۱۰ لاکھ تک پہنچ گئی۔ بیسویں صدی میں روس میں اشتراکی انقلاب آیا۔ اس میں جو لوگ مرے اور مارے گئے ان کی حقیقی تعداد لامعلوم ہے۔ تاہم اندازہ ہے کہ ان کی تعداد کسی حال میں ایک کروڑ سے کم نہیں۔ امریکی انقلاب (۱۷۷۵ - ۱۷۸۳) میں نسبتاً کم آدمی مرے۔ تاہم اس میں بھی مقتولین کی تعداد ۵۰ ہزار تک پہنچ گئی۔ عالمی جنگوں کا معاملہ اس سے بھی آگے ہے۔ چنانچہ پہلی عالمی جنگ میں مختلف ملکوں کے ۷۵ لاکھ آدمی مارے گئے۔ اور دوسری عالمی جنگ میں چھ کروڑ سے زیادہ آدمی ہلاک ہوئے۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا سے گئے تو ایک پورے ملک میں زبردست فکری اور اخلاقی انقلاب آچکا تھا۔ بوقت وفات ۱۲ لاکھ مربع میل کے رقبہ پر آپ کی حکومت قائم تھی۔ مگر اس پورے عمل میں صرف ۱۰۱۸ آدمی ہلاک ہوئے۔ جن میں مسلم مقتول ۲۵۹ تھے اور غیر مسلم مقتول ۷۵۹۔ یہ تعداد واقعہ کی نسبت سے اتنی کم ہے کہ وہ تقریباً نہیں کے برابر ہے۔ آپ کے لائے ہوئے انقلاب کو بلاشبہہ پورے معنوں میں غیر خونی انقلاب کہا جاسکتا ہے۔

ہر قائد غیر خونی انقلاب لانے کا دعویٰ کرتا ہے۔ مگر کوئی قائد غیر خونی انقلاب لانے میں کامیاب نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا میں غیر خونی انقلاب لانے کے لئے خود اپنے آپ کو خون کرنا پڑتا ہے۔ اور یہی وہ قیمت ہے جس کو دینے کے لئے کوئی شخص تیار نہیں۔ خونی انقلاب ٹکراؤ

کی زمین پر آتے ہیں ، اور غیر خونی انقلاب صبر کی زمین پر۔ اور صبر سے زیادہ مشکل کوئی کام اس دنیا میں ایک انسان کے لئے نہیں۔

صبر کی حقیقت جھٹکے کو اپنے آپ پر لینا ہے ، دوسروں پر انڈیلنے کے بجائے اپنے آپ پر سہنا ہے حقیقت یہ ہے کہ لڑائی کے بغیر بھی جیت ہوتی ہے۔ مگر لڑائی کے بغیر جیتنے کے لئے اپنے آپ سے لڑنا پڑتا ہے ، لوگ اپنے آپ سے لڑ نہیں پاتے، اس لئے وہ لڑائی کے بغیر لڑائی جیتنے والے بھی نہیں بنتے۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم غیر خونی انقلاب لانے میں کس طرح کامیاب ہوئے۔ اس کا اندازہ آپ کے حالات زندگی کے مطالعہ سے ہوتا ہے۔ مکہ میں ۱۳ سال تک آپ کے مخالفوں نے آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو ہر قسم کی تکلیفیں پہنچائیں۔ انھوں نے الفاظ کی چوٹ بھی دی اور پتھر اور نیزے کی چوٹ بھی۔ مگر اس طرح کے بے شمار واقعات پیش آنے کے باوجود محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار بھی جوابی ردعمل ظاہر نہیں کیا۔ اور نہ کسی سے کوئی لڑائی کی۔ آپ مخالفوں کے ہر وار کو یک طرفہ طور پر سہتے رہے۔ ان کی طرف سے ہر قسم کے اشتعال کے باوجود کبھی مشتعل نہیں ہوئے۔

اس کے بعد آپ نے یہ کیا کہ مکہ کو چھوڑ کر خاموشی کے ساتھ مدینہ چلے گئے۔ آپ نے نہ اس کے خلاف فریاد کی کہ آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو اپنے وطن اور اپنی جائداد کو چھوڑنا پڑ رہا ہے اور نہ اس کی پروا کی کہ اس طرح وطن چھوڑ کر جانے کی بنا پر لوگ آپ پر بزدلی اور فرار کا الزام لگائیں گے۔

مدینہ چلے جانے کے بعد مکہ کے لوگوں نے آپ کے خلاف جنگ چھیڑ دی۔ اس وقت بھی آپ کی پالیسی یہ رہی کہ حتی الامکان جنگ سے اعراض کیا جائے۔ مثال کے طور پر احزاب کے موقع پر آپ نے خندق کھود کر اپنے اور دشمنوں کے درمیان آڑ قائم کر دی۔ آپ نے صرف دفاع میں جنگ کی اور وہ بھی اس وقت جب کہ مڈبھیڑ کے سوا کوئی اور صورت باقی نہ رہ گئی ہو۔ ایسی باقاعدہ جنگیں صرف تین ہیں جن میں آپ خود شریک رہے ہوں (بدر، احد اور حنین) آپ کے زمانہ میں موتہ کی جنگ بھی ہوئی۔ مگر اس میں آپ خود شریک نہ تھے۔

آپ کو عرب میں جو غلبہ حاصل ہوا وہ جنگ کے ذریعہ نہیں ہوا ، بلکہ اس "صلح" کے ذریعہ ہوا جس کو قرآن میں فتح مبین (الفتح ۱) کہا گیا ہے۔ صلح حدیبیہ کا واقعہ غیر خونی انقلاب لانے کے لئے اپنے آپ کو خون کرنے سے کم نہ تھا۔ آپ نے اپنی ذات کا خون کرنا گوارا کیا، تاکہ باہر کی دنیا میں خون نہ بہایا جائے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو عرب میں جو غلبہ حاصل ہوا وہ جنگ کے ذریعہ نہیں ہوا بلکہ دعوت کے ذریعہ ہوا۔ اسی دعوت کے بند دروازوں کو کھولنے کے لئے آپ نے یہ کیا کہ دشمن سے اس کی اپنی شرائط کی بنیاد پر صلح کر لی۔ یہ صلح حدیبیہ تھی جس کو قرآن میں کھلی فتح (انا فتحنا لك فتحاً مبينا) کہا گیا ہے۔ صلح حدیبیہ اس بات کا ایک تاریخی ثبوت ہے کہ جنگ کے مقابلہ میں امن کی طاقت بہت زیادہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیبیہ کی یک طرفہ صلح کے ذریعہ اسی عظیم حقیقت کا عملی مظاہرہ فرمایا، تاہم یہ کوئی سادہ بات نہیں۔ اس قسم کے ایک واقعہ کو ظہور میں لانے کے لیے صبر کی ضرورت ہے، اور اس دنیا میں بلاشبہ صبر سے زیادہ مشکل قربانی اور کوئی نہیں۔

ایک وضاحت

جب یہ کہا جائے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ بے تشدد طریقہ تھا اور آپ امن کی طاقت سے انقلاب لے آئے۔ تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ آپ نے اپنی زندگی میں کبھی تشدد کا کوئی طریقہ وقتی یا استثنائی طور پر بھی اختیار نہیں کیا۔

اس قسم کے دوسرے بیانات کی طرح اس بیان کا مقصد بھی صرف آپ کے اصولی طریق کار کو بتانا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ آپ نے اپنے طے کردہ معیار کے مطابق، بطور خود ہمیشہ اس اصول کو اپنے سامنے رکھا کہ آپ کو امن کی طاقتوں کے ذریعہ اپنے مطلوبہ انقلاب تک پہنچنا ہے۔ اپنے منصوبہ کی حد تک آپ نے ہمیشہ امن کے طریقوں ہی کو اولین ترجیح دی۔ اور آپ کی کامیابی بنیادی طور پر امن کی طاقتوں ہی کے استعمال کا نتیجہ تھی۔

کمیونزم کے پیش نظر بھی ایک انقلاب تھا۔ مگر کمیونزم نے بنیادی طور پر تشدد کو اپنا طریقہ قرار دیا۔ اس لیے اس نے دوسری ممکن تدبیروں کو نظر انداز کر کے تشدد کے ذریعہ اپنا مقصد حاصل کرنا چاہا۔

مثال کے طور پر کمیونسٹ لیڈر جوزف اسٹالن نے اپنے نظریہ کے مطابق، سوویت یونین کی زرعی زمینوں کو ریاستی فارم یا اجتماعی فارم (collective farm) بنانا چاہا۔ یہ ۱۹۳۰ـ۳۵ کا واقعہ ہے، اس مقصد کے لیے وہ زمینوں کی سرکاری خریداری اور تدریجی نفاذ کا طریقہ بھی اختیار کر سکتا تھا۔ مگر اس نے مسلح طاقت کا ذریعہ استعمال کیا۔ اس نے جبر و تشدد کے ذریعہ کسانوں سے زمینیں چھین لیں۔ اور جب انھوں نے مزاحمت کی تو کئی ملین کسانوں کو گولی کا نشانہ بنا دیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ ، اس کے برعکس ، امن کے اصولوں پر مبنی تھا۔ تاہم اس دنیا میں کوئی شخص اکیلا نہیں ہے۔ یہاں ہمیشہ "فریق ثانی" کا مسئلہ موجود رہتا ہے۔ فریق ثانی اگر کسی حال میں اپنی ضد کو نہ چھوڑے۔ وہ آخری حد تک ظلم پر قائم رہے تو امن پسندی کی تمام تر کوششوں کے باوجود بعض اوقات دفاعی کارروائی ایک ناگزیر برائی بن جاتی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فریق ثانی کے ہر وار کو یک طور پر سہا۔ آپ نے نفرت کے جواب میں محبت کی۔ سب وشتم کے جواب میں دعائیں دیں۔ ایذا رسانی کے جواب میں صبر کیا۔ مسلسل اشتعال انگیزی کے باوجود آپ مشتعل نہیں ہوئے۔ متشددانہ کارروائیوں کو اعراض کے ذریعہ روکنے کی کوشش کی۔

اس قسم کی امن پسندانہ کوششوں کے باوجود کبھی ایسا ہوا کہ فریق ثانی کی بڑھی ہوئی ضد اور جارحیت کی بنا پر کوئی بھی پُر امن تدبیر کارگر نہ ہو سکی۔ اور آخر کار دفاعی طور پر ٹکراؤ کی نوبت آگئی۔ تاہم دفاعی کارروائی میں بھی آپ نے پوری طرح اس کا اہتمام کیا کہ کم سے کم تشدد کے ذریعہ مقصد حاصل ہو سکے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ۲۳ سالہ عمر نبوت میں اس قسم کا بعض ٹکراؤ جو پیش آیا اس کی حیثیت استثنار کی تھی نہ کی عموم کی۔ اور یہ ایک مسلّمہ اصول ہے کہ استثنار کو ہمیشہ عموم کے تحت شمار کیا جاتا ہے نہ یہ کہ عموم کو استثنار کے تحت شمار کیا جائے۔

اصلاح اعمال

قرآن میں اہل ایمان سے کہا گیا ہے کہ تم لوگ درست بات (قول سدید) کہو۔ اگر تم ایسا کروگے تو اللہ تمہارے اعمال کی اصلاح فرمائے گا اور تم کو کامیابی عطا کرے گا (الاحزاب ۷۰ - ۷۱)

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ درست بات بولنے سے اعمال اور معاملات کی اصلاح کیوں کر ہو جائے گی۔ جواب یہ ہے کہ قول سے سوچ بنتی ہے اور سوچ سے عمل بنتا ہے۔ آدمی جب درست اور ٹھیک مطابقِ واقعہ بات کہے گا تو اس کی سوچ بالکل صحیح رہے گی۔ اور جب سوچ صحیح ہوگی تو اس سے جو عمل ظاہر ہوگا وہ بھی یقیناً صحیح ہوگا۔ اس کے برعکس جب قول درست نہ ہو تو سوچ اور عمل دونوں غلط ہوتے چلے جائیں گے۔

حدیث میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم جب اپنے اصحاب کو کسی گروہ کی طرف بھیجتے تھے تو ان سے کہتے تھے کہ تم لوگوں کو بشارت دینا، نفرت نہ دلانا۔ تم آسانی کی بات کہنا، سختی کی بات نہ کہنا (بشّروا ولا تنفروا ویسّروا ولا تعسّروا) مشکاۃ المصابیح ۲/ ۱۰۹۹

اگر آپ بشارت اور یُسر والے الفاظ بولیں تو سننے والوں کے اندر امید اور حوصلہ کا ذہن بنے گا۔ اس کے بعد وہ امکانات کے میدان میں عمل کی تدبیر نکالیں گے اور اُس میں محنت کرکے کامیابی حاصل کریں گے۔ اس کے برعکس اگر آپ لوگوں کے سامنے نفرت اور عُسر کے الفاظ بولیں تو اس سے سننے والوں کے اندر نا امیدی اور دل شکستگی کا مزاج پیدا ہوگا۔ وہ یہ صلاحیت کھودیں گے کہ اپنی قوتوں کو عمل میں لاکر اپنے مستقبل کی بہتر تعمیر کرسکیں۔

اس کی مثال لیجئے۔ پچھلی صدی میں مسلم قوموں پر برطانیہ کا تسلّط قائم ہوگیا تھا۔ اب اس کی جگہ پر سارے عالم اسلام میں امریکہ غالب حیثیت حاصل کیے ہوئے ہے۔ ۱۹۴۷ سے پہلے تمام مسلمان برطانیہ کو اسلام کا دشمن نمبر ایک کہتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ برطانیہ سازش کرکے مسلم دنیا پر قابض ہوگیا ہے۔ اب تمام دنیا کے مسلمان امریکہ کو اسلام کا دشمن نمبر ایک کہہ رہے ہیں۔ دوبارہ ان کا کہنا ہے کہ امریکہ نے سازش کے ذریعہ عالمِ اسلام پر غلبہ حاصل کرلیا ہے۔ یہ صورتِ واقعہ کے اظہار کے لیے غلط لفظ بولنا ہے۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اس دنیا میں قوموں کی حالت میں تبدیلی اللہ کے قانون کے تحت ہوتی ہے۔ اور وہ قانون یہ ہے کہ کسی قوم کی داخلی حالت (ما بانفس) میں جب تغیر واقع ہوتا ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کی خارجی حالت (ما بقوم) میں بھی تغیر واقع ہو جاتا ہے (الانفال ۵۳، الرعد ۱۱)

اس قرآنی بیان کے مطابق، مغربی قوموں کے بارہ میں مسلمانوں کا مذکورہ بیان قول سدید کے خلاف قرار پاتا ہے۔ اس کے مطابق، صحیح بات یہ ہے کہ مسلمانوں کی استعداد میں کمی اور مغربی قوموں کی استعداد میں اضافہ نے یہ صورتِ حال پیدا کی ہے۔ اس لیے اس معاملہ میں قول سدید یہ ہوگا کہ یہ کہا جائے کہ مغربی قومیں ترقی کے اعتبار سے نمبر ایک پر پہونچ گئی ہیں اور مسلمان ترقی کے اعتبار سے نمبر ۲ پر چلے گیے ہیں۔ دونوں گروہوں کے درمیان اسی فرق نے یہ حالت پیدا کی ہے کہ ایک غالب ہو گیا ہے اور دوسرا مغلوب۔

اس معاملہ میں مسلمان اگر قول سدید بولتے۔ یعنی وہ یہ کہتے کہ موجودہ زمانہ میں مغربی ممالک اپنی قومی صلاحیت میں آگے بڑھ گیے ہیں، اور ہم اپنی قومی صلاحیت میں ان کے مقابلہ میں پیچھے چلے گیے ہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو مسلمانوں کے اندر خود تعمیری کی سوچ ابھرتی۔ ان کے اندر اپنے پچھڑے پن کا احساس جاگتا۔ اس کے بعد تمام مسلمان اپنی کمیوں کو دور کرنے میں لگ جاتے۔ اس طرح ان کی اصلاحِ اعمال ہوتی، وہ اپنی صلاحیت میں اضافہ کرتے۔ اور آخر کار اپنی کھوئی ہوئی حیثیت کو دوبارہ حاصل کر لیتے۔

اس کے برعکس جب انھوں نے مغربی قوموں کے معاملہ کو سازش اور ظلم کا معاملہ بتایا تو ان کی پوری سوچ منفی سوچ بن گئی۔ ان کے اندر صرف دوسروں کے خلاف نفرت اور جھنجھلاہٹ کے جذبات ابھرے۔ وہ اپنی مصیبت کا ذمہ دار دوسروں کو سمجھ کر ان کے خلاف فریاد کرنے میں مشغول ہو گیے۔ اور معلوم ہے کہ فریاد و ماتم سے کسی کا معاملہ کبھی درست نہیں ہوتا۔

چیلنج نہ کہ تعصّب

یہی معاملہ ہندستان جیسے ملکوں کا ہے۔ یہاں مسلمان اقلیت میں ہیں اور ہندو ان کے مقابلہ میں اکثریت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہاں مسلمانوں کو طرح طرح کے مسائل درپیش ہیں۔ سماجی اقتصادی اور سیاسی میدانوں میں ان کو اکثریتی فرقہ کی طرف سے ناخوش گوار تجربات پیش آرہے ہیں۔

ایسا کیوں ہے۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو جب زمین پر بسایا تو اس

سے کہا کہ تم لوگ ایک دوسرے کے دشمن ہو گے (البقرہ ۳۶) اس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں مختلف افراد اور مختلف گروہوں کے درمیان مقابلہ اور مسابقت جاری ہوگا۔ ہر ایک دوسرے کو پیچھے دھکیل کر آگے بڑھ جانا چاہے گا۔ اس کے نتیجہ میں باہمی ٹکراؤ ہوگا۔ حتی کہ بعض اوقات دشمنی کی نوبت آجائے گی۔

اس قرآنی بیان کو سامنے رکھ کر دیکھئے تو ہندستان جیسے ملکوں میں مسلمانوں کے ساتھ جو کچھ پیش آرہا ہے وہ چیلنج کا معاملہ ہے۔ خدا نے اس دنیا کو چیلنج کا مقام بنایا ہے۔ یہ چیلنج کسی نہ کسی صورت میں ہر ایک کو پیش آتا ہے۔ اگر اس کو چیلنج کہا جائے تو یہ اس معاملہ میں قول سدید ہوگا۔ مگر مسلمانوں کے لکھنے اور بولنے والے طبقہ نے اس کو تعصب اور زیادتی کے الفاظ میں بیان کیا جو بلاشبہ قول غیر سدید کے ہم معنی تھا۔

اگر اس صورت حال کو چیلنج کہا جائے تو اس سے مقابلہ کا ذہن پیدا ہوگا۔ لوگ سوچیں گے کہ ہم کو ہمت اور حوصلہ کے ساتھ اس کا سامنا کرنا چاہیے۔ یہ ذہن لوگوں کی صلاحیتوں کو جگاکر انھیں اس قابل بنائے گا کہ وہ پیش آمدہ چیلنج سے نمٹ سکیں۔ مگر جب اس معاملہ کو تعصب اور زیادتی کے الفاظ میں بیان کیا گیا تو اس سے منفی نفسیات پیدا ہوئی۔ لوگوں کو صرف یہ نظر آیا کہ وہ اس کے خلاف شکایت اور احتجاج کرنے میں مشغول ہو جائیں۔ چیلنج سمجھنے سے معاملات درست ہوتے ہیں اور تعصب سمجھنے سے معاملات بگڑ جاتے ہیں۔

قتل، شہادت

ہندستان کے اندر اور ہندستان کے باہر جگہ جگہ مسلمانوں کا ٹکراؤ دوسروں کے ساتھ پیش آرہا ہے۔ اس کے نتیجہ میں جو تصادم ہوتا ہے اس میں مسلمان بڑی تعداد میں مارے جاتے ہیں۔ جب کہیں ایسا کوئی واقعہ ہوتا ہے تو مسلمانوں کے تمام لکھنے اور بولنے والے کہتے ہیں کہ "اتنے مسلمان شہید ہو گیے" جب کہ قرآن میں اس طرح کے مواقع کے لیے قتل کا لفظ آیا ہے۔ مثلاً: ولا تقولوا لمن یقتل فی سبیل اللہ اموات (البقرہ ۱۵۴) وغیرہ۔

اس معاملہ میں قتل کا لفظ قول سدید ہے اور شہید کا لفظ قولِ غیر سدید۔ قتل کا لفظ مجرّد رپورٹنگ کا لفظ ہے۔ جب کہ شہید کا لفظ انجام کا لفظ ہے اور انجام کا حال صرف اللہ کو معلوم ہے۔

یہی وجہ ہے کہ دور اول میں اس طرح کے مواقع پر ہمیشہ قتل یا اس کا ہم معنی لفظ استعمال ہوتا تھا۔ اس طرح کے معاملات میں ہماری حیثیت صرف رپورٹر کی ہوتی ہے، جج کی نہیں ہوتی۔ اس لیے ہمارے لیے درست بات یہی ہے کہ ہم بیان واقعہ والا لفظ استعمال کریں نہ کہ انجامِ واقعہ والا لفظ۔

اس لفظی فرق کا اثر اعمال پر کس طرح پڑتا ہے۔ جب آپ کہیں کہ فلاں جگہ ٹکراؤ ہوا اور اس میں اتنے مسلمان شہید ہوگیے تو آپ نے اس واقعہ کو مقدس اور مطلوب حیثیت دیدی۔ اب لوگوں کا ذہن اس پر اس لحاظ سے نہیں سوچ سکتا کہ بجائے خود یہ ٹکراؤ کرنا صحیح تھا یا غلط۔ اس کے بعد مسلمانوں کا حال یہ ہوگا کہ وہ بے فائدہ طور پر مسلسل ٹکراؤ کرتے رہیں گے اور کبھی ایسا نہ کریں گے کہ اس پر نظر ثانی کریں اور اپنے رویہ کو بدل کر ہلاکت سے بچ جائیں۔

اس کے برعکس جب آپ یہ کہیں کہ فلاں جگہ ٹکراؤ ہوا اور اس میں اتنے مسلمان مارے گیے تو آپ اس واقعہ کو ایک ایسا واقعہ قرار دیدیتے ہیں جو صحیح بھی ہوسکتا ہے اور غلط بھی۔ اب آپ کا ذہن اس پر نظرِ ثانی کرے گا۔ آپ اس کے نفع نقصان کا میزانیہ لگائیں گے۔ اور جب دیکھیں گے کہ موجودہ حالات میں ٹکراؤ کا کوئی فائدہ نہیں تو آپ فوراً اپنا ذہن تبدیل کرلیں گے اور آئندہ ٹکراؤ سے اعراض کرتے ہوئے ہلاکت سے بچ جائیں گے۔

اس طرح کے معاملہ میں "شہادت" کا لفظ بے فائدہ ہلاکت کو جاری رکھنے کا سبب بنتا ہے۔ اور "قتل" کا لفظ بے فائدہ ہلاکت کو ختم کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔

پریس کا دور

قدیم زمانہ میں بھی ایسے افراد پیدا ہوئے جو غیر سدید الفاظ میں کلام کریں۔ مگر قدیم زمانہ میں ایسے افراد کا اثر بہت محدود رہتا تھا۔ کیوں کہ اس وقت وہ وسیع ذرائع ابلاغ موجود نہ تھے جو آج ہر لکھنے اور بولنے والے کو فوراً حاصل ہوجاتے ہیں۔ چنانچہ قدیم زمانہ میں غیر سدید الفاظ بولنے سے وہ خرابی پیدا نہ ہوسکی جس کا مشاہدہ آج ہر طرف کیا جارہا ہے۔

موجودہ زمانہ میں چھپائی اور پریس اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت تھی۔ پریس کو مسلمانوں کی ذہن سازی یا قرآن کے الفاظ میں تزکیہ (آل عمران ۱۶۴) کے لیے نہایت موثر طور پر استعمال کیا جاسکتا تھا۔ مگر عین اس وقت جب کہ پریس کا دور آیا مسلمانوں کا صاحبِ قلم طبقہ عمومی طور پر منفی ذہنیت

کا شکار ہوگیا۔ غالب قوموں کے خلاف ردعمل کی نفسیات نے اس کو مکمل طور پر احتجاجی بنا دیا۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلم پریس تقریباً سب کا سب قول غیر سدید کا نمونہ بن گیا۔ پریس کے دور میں مسلمانوں نے جو اخبارات و رسائل جاری کیے ان میں غالباً کوئی ایک بھی ایسا نہیں جس کو حقیقی طور پر قولِ سدید کی مثال قرار دیا جاسکے۔

موجودہ مسلمانوں کا عام طور پر یہ حال ہے کہ وہ مغربی قوموں کے بارے میں صرف سازش اور جارحیت کی اصطلاح میں سوچنا جانتے ہیں، وہ اس کو استعداد کے فرق کے مسئلہ کی حیثیت سے نہیں دیکھ پاتے۔ اسی طرح وہ ہندو اور اس قسم کی دوسری قوموں کو صرف متعصب اور ظالم کے خانہ میں ڈالے ہوئے ہیں۔ وہ اس معاملہ کو اس نظر سے نہیں دیکھ پاتے کہ یہ ایک چیلنج ہے جو خود نظامِ فطرت کے تحت ہمارے لیے پیش آیا ہے۔ وہ اپنی قوم کے مرنے والوں کو ہر حال میں شہید کا درجہ دیتے ہیں اور دوسری قوم کے مرنے والوں کے لیے ہمیشہ ان کے پاس جہنم رسید کا لفظ ہوتا ہے۔

یہ منفی مزاج اتنے بڑے پیمانہ پر پھیلنے کا واحد سبب پریس ہے۔ مسلمانوں کے اربابِ قلم نے پریس کو مجرمانہ حد تک ذہن کو بگاڑنے کے لیے استعمال کیا ہے۔ اور اسی کا یہ نتیجہ ہے جو آج ہم اپنے چاروں طرف دیکھ رہے ہیں۔

جزئی تاریخ

موجودہ زمانہ کے مسلم رہنما دوسری قوموں کے غلبہ کو اگر ان کی استعدادی فوقیت کا معاملہ سمجھتے تو وہ مسلمانوں کو اعدادِ قوت (الانفال ۶۰) کی تلقین کرتے۔ وہ مسلمانوں سے کہتے کہ تم اپنی کمیوں کو جانو اور اس کی تلافی کرکے اپنے آپ کو عہدِ جدید کے معیار کے مطابق بنانے کی کوشش کرو۔ مگر موجودہ دور کے مسلم رہنماؤں نے دوسری قوموں کے غلبہ کے معاملہ کو سادہ طور پر صرف جارحیت کا معاملہ سمجھا۔ اس لیے وہ اٹھ کر مسلمانوں کو لڑائی بھڑائی پر اکسانے لگے۔

ان رہنماؤں کو نظر آیا کہ لڑائی اور ٹکراؤ جاری رکھنے کے لیے سب سے زیادہ کارآمد طریقہ یہ ہے کہ مسلمانوں کو دورِ اوّل کے اہلِ اسلام کے فاتحانہ کارنامے سنائے جائیں۔ ان کو جنگ وقتال کی معرکہ آرائیاں یاد دلائی جائیں۔ چنانچہ تقریر و تحریر اور نظم و نثر کے تمام طریقے اس مقصد کے لیے وقف کر دیئے گیے۔ پورا مسلم معاشرہ فتوحات اسلامی کے تذکروں سے گونج اٹھا۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام کی تاریخ کے فاتحانہ واقعات تو مبالغہ آمیز انداز میں لوگوں کے سامنے آ گیے ۔ مگر اسلام کی تاریخ کا دوسرا پہلو جو صبر اور تواضع جیسی صفات سے تعلق رکھتا ہے، وہ بالکل لوگوں کے سامنے نہ آسکا ۔ لوگوں نے تاریخ اسلامی کے نصف ثانی کو جانا مگر وہ تاریخ اسلامی کے نصف اوّل سے بے خبر رہے ۔

واقعہ حدیبیہ

لکھنے اور بولنے کا مذکورہ انداز اتنا بڑھا کہ دور اوّل کے جن واقعات میں فاتحانہ شان نہیں تھی ۔ ان کو بھی فتح و غلبہ کا واقعہ بنا کر پیش کیا گیا ۔ انھیں میں سے ایک مثال صلح حدیبیہ (۶ ھ) کی ہے ۔ حدیبیہ کی صلح ایک ایسا واقعہ تھا جو غیر فاتحانہ حالت سے تعلق رکھتا تھا ۔ مگر لفظی بازی گری کے ذریعہ اس کو بھی ایک فاتحانہ واقعہ بنا دیا گیا ۔ مثال کے طور پر ایک صاحب نے کہا :

" حدیبیہ کا سفر ایک اقدامی انداز کا واقعہ تھا ۔ حدیبیہ کا معاہدہ اس بات کی علامت بن گیا کہ آخر کار قریش نے مسلمانوں کی سیاسی اور دستوری حیثیت کو تسلیم کر لیا ۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے اس کو فتح مبین قرار دیا ۔ اس واقعہ سے ثابت ہو گیا کہ عرب کی سب سے بڑی طاقت یعنی قریش نے مسلمانوں کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے ہیں ۔"

حدیبیہ کی یہ تصویر تاریخی حقائق سے کوئی تعلق نہیں رکھتی ۔ یہ صرف شاعرانہ مضمون بندی ہے ۔ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں ۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کی زندگی میں ہر طرح کے واقعات جمع کر دیئے تھے ، شکست کے بھی اور فتح کے بھی ، غلبہ کے بھی اور مغلوبیت کے بھی ۔ تاکہ اہلِ اسلام خواہ جس حال میں ہوں ان کو اپنے پیغمبر سے رہنمائی ملتی رہے ۔ مگر مذکورہ قسم کے شاعرانہ قصیدوں نے مسلمانوں کو زندگی کے بہت سے معاملات میں پیغمبر کی رہنمائی سے محروم کر دیا ۔

مسلمان شعوری یا غیر شعوری طور پر یہ سمجھنے لگے کہ ان کے لیے اسلام میں حالتِ غلبہ کی رہنمائی تو موجود ہے مگر حالتِ مغلوبیت کی رہنمائی اسلام میں موجود نہیں ۔ " صلح حدیبیہ " اس بات کی مثال تھی کہ مسلمان جب مغلوبیت کی حالت سے دوچار ہوں تو اس وقت وہ کہاں سے اپنے عمل کا آغاز کریں ۔ مگر حدیبیہ کے واقعہ کو گھٹنے ٹیکنے کا واقعہ بتا کر انھیں اس سے محروم کر دیا گیا کہ موجودہ حالات میں وہ اس سے اپنے عمل کا نقطۂ آغاز پا سکیں ۔

قرآن میں صلحِ حدیبیہ کے لیے فتحِ مبین (الفتح ۱) کا لفظ آیا ہے۔ اس لفظ کو لے کر کہہ دیا گیا کہ کون کہتا ہے کہ صلحِ حدیبیہ کافروں سے دب کر کی گئی۔ قرآن کے بیان کے مطابق وہ فتحِ مبین تھی۔ اس میں خود کافروں نے مسلمانوں کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے تھے۔ نہ کہ مسلمانوں نے کافروں کی شرطوں کو مان لیا تھا۔

اس تقریر میں قرآن کے لفظ کو اس کے اصل مفہوم کے خلاف استعمال کیا گیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ قرآن میں اس صلح کے لیے فتحِ مبین کا لفظ ہے، مگر اس کو فتحِ مبین اس کے آخری انجام کے اعتبار سے کہا گیا ہے نہ کہ اس کی ابتدائی تاریخ کے اعتبار سے۔ جس دن صلحِ حدیبیہ کا عہدنامہ لکھا گیا اس دن وہ اپنے ظاہر کے اعتبار سے فریقِ مخالف کے غلبہ کے ہم معنی تھا، مگر بعد کو اپنے آخری نتیجہ کے اعتبار سے وہ مسلمانوں کے فتح وغلبہ کے ہم معنی بن گیا۔ یہی آخری نتیجہ ہے جس کو قرآن میں علاّم الغیوب نے پیشگی بشارت کے طور پر نمایاں فرمایا۔

حسنین کا کردار

پریس کا دور مسلم ملکوں میں انیسویں صدی میں آیا۔ اس زمانہ میں مسلمان غیر معتدل نفسیات کا شکار ہو چکے تھے۔ چنانچہ ان کا پریس بھی اس سے متاثر ہوا۔ مسلم پریس میں کچھ چیزیں تو خوب چھپنے لگیں اور کچھ دوسری چیزیں اس میں بالکل نہیں چھپیں۔ ظاہر ہے کہ جو چیز ہر وقت میڈیا میں نمایاں کی جا رہی ہو وہ سب کو نظر آئے گی اور جو چیز میڈیا میں نمایاں نہ ہو رہی ہو وہ لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہو جائے گی۔ چنانچہ عملاً مسلم دنیا میں ایسا ہی ہوا۔

اس کی ایک مثال یہ ہے کہ حسن اور حسین تاریخِ اسلامی کے دو متعین کردار ہیں۔ مگر صورت حال یہ ہے کہ امام حسین کے کردار سے تو ہر مسلمان مبالغہ کی حد تک واقف ہے، خواہ وہ پڑھا لکھا ہو یا بے پڑھا لکھا۔ اس کے برعکس امام حسن کا معاملہ یہ ہے کہ جاہل تو درکنار، موجودہ زمانہ کے عالم بھی ان کے تاریخی کردار سے واقف نہیں۔ فروری ۱۹۷۸ کے الرسالہ میں راقم الحروف نے جب حسن اور حسین کے تقابلی کردار پر ایک مضمون شائع کیا، اس وقت پہلی بار لوگوں کو معلوم ہوا کہ امام حسن کا بھی کوئی قابل ذکر تاریخی کردار ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلمان جس نفسیات میں مبتلا تھے، اس کے لحاظ سے ان کو حسین کا ماڈل اپنے لیے مفید مطلب نظر آیا، اور حسن کا ماڈل انھیں مفید مطلب دکھائی نہیں دیا۔ چنانچہ امام

حسین پر تو دور پریس میں بے شمار کتابیں اور مضامین اور اشعار چھاپے گیے ۔ ان کے تذکرہ پر مستقل جلسے اور کانفرنسیں ہوتی رہیں ۔ جب کہ دور پریس میں امام حسن کے کردار پر غالباً کوئی ایک بھی قابل ذکر کتاب شائع نہیں ہوئی اور نہ " یاد حسن " پر کبھی کوئی جلسہ کیا گیا ۔

تاریخ کے صفحات میں تو حسن اور حسین دونوں موجود تھے ۔ مگر موجودہ مسلم میڈیا میں صرف حسین نمایاں ہوئے ۔ حسن اس سے بالکل حذف ہو گیے ۔ اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کی موجودہ نسل صرف حسین کے ماڈل سے واقف ہوئی ۔ حسن کا ماڈل اس کے زندہ حافظہ میں باقی نہیں رہا ۔

یہی معاملہ اسلامی تاریخ کے دوسرے واقعات کا ہے ۔ پریس کے دور میں اسلام کی تاریخ کے صرف ان واقعات کو نمایاں کیا گیا جن میں فتح اور کشور کشائی کی شان پائی جا رہی تھی ۔ حاکمانہ حالت کے تذکروں سے تمام مجلسیں اور کانفرنسیں گونج اٹھیں ۔ ان کو نمایاں کرنے کے لیے نظم و نثر کا سیلاب بہا دیا گیا ۔

مگر متواضع حالت کے لیے اسلام میں کیا نمونہ ہے ، اس پر میرے علم کے مطابق ، کوئی بھی ایسی کتاب شائع نہیں ہوئی جو قابل ذکر ہو یا کوئی حقیقی قیمت رکھتی ہو ۔ اس بنا پر قدرتی طور پر ایسا ہوا کہ اسلام کے ایک کردار کو تو لوگوں نے خوب جانا ۔ مگر اسلام کے دوسرے کردار سے وہ بالکل بے خبر رہے ۔

بے خبری

اگست ۱۹۸۹ میں مجھے ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلمان کی تقریر سننے کا اتفاق ہوا ۔ وہ ایک مغربی ملک کی یونیورسٹی میں اسلامیات کے پروفیسر ہیں ۔ ان کی تقریر کا عنوان تھا : اسلام مغرب میں (Islam in the West) تقریر کے بعد سوال وجواب کے دوران ایک ہندستانی مسلمان نے سوال کیا کہ ہندستان ایک ایسا ملک ہے جہاں غیر مسلم اکثریت کا غلبہ ہے اور مسلمان یہاں ایک اقلیتی فرقہ کی حیثیت رکھتے ہیں ۔ پھر ایسے ملک میں مسلمانوں کا طریق کار کیا ہونا چاہیے ۔

مسلمان پروفیسر نے ایک لمحہ سوچا ۔ اس کے بعد کہا کہ یہ ایک مشکل سوال ہے اور اس پر از سرِ نو ریسرچ کرنے کی ضرورت ہے ۔ کیوں کہ اسلام میں حالت قوت (position of strength) کا ماڈل تو موجود ہے ۔ مگر اسلام میں حالت فروتنی (position of modesty) کا ماڈل موجود نہیں ۔

یہ بات پیغمبر اسلام کی سیرت کے اعتبار سے سراسر خلافِ واقعہ ہے ۔ کیوں کہ آپ کی سیرت

میں بلاشبہ دونوں حالتوں کا نمونہ موجود ہے۔ البتہ موجودہ مسلمانوں کی اپنی ذہنی کیفیت کے اعتبار سے یہ بیان سراسر درست ہے۔ کیوں کہ یہ ایک واقعہ ہے کہ موجودہ مسلمان اُس اسلام سے واقف نہیں جس میں حالتِ فروتنی کا نمونہ موجود ہے۔ وہ صرف اس اسلام کو جانتے ہیں جس میں فتح و غلبہ کی حالت کا نمونہ پایا جاتا ہے۔

موجودہ مسلمانوں کی اسی ذہنی کیفیت کا یہ نتیجہ ہے کہ ایک سو سال سے زیادہ عرصہ گزر گیا اور اب تک مسلمانوں کو اپنے عمل کے لیے نقطۂ آغاز نہ مل سکا۔ موجودہ مسلمان عملاً حالتِ فروتنی میں ہیں۔ مگر انھیں معلوم نہیں کہ حالتِ فروتنی سے کیوں کر وہ اسٹارٹ لیں۔ وہ اپنے مخصوص ذہن کی بنا پر حالتِ قوت سے اسٹارٹ لینا جانتے ہیں، مگر موجودہ حالات میں قوت کے مقام سے اسٹارٹ لینا ان کے لیے ممکن نہیں۔

حالتِ فروتنی (پوزیشن آف ماڈسٹی) کے مطابق طریق کار اختیار کرنے کا مطلب حالتِ فروتنی پر باقی رہنا نہیں ہے بلکہ حالتِ فروتنی سے ابتدا کرنا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی جہاں فی الواقع ہے وہاں سے وہ اپنی جدّوجہدِ حیات کا آغاز کرے۔

اس دنیا میں کوئی بھی ایسا نہیں کرتا کہ وہ جہاں ہے بس وہیں وہ پڑا رہے۔ ہر ایک عمل کر کے آگے بڑھنا چاہتا ہے۔ مگر مفید عمل کے لیے صحیح نقطۂ آغاز لازمی طور پر ضروری ہے۔ صحیح نقطۂ آغاز سے سفر شروع کرنے والا ایک نہ ایک دن اپنی اگلی منزل پر پہونچ جاتا ہے۔ اور جو شخص غلط نقطۂ آغاز سے اپنا سفر شروع کرے وہ کبھی بھی کسی حقیقی منزل پر نہیں پہونچ سکتا۔ یہ ایک ابدی فیصلہ ہے جس میں کوئی استثناء نہیں۔

مذکورہ نفسیات کی بنا پر مسلمانوں کا حال اس ریٹائرڈ فوجی جیسا ہو گیا ہے جو صرف بندوق کی گولی کے ذریعہ مسائل کو حل کرنا جانتا ہو۔ مگر ریٹائر ہونے کے بعد جب اس کی بندوق اس کے پاس نہ رہے تو اس کی سمجھ میں نہ آئے کہ وہ اپنے پڑوسی کے ساتھ اپنے مسئلہ کو کس طرح حل کرے۔ پڑوسی کا مسئلہ حسن تدبیر کے ذریعہ حل ہو سکتا ہے مگر فوجی اس قسم کی تدبیر سے آشنا نہیں۔ وہ بندوق کی گولی کے ذریعہ مسئلہ حل کرنے سے واقف ہے۔ مگر اب اس کے لیے اس تدبیر کو استعمال کرنے کا موقع نہیں۔

اس صورت حال کی ایک تقابلی مثال یہ ہے کہ انگریز ایک تازہ دم قوم کی حیثیت سے ہندستان

یں داخل ہوئے اور اٹھارویں صدی کے آخر تک انھوں نے اپنی برتر طاقت کے ذریعہ برصغیر ہند کے بڑے حصہ پر قبضہ کرلیا۔ تمام ظاہری حالات کے مطابق، حیدرآباد کا نظام اور میسور کا ٹیپو دونوں "پوزیشن آف ماڈسٹی" کے درجہ میں پہونچا دیے گیے۔

اس وقت نظام نے حقیقت پسندی سے کام لیا۔ انھوں نے اپنی واقعی حیثیت کا اعتراف کرتے ہوئے انگریزوں سے صلح کرلی۔ ٹیپو نے اس کے برعکس روش اختیار کی۔ انھوں نے اپنی واقعی حیثیت کو ماننے سے انکار کیا۔ ناقابل عبور نابرابری کے باوجود وہ انگریزوں سے لڑگیے۔ گویا حیدرآباد کے نظام نے پوزیشن آف ماڈسٹی سے اپنے نئے دور کا آغاز کیا۔ اور میسور کے ٹیپو نے، غیر حکیمانہ طور پر پوزیشن آف اسٹرنتھ سے اپنے لیے آغاز کار کا فیصلہ کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نظام اور اس کی ریاست باقی رہی۔ اور ٹیپو اور ان کی سلطنت کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہوگیا۔

نظام حیدرآباد کے اس فیصلہ سے مسلمانوں کو بے شمار فائدے حاصل ہوئے۔ وہ اس حیثیت میں باقی رہے کہ وہ ہزاروں مسجدوں اور مدرسوں اور اسلامی اداروں کو دوسو سال تک مالی تعاون دے سکیں۔ پورے ملک کا بہترین مسلم ذہن حیدرآباد میں جمع ہوگیا جس نے بڑے بڑے کام کیے۔ نظام نے یونیورسٹی اور کالج اور اسکول قائم کیے جس میں لاکھوں مسلمانوں نے تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۴۷ کے انقلاب کے بعد اسی تعلیم کی بدولت حیدرآباد کے مسلمان ملک کے اندر اور ملک کے باہر ازسرِنو باعزّت زندگی حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیے۔ وغیرہ، وغیرہ۔

اس کے برعکس ٹیپو کے جنگی اقدام نے مسلمانوں کو اس قسم کا کوئی فائدہ نہیں دیا۔ البتہ سطحی قسم کے شاعروں اور ادیبوں کو کچھ الفاظ مل گیے جن پر مضمون بندی کرکے وہ مسلمانوں کو خیالی شراب پلاتے رہیں۔

فرق کیا ہے

مغربی قومیں جب اسلام پر غالب آئیں تو ہمارے ابتدائی رہنماؤں سے ایک اجتہادی غلطی ہوئی۔ انھوں نے مغربی قوموں کے غلبہ کو سادہ طور پر ایک قوم کے اوپر دوسری قوم کی جارحیت کا مسئلہ سمجھا۔ حالاں کہ یہ ایک قوم کے اوپر دوسری قوم کے تفوق کا مسئلہ تھا۔ مغربی قومیں علوم کے تمام شعبوں میں مسلمانوں سے فائق ہوگئی تھیں۔ اسی فوقیت کی بنا پر ان کو یہ موقع ملا کہ وہ مسلم قوموں کے اوپر غالب آجائیں

جو علم کی دوڑ میں زمانہ سے پچھڑ گیے تھے۔

مغرب نے ادب کو نئی سائنٹفک زبان دی اور اس کو شاعری کے محدود میدان سے نکال کر نثر کے لامحدود میدان میں پہونچا دیا۔ وہ ادب کو سخن آفرینی کے دور سے نکال کر حقیقت بیانی کے دور میں لے آئے۔ مغرب نے طبیعیات اور فلکیات میں نئے نئے حقائق دریافت کیے، اس طرح انھوں نے علوم کائنات کو قیاسی نظریات کے دور سے نکال کر مشاہداتی نظریات کے دور میں پہونچا دیا۔ انھوں نے انسان کو ذہنی بندشوں کے دور سے نکال کر آزادانہ تحقیق کے دور میں پہونچایا۔

مغرب نے اسٹیم دریافت کیا اور اس کے ذریعہ وہ انسانی تاریخ کو دستکاری کے دور سے نکال کر مشینی دور میں لے آئے۔ انھوں نے جدید قسم کی بندوق اور رائفل بنائی۔ اس طرح انھوں نے جنگ کو دستی ہتھیاروں کے دور سے نکال کر دور مار ہتھیاروں کے دور میں داخل کر دیا۔ انھوں نے ریل، ٹیلی گرام، دخانی جہاز جیسی چیزیں ایجاد کیں اور مواصلات (کمیونی کیشن) کو حیوانی ترسیل کے دور سے نکال کر مشینی ترسیل کے دور میں پہونچا دیا۔ وغیرہ۔

اس قسم کی دریافتوں نے مغربی قوموں کو نیا حوصلہ دیا۔ جب کہ مسلم قومیں اپنے جمود اور تنزل کی بنا پر نئے حوصلہ سے خالی ہو چکی تھیں۔ معلومات کے اضافہ نے مغربی قوموں کو اس پوزیشن پر پہونچا دیا کہ وہ زیادہ بہتر منصوبہ بندی کر سکیں۔ نئی نئی قوتوں نے مغرب کو اس قابل بنایا کہ وہ زیادہ موثر انداز میں دوسروں کے اوپر اقدام کر سکیں۔ جب کہ مسلم قومیں نئی چیزوں سے محرومی کی بنا پر نئے اقدامات کو سمجھنے کی حیثیت میں بھی نہ تھیں۔

ان حالات میں مغرب کے غلبہ کا مسئلہ حقیقۃً عداوت کا مسئلہ نہ تھا بلکہ فوقیت کا مسئلہ تھا۔ اس اعتبار سے ہمارے رہنماؤں کو اپنی ساری توجہ از سر نو تیاری میں لگا دینا چاہیے تھا۔ مگر انھوں نے اجتہادی غلطی کی بنا پر ساری توجہ ٹکراؤ کے محاذ پر لگا دی جس کو انھوں نے جہاد بتایا۔

ہمارے رہنماؤں کے لیے وقت آگیا تھا کہ وہ پوزیشن آف ماڈسٹی (حالتِ فروتنی) سے اسٹارٹ لیں مگر انھوں نے پوزیشن آف اسٹرینتھ (حالتِ طاقت) سے اسٹارٹ لیا۔ یہ ہلاکت خیز حد تک غلط اندازہ تھا۔ چنانچہ اس کا نتیجہ بھی ہلاکت کے سوا کسی اور شکل میں برآمد نہ ہو سکا۔

صبر و اعراض

الرسالہ میں مسلمانوں کو یہ نصیحت کی جارہی ہے کہ وہ ہندو مسلم نزاعات میں صبر و اعراض کی پالیسی اختیار کریں۔ مگر اکثر مسلمان اس نصیحت کو سن کر برہم ہو جاتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اس طرح ان کو بزدلی اور پسپائی کا سبق دیا جارہا ہے۔ اس کے برعکس جو مسلم رہنما مسلمانوں کے سامنے جہاد اور ٹکراؤ کی بات کرتے ہیں، ان کی باتیں مسلمانوں کو خوب پسند آتی ہیں۔ وہ ان مسلم رہنماؤں کے گرد جوق درجوق اکٹھا ہو جاتے ہیں۔

مسلمانوں کے اس مختلف ردعمل کا سبب ان کی مذکورہ نفسیات ہے۔ وہ اپنے موجودہ مزاج کی بنا پر اپنے لیے صرف حالتِ غلبہ سے واقف ہیں۔ وہ اپنے حق میں حالتِ فروتنی سے واقف نہیں۔ اس مزاج کی بنا پر ہجوم اور اقدام کی بات انھیں اپنی حیثیت کے برابر دکھائی دیتی ہے اور صبر و اعراض کی بات انھیں اپنی حیثیت سے کم تر نظر آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دوسروں کی جوش و خروش والی باتوں میں ان کے لیے اپیل ہے، مگر الرسالہ کی سنجیدہ باتوں میں ان کے لیے اپیل نہیں۔ وہ جوشِ جہاد کے تحت بار بار اقدام کرتے ہیں جو یک طرفہ ہلاکت پر ختم ہوتا ہے۔ صبر و تحمل والے طریقہ میں ان کی کامیابی یقینی ہے مگر صبر و تحمل والا طریقہ اختیار کرنے پر وہ راضی نہیں۔

پیغمبر اسلام صلے اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور دوسرے پیغمبروں کے احوال اس معاملہ میں نہایت واضح طور پر ہماری رہنمائی کرتے ہیں۔ جو شخص بھی کھلے ذہن کے تحت ان کا مطالعہ کرے گا وہ اس معاملہ میں کسی دوسری رائے پر نہیں پہونچ سکتا۔

بنی اسرائیل کی مثال

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا زمانہ چودھویں اور تیرھویں صدی قبل مسیح ہے۔ وہ مصر میں یہودیوں کے درمیان پیدا ہوئے۔ یہ یہودی اس وقت کے گویا مسلمان تھے۔ ان کی تعداد مصر میں غالباً ایک ملین سے زیادہ تھی۔ اس زمانہ میں مصر کا مشرک بادشاہ فرعون یہودیوں کے اوپر بہت ظلم کرتا تھا۔ قرآن کے مطابق، یہود نے حضرت موسیٰ سے شکایت کی کہ فرعون ہمارے اوپر ظلم و زیادتی کر رہا ہے۔ ہم اس ظلم کو ختم کرنے کے لیے کیا کریں۔ حضرت موسیٰؑ نے کہا کہ اللہ سے مدد چاہو اور صبر کرو (الاعراف ۱۲۸)
دوسری جگہ بتایا گیا ہے کہ حضرت موسیٰ کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے یہود کو یہ ہدایت دی کہ تم لوگ مصر

یں کچھ گھر مقرر کرلو اور اپنے ان گھروں کو قبلہ بنالو اور نماز قائم کرو (یونس ۸۷)

یہود نے اپنی بستیوں میں عبادت خانے بنا رکھے تھے جہاں وہ عبادت کرتے تھے۔ لیکن فرعون نے یا تو ان عبادت خانوں کو ڈھا دیا یا ان میں جاکر عبادت کرنے سے روک دیا۔ اس وقت یہود سے کہا گیا کہ تم اپنے گھروں میں خاموشی سے نماز پڑھ لیا کرو تاکہ تم امن میں رہو (المراد صلّوا فی بیوتکم سرا لتأمنوا۔ و ذٰلك حين اخافهم فرعون فامروا بالصبر واتخاذ المساجد فی البیوت و الإقدام على الصلاة والدعاء الى ان ينجز الله وعده) الجامع لاحکام القرآن ۸/ ۲۷۔۳۷۱

اس واقعہ پر غور کیجئے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہود کی نگاہ صرف ظالم کے ظلم پر تھی۔ اس کے برعکس حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نگاہ ظالم کے ظلم کے باوجود امکانی مواقع پر تھی۔ یہود سمجھتے تھے کہ ان کا مسئلہ اس وقت ختم ہوگا جب کہ فرعون ختم ہو۔ اس کے برعکس حضرت موسیٰ نے وحی الٰہی کی روشنی میں یہ دیکھا کہ فرعون کی موجودگی میں بھی ایک دائرۂ کار ہے جہاں ہم کو اپنے دین کی اقامت کا موقع حاصل ہے۔

اس کے مطابق حضرت موسیٰ نے یہود کو نصیحت کی کہ تم فرعون کی روش پر صبر کرتے ہوئے اپنے گھروں کو عبادت خانہ بنالو۔ فرعون کی طرف سے نظریں ہٹاکر اللہ کی طرف اپنی ساری توجہ لگا دو۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ مسائل پر محنت کرنے کے بجائے مواقع پر محنت کرو۔ غیر حاصل شدہ میدان کار کے لیے فریاد نہ کرو، بلکہ حاصل شدہ میدان کار کو استعمال کرنے میں لگ جاؤ۔

مکی دور، مدنی دور

پیغمبر اسلام صلے اللہ علیہ وسلم کی مثال سے بھی یہی بات معلوم ہوتی ہے۔ آپ کی زندگی کا ایک ابتدائی دور ہے جس کو مکی دور کہا جاتا ہے۔ آپ کی زندگی کا دوسرا دور وہ ہے جس کو مدنی دور کہا جاتا ہے۔ مکی دور میں یہ صورت حال تھی کہ ایک طرف دار الندوہ پر قریش کا مکمل قبضہ تھا۔ کعبہ میں ۳۶۰ بت رکھے ہوئے تھے۔ حج کی عبادت کو انھوں نے غلط طور پر شمسی کیلنڈر کے مطابق جاری کر دیا تھا۔ سود اور شراب جیسی حرام چیزیں سماج میں عام طور رائج تھیں، وغیرہ۔ یہ تمام چیزیں سراسر اسلام کے خلاف تھیں۔ مگر ابتدائی تقریباً ۱۳ سال تک رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ان

چیزوں یں کوئی دخل نہیں دیا۔ اس قسم کی تمام ناخوش گوار چیزوں میں کامل صبر کا طریقہ اختیار کرتے ہوئے اپنے آپ کو صرف عقیدہ کی پر امن دعوت تک محدود رکھا۔ ابتدائی کئی سال تک آپ اور دوسرے اہلِ ایمان چھپ کر نماز پڑھتے تھے۔ وہ بیت اللہ کے بجائے اپنے گھروں میں نماز ادا کرتے تھے۔

مکہ کی مذکورہ برائیوں میں مداخلت کرنا براہِ راست قریش کی قیادت اور ان کے مفادات سے ٹکرانے کے ہم معنی تھا۔ اس کے حالات مکی دور میں موجود نہ تھے۔ البتہ عقیدہ کی پر امن تبلیغ اور خاموش عبادت کے میدان میں آپ کے لیے کام کا موقع موجود تھا۔ چنانچہ آپ نے قریش سے عملی ٹکراؤ والے میدان کو چھوڑ کر اسی ممکن دائرۂ کار میں اپنے آپ کو اور دوسرے اہل ایمان کو مصروف کر دیا۔

مدنی دور میں صورت حال بدل گئی۔ اب قریش نے جارحیت کر کے براہ راست جنگ و قتال کا محاذ کھول دیا۔ یہ ایک مشکل مسئلہ تھا۔ کیوں کہ اس کی وجہ سے دعوتی کام کے مواقع شدت سے مجروح ہو گیے۔ اس وقت چند ناگزیر ٹکراؤ کے بعد آپ نے وہ تدبیر اختیار فرمائی جس کو اسلام کی تاریخ میں صلح حدیبیہ کہا جاتا ہے۔

صلح حدیبیہ یا حدیبیہ پرنسپل کا مطلب یہ ہے کہ فریق ثانی کی ضد (حمیت جاہلیہ) سے یک طرفہ طور پر اعراض کرتے ہوئے اپنے لیے مواقع کار حاصل کرنا۔ مکی دور میں جو فرصت عمل خاموش تقسیم کے ذریعہ حاصل ہوئی تھی، اس تقسیم کو دوبارہ معاہدۂ حدیبیہ کے ذریعہ فریق ثانی کی باقاعدہ رضامندی کے ذریعہ ممکن بنایا گیا۔

ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ فریق ثانی کچھ چیزوں کو اپنے لیے قومی وقار کا مسئلہ بنا لیتا ہے۔ کچھ چیزوں کے لیے وہ سمجھ لیتا ہے کہ وہ اس کے سیاسی مفاد کے تحفظ کے لیے ضروری ہیں۔ حدیبیہ پرنسپل یہ ہے کہ ایسی چیزوں سے اپنی توجہ کو اس حد تک ہٹا لیا جائے کہ فریق ثانی یہ سمجھنے لگے کہ اس کے سیاسی مفادات محفوظ ہیں اور اس کے قومی وقار کو ٹھیس نہیں پہونچ رہی ہے۔ فریق ثانی کو یہ اطمینان دلا کر اپنے لیے دعوتی مواقع حاصل کرنے کا دوسرا نام حدیبیہ پرنسپل ہے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اسی اصول کو اختیار کر کے مدنی دور میں دوبارہ اپنے لیے دعوت کے مواقع حاصل کیے۔

حدیبیہ پرنسپل، حدیبیہ جیسے حالات میں از سرِ نو آغازِ کار کو پانے کی تدبیر ہے۔ یہ تدبیر اتنی کارگر ہے کہ اس کو اگر صحیح طور پر اختیار کیا جائے تو وہ فتح مبین کے سوا کہیں اور پہونچانے والی نہیں۔

میں نے شرق اوسط کے ایک عربی جریدہ میں ایک عرب عالم کا مضمون پڑھا۔ اس مضمون کا عنوان تھا: اَلجھادُ ھوالحلُّ الوحیدُ (جہاد ہی واحد حل ہے) مضمون میں بتایا گیا تھا کہ مسلم دنیا اس وقت جن سنگین مسائل سے دوچار ہے اس کا حل صرف یہ ہے کہ امت سربکف ہو کر جہاد اور مقابلہ کے لیے کھڑی ہو جائے۔

میں نے اس مضمون کو پڑھا تو میں نے کہا کہ مسلمانوں کے موجودہ حالات کے اعتبار سے یہ صحیح نہیں کہ ان کو الجہاد ہو الحل الوحید کا نعرہ دیا جائے۔ اس وقت صحیح بات یہ ہے کہ امت کو الاعداد ہُو الحل الوحید (تیاری ہی واحد حل ہے) کا پیغام دیا جائے۔ جہاد بلاشبہ اسلام کا ایک رکن ہے۔ مگر جہاد تیاری کے بعد ہوتا ہے نہ کہ تیاری سے پہلے۔

مذکورہ عربی مضمون اس سلسلہ میں کوئی منفرد مثال نہیں۔ آج کل مختلف الفاظ میں عام طور پر یہی بات کہی جاتی ہے۔ ہر لکھنے اور بولنے والا امت کو جہاد و قتال کے میدان میں کھڑا ہونے کے لیے ابھار رہا ہے۔ اس قسم کی باتیں بظاہر اس مفروضہ پر کہی جاتی ہیں کہ امت نے ابھی جہاد کے میدان میں قدم نہیں رکھا ہے۔ اور ضرورت ہے کہ اس کو جہاد کے میدان میں اتارا جائے۔

مگر یہ بات درست نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ پچھلے تقریباً تین سو سال سے ملتِ اسلام کا بیشتر حصہ جہاد ہی میں مبتلا ہے۔ جو بات ہے وہ یہ کہ جہاد کا نتیجہ برآمد نہیں ہو رہا ہے، نہ کہ جہاد نہیں ہو رہا ہے۔ مؤذنینِ جہاد نے فقدانِ نتیجہ جہاد کو فقدانِ جہاد کے ہم معنی سمجھ لیا ہے۔ اصل یہ ہے کہ جہاد تو بہت بڑے پیمانہ پر جاری ہے۔ لاکھوں لوگوں کی شہادت کی خبریں اخباروں میں چھپ رہی ہیں۔ مگر صدیوں کے جہاد کے باوجود اس کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہو رہا ہے۔ اس لیے اب اصل مسئلہ جہاد کو روک کر دوسری تدبیر اختیار کرنے کا ہے، جس طرح رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے حدیبیہ میں جہاد کو روک کر دوسری تدبیر اختیار فرمائی۔

جہاد کا یہ ذہن ہندستان میں بھی پوری طرح پایا جاتا ہے۔ ہندستان کے ایک بڑے شہر میں دسمبر ۱۹۹۱ میں ایک "عظیم الشان مسلم کانفرنس" ہوئی۔ اس کانفرنس کا عنوان تھا: اقدامِ امت کانفرنس۔ اس کانفرنس کے کچھ ذمہ دار حضرات مجھ سے ملے۔ میں نے کہا کہ آپ کو اگر کانفرنس کرنا ہے تو "تیاریٔ امت کانفرنس" کیجئے۔ اقدامِ امت کانفرنس کا اس وقت کوئی موقع نہیں۔ کیوں کہ امت اس وقت ہر اعتبار سے تیاری کے مرحلہ میں ہے۔ اور جو گروہ تیاری کے مرحلہ میں ہو اس کا اقدام کی باتیں کرنا سراسر بےمعنی ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی کسان بیج ڈالنے کے موسم میں فصل کاٹنے کی تقریب منانے لگے۔

فرصتِ عمل

زندگی میں اصل اہمیت فرصتِ عمل کی ہے ۔ فرصتِ عمل کو استعمال کرنے ہی کا نام عمل ہے ۔ فرصت عمل یا مواقع عمل کو استعمال کرکے ہی کوئی فرد یا کوئی مجموعۂ افراد ترقی کی منزل تک پہونچتا ہے ۔ اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ اس دنیا میں ترقی اور کامیابی کا نہیں ۔

تاہم اس دنیا کے لیے خدا کا قانون یہ ہے کہ یہاں یُسر کے ساتھ عُسر بھی ہمیشہ موجود رہے ۔ چنانچہ یہاں فرصتِ عمل کے ساتھ موانع عمل بھی ساتھ ساتھ پائے جاتے ہیں ۔ اس لیے یہاں فرصتِ عمل کو استعمال کرنے کے لیے صبر لازمی طور پر ضروری ہے ۔ یعنی جو چیز بروقت قابلِ حصول نہیں ہے اس سے محرومی کو برداشت کرتے ہوئے قابلِ حصول پر قناعت کرنا اور اس کو حاصل کرنے کے لیے ہمہ تن مصروف ہوجانا ۔ اس صبر کے بغیر آدمی یہاں پانے والی چیز کو بھی نہیں پاسکتا ۔ ناممکن پر وقتی صبر کرنے کے بعد ہی ایسا ہوتا ہے کہ آدمی ممکن کو حاصل کرنے میں اپنی ساری طاقت لگا سکے ۔ اس دنیا میں کچھ چیزوں کو صبر کے خانہ میں ڈالنا ہے اور کچھ چیزوں کو عمل کے خانہ میں ۔ اسی کا نام حکمتِ کار ہے ۔ اگر آپ ایسا کریں کہ جس چیز کو صبر کے خانہ میں ڈالنا ہے اس کو عمل کے خانہ میں ڈال دیں تو آپ کبھی کامیابی کی منزل تک نہیں پہونچ سکتے ۔

جیسا کہ عرض کیا گیا ، اس فرصتِ عمل کو پانے کی دو صورتیں ہیں ۔ اور دونوں کی نہایت اعلیٰ مثالیں اسلام کی دور اوّل کی تاریخ میں پائی جاتی ہیں ۔ پہلی صورت کی واضح مثال مکی دور میں ہے اور دوسری صورت کی واضح مثال مدنی دور میں ۔

باب سوم

مسائلِ ملّت

مسلمانوں کے موجودہ مسائل کا قرآنی حل ـــــ یہ وہ موضوع ہے جس پر مجھے ان صفحات میں اظہارِ خیال کرنا ہے۔ یہ سوال بظاہر ایک سادہ سا سوال معلوم ہوتا ہے۔ مگر نظری اعتبار سے سادہ ہونے کے باوجود، عملی اعتبار سے وہ سادہ سوال نہیں۔ قرآن میں اگرچہ اس کا واضح جواب موجود ہے، مگر اس جواب کو پانا اور اس کو اختیار کرنا بلا شبہ ایک نہایت پیچیدہ مسئلہ ہے۔

" آج کون سی تاریخ ہے" اس سوال کا جواب معلوم کرنا ہو تو ہر شخص اس کو نہایت آسانی کے ساتھ جان لے گا۔ اگر آپ کو معلوم ہو کہ آج سنیچر کا دن ہے اور فروری کا مہینہ، تو اپنی دیوار کا کلنڈر دیکھ کر آپ نہایت آسانی کے ساتھ جان لیں گے کہ آج کیا تاریخ ہے۔ آپ کلنڈر میں فروری کا صفحہ کھولیں گے اور پھر سنیچر کے خانہ میں دیکھیں گے تو آپ کو فوراً معلوم ہو جائے گا کہ آج فروری ۱۹۹۰ کی دس تاریخ ہے

مگر قرآن سے اس طرح ٹکنیکل انداز میں مذکورہ سوال کا جواب معلوم کرنا ممکن نہیں۔ آپ کے پاس پورا قرآن موجود ہو۔ آپ عربی زبان جانتے ہوں، حتی کہ آپ کسی مدرسہ میں شیخ التفسیر کے عہدے پر فائز ہوں تب بھی یہ پیچیدگی بدستور باقی رہے گی۔

اس کی وجہ کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کلنڈر سے تاریخ نکالنے کا معاملہ صرف ایک فنی معاملہ ہے۔ مگر مسلمانوں کے مسائل کا قرآنی حل جاننے کا معاملہ، اسی کے ساتھ امتحان کا معاملہ بھی ہے۔ اس کا امتحان کا معاملہ ہونا اس کو انتہائی آسان ہونے کے باوجود، انتہائی مشکل بنا دیتا ہے۔

سنّتِ امتحان

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ انسان کی پیدائش کا مقصد امتحان ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کر کے موجودہ دنیا میں اس لئے رکھا ہے کہ اس کا امتحان لے (الملك ٢) موجودہ دنیا کی تمام چیزیں اسی مقصدِ حیات کے مطابق بنائی گئی ہیں۔ اسی کا ایک پہلو یہ ہے کہ ہر ہدایت کے ساتھ ہمیشہ ایک شبہہ کا عنصر (element to doubt) موجود رہتا ہے۔ تاکہ آدمی کا امتحان لیا جائے کہ وہ خدا کی دی ہوئی عقل سے شبہ کا پردہ پھاڑتا ہے یا نہیں۔ اس دنیا میں ہدایت صرف اس شخص کو ملتی ہے جو شبہہ

کے پردہ کو پھاڑ کر سچائی کو اس کی بے حجاب صورت میں دیکھ سکے۔ جو شخص اس امتحان میں پورا نہ اترے اس کو موجودہ دنیا میں کبھی ہدایت نہیں ملے گی۔

اس سلسلہ میں قرآن کی ایک آیت پر غور کیجئے:

وہ کہتے ہیں کہ پیغمبر پر کوئی فرشتہ کیوں نہیں اتارا گیا۔ اور اگر ہم فرشتہ اتاریں تو پھر معاملہ کا فیصلہ ہو جائے۔ اس کے بعد انھیں کوئی مہلت نہ ملے۔ اور اگر ہم کسی فرشتہ کو پیغمبر بنا کر بھیجتے تب بھی اس کو آدمی ہی کی صورت میں بھیجتے۔ اور لوگوں کو اسی شبہ میں ڈال دیتے جس شبہ میں وہ اب مبتلا ہو رہے ہیں (الانعام ۹)

اس سے معلوم ہوا کہ خدا کی ہدایت کبھی اس طرح برہنہ صورت میں نہیں آتی کہ آدمی کے لئے اس میں کچھ بولنے کی گنجائش ہی باقی نہ رہے۔ فرشتہ اگر اپنی اصل صورت میں خدا کا پیغام لے کر ظاہر ہو جائے تو کون ہوگا جو اس کے نمائندۂ خدا ہونے پر شبہ کرے۔ اس لئے خدا اپنے پیغام کی پیغام رسانی کا کام انسانوں میں سے کسی انسان کے ذریعہ کرتا ہے تاکہ پیغام کی سچائی کے باوجود اس میں شبہہ کا ایک پہلو باقی رہے۔

یہی اس دنیا کے لئے خدا کا قانون ہے۔ یہاں جب بھی ہدایت ظاہر ہوتی ہے، اس میں شبہ کا ایک پہلو بھی ضرور شامل رہتا ہے۔ یہی آدمی کا امتحان ہے۔ آدمی کو یہاں شبہ کے پردے کو پھاڑنا پڑتا ہے۔ جو آدمی شبہ کے پردے کو پھاڑ دے، وہ ہدایت کو اس کی برہنہ صورت میں دیکھ لے گا اور جو آدمی شبہ کے اس پردے کو پھاڑنے میں ناکام رہے، وہ ہدایت کو پانے میں بھی ناکام رہے گا۔

اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے اندر بصیرت کی صلاحیت رکھ دی ہے۔ یہ بصیرت گویا ایک قسم کی خدائی کسوٹی ہے۔ جو لوگ خدا کی دی ہوئی بصیرت کو بے آمیز روپ میں استعمال کریں، وہ اس امتحان میں کامیاب ہوتے ہیں۔ اور جو لوگ اس بصیرت کو بے آمیز روپ میں استعمال نہ کر سکیں وہ ناکام ہو کر رہ جاتے ہیں۔

مسائل کے قرآنی حل کو پہچاننے میں سب سے بڑی رکاوٹ یہی ہے۔ کیوں کہ جب بھی قرآن کے حوالہ سے اس کا بتایا ہوا حل پیش کیا جاتا ہے، تو خواہ وہ کتنا ہی مدلل اور مُبرہن ہو، اس میں شبہ

کا ایک پہلو ہمیشہ موجود رہتا ہے۔ چنانچہ اکثر لوگ اس شبہ والے پہلو میں اٹک کر رہ جاتے ہیں۔ ہدایت کے واضح ہونے کے باوجود وہ اس کو اپنی زندگی میں اختیار نہیں کر پاتے۔

دورِ اوّل کی مثال

اس سلسلہ میں ایک مثال لیجئے۔ قدیم مکہ میں ایک شخص تھا۔ اس کا نام روایات میں الحارث بن عثمان بن نوفل بن عبد مناف بتایا گیا ہے۔ اس کے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب توحید کی دعوت پیش کی تو اس نے اپنی قوم کی نمائندگی کرتے ہوئے آپ سے کہا:

انا لنعلم ان الذی تقول حق ولکنا ان اتبعناك خفنا ان تخرجنا العرب من ارض مكة (التفسیر المظہری ۷/۱۷۴)	ہم جانتے ہیں کہ آپ جو کچھ کہتے ہیں وہ بلاشبہ حق ہے۔ لیکن اگر ہم آپ کی پیروی کریں تو ہم کو ڈر ہے کہ عرب ہم کو مکہ کی سرزمین سے نکال دیں گے۔

شان نزول کی روایات کے مطابق، قرآن کی سورہ نمبر ۲۸ میں اس کا جواب دیا گیا ہے۔ ارشاد ہوا ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ اگر ہم آپ کے ساتھ اس ہدایت کی پیروی کریں تو ہم کو ڈر ہے کہ ہم کو ہماری زمین سے اُچک لیا جائے گا (وَقَالُوٓا اِنْ نَّتَّبِعِ الْهُدٰى مَعَكَ نُتَخَطَّفْ مِنْ اَرْضِنَا، القصص ۵۷)

قدیم مکہ میں وہاں کے لوگوں کی سرداری اور معاش دونوں کا خاص ذریعہ شرک تھا۔ انھوں نے یہ کیا تھا کہ مکہ کے تمام قبیلوں کا بت کعبہ میں رکھ دیا تھا۔ چنانچہ کعبہ میں ۳۶۰ مختلف بت جمع ہوگئے تھے۔ اس طرح مکہ کے لوگوں کو عرب کے تمام قبیلوں کی سرداری حاصل ہوگئی تھی۔ اسی کے ساتھ ان کو یہ معاشی فائدہ بھی تھا کہ عرب کے مختلف قبیلے اپنے اپنے بتوں پر نذر چڑھانے کے لئے مکہ آتے تھے۔ یہ تمام نذرانے مکہ والوں کو ملتے تھے۔ اس طرح شرک مکہ والوں کے لئے بیک وقت قیادت کا ذریعہ بھی تھا اور معاشیات کے حصول کا ذریعہ بھی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ایک خدا کا پیغام ان کے سامنے پیش کیا تو ان کی فطرت نے اس کے برحق ہونے کی تصدیق کی۔ مگر ان کا ذہن اس سوال میں اٹک گیا کہ اگر وہ یہ کہیں کہ خدا صرف ایک ہے۔ بقیہ تمام دیوتا فرضی ہیں، تو وہ اچانک تمام مشرک قبائل سے کٹ جائیں گے۔ اس کے بعد ان کی سرداری بھی ان سے چھن جائے گی اور ان کی معاش بھی۔ ہدایت کے واضح ہونے کے باوجود ایک شبہ ان کے لئے قبولیت کی راہ میں رکاوٹ بن گیا۔

ہندستانی مسلمان

ہندستانی مسلمانوں کا حال بھی موجودہ زمانہ میں یہی ہو رہا ہے۔ مختلف شبہات کی بنا پر وہ قرآن سے رہنمائی لینے میں ناکام ثابت ہوئے ہیں۔ ان کے سامنے جب قرآن کی بات رکھی جاتی ہے تو وہ محسوس کرتے ہیں کہ قرآنی تعلیمات کے مطابق یہی بات درست ہے۔ مگر فوراً ہی کچھ سوالات سامنے آکر انھیں اس کی طرف سے شبہ میں ڈال دیتے ہیں۔ وہ اپنے شبہات کی بنا پر قرآن کو اپنانے میں ناکام ثابت ہوتے ہیں۔

مثلاً جب ان کے سامنے صبر و اعراض کی آیتیں پیش کی جائیں تو وہ اس شبہہ میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ اگر ہم قومی معاملات میں صبر و اعراض کا طریقہ اختیار کریں تو ہندو ہمارے اوپر دلیر ہو جائے گا۔ جب ان کے سامنے قرآن کا دعوتی اور تعمیری پیغام رکھا جائے تو انھیں یہ شبہ لاحق ہوجاتا ہے کہ اگر ہم سیاست کی مہم نہ چلائیں تو ہم ملک میں ہونے والے سیاسی عمل سے کٹ جائیں گے۔ اگر ان سے یہ کہا جائے کہ ہندو تمہارے لئے مدعو کا درجہ رکھتے ہیں اور مدعو سے مطالبہ اور احتجاج کو قرآن میں منع کیا گیا ہے، تو فوراً وہ یہ شبہ پیش کر دیں گے کہ اگر ہم مطالبہ اور احتجاج کا طریقہ چھوڑ دیں تو اس ملک میں ہم اپنے دستوری حقوق سے محروم ہو کر رہ جائیں گے۔ وغیرہ۔

آج کے سوال کے بارہ میں اصل مشکل یہی ہے۔ قرآن بلاشبہ ایک کامل اور مفصل کتاب ہے۔ اس میں قیامت تک پیش آنے والے تمام سوالات کا واضح جواب موجود ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ کی سنت التباس (الانعام ۹) کی بنا پر ان تمام جوابات میں شبہ کا ایک عنصر بھی لازمی طور پر شامل ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں آج کا مسلمان جانچ کی میزان پر کھڑا ہوا ہے۔ اگر وہ شبہ کا پردہ پھاڑ کر قرآن کی طرف بڑھے تو وہ یقیناً اپنے مسائل کا قرآنی حل پالے گا۔ اور اگر وہ شبہ کی بات میں اٹک جائے تو کوئی بھی آیت یا کوئی بھی حدیث اس کو رہنمائی دینے کے لئے کافی ثابت نہیں ہوگی۔

اب میں مسلمانوں کے موجودہ مسائل کے قرآنی حل پر کلام کروں گا۔ اس سلسلہ میں میری گفتگو کے تین حصے ہوں گے۔ اور ہر حصہ کی بنیاد قرآن کی ایک واضح آیت پر ہوگی۔

تحفظ کا مسئلہ

ہندستان کے مسلمانوں، خاص طور پر شمالی ہند کے مسلمانوں، کے نزدیک ان کا نمبر ایک

مسئلہ جان و مال کے تحفظ کا مسئلہ ہے۔ وہ سب سے زیادہ اسی مسئلہ پر سوچتے ہیں۔ ان کی سرگرمیاں سب سے زیادہ اسی سوال پر مرتکز رہتی ہیں۔ اس سوال کو ذہن میں رکھ کر اگر ہم قرآن کو پڑھنا شروع کریں تو اس کو پڑھتے ہوئے ہم سورۂ المائدہ کی اس آیت (نمبر ۶۷) پر پہنچیں گے جس میں تحفظ کے مسئلہ کا جواب نہایت واضح اور غیر مبہم انداز میں موجود ہے۔ وہ آیت یہ ہے:

یاایها الرّسول بلّغ ما انزل الیك من ربّك وان لم تفعل فما بلّغت رسالته والله یعصمك من الناس ان الله لا یهدی القوم الکفرین	اے پیغمبر، جو کچھ تمہارے اوپر تمہارے رب کی طرف سے اترا ہے اس کو پہنچا دو۔ اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو تم نے اللہ کے پیغام کو نہیں پہنچایا۔ اور اللہ تم کو لوگوں سے بچائے گا۔ اللہ یقیناً منکر لوگوں کو راہ نہیں دکھاتا۔

اس آیت پر غور کیجئے۔ اس میں عبارت النص کی سطح پر یہ بات نکل رہی ہے کہ عصمت من الناس کا راز دعوت الی اللہ میں چھپا ہوا ہے۔ جب بھی مسلمانوں کو محسوس ہو کہ ان کے لئے غیر اقوام کی طرف سے تحفظ کا مسئلہ پیدا ہو گیا ہے تو انہیں فوراً دعوت الی اللہ کے کام میں مشغول ہو جانا چاہئے اور اس کو اس کے تمام ضروری آداب کے ساتھ جاری رکھنا چاہئے۔ یہی تحفظ کے مسئلہ کا سب سے زیادہ یقینی حل ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ جب کوئی قوم مسلمانوں کے ساتھ دشمنی کرتی ہے تو عین اس وقت بھی اس کے لئے ممکن نہیں ہوتا کہ وہ اپنے اندر خدا کی پیدا کی ہوئی فطرت کو بدل دے۔ یہ فطرت پیدائشی طور پر اسلام کی طالب ہوتی ہے۔ ہر آدمی اپنی ابتدائی فطرت کے اعتبار سے دین اسلام پر پیدا کیا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کا ہر دشمن امکانی طور پر ان کا دوست ہوتا ہے۔ کیونکہ اگر اس کی سوئی ہوئی فطرت کو جگا دیا جائے تو وہ اسلام قبول کر لے گا۔ اور جب وہ اسلام قبول کر لے گا تو وہ بھی مسلمانوں کی ملت میں شامل ہو کر ان کا جزء بن جائے گا۔ اور اس کے بعد مسلمانوں کا مسئلہ اپنے آپ ختم ہو جائے گا۔

تاریخ نے بار بار قرآن کے اس اصول کی تصدیق کی ہے۔ دور اول میں عرب کے مشرکین نے ابتداءً رسول اللہ کی سخت مخالفت کی مگر آپ ان کی مخالفت کو نظر انداز کرتے ہوئے صبر اور حکمت

کے ساتھ انھیں اسلام کی دعوت دیتے رہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صرف بیس سال کے مختصر عرصہ میں تمام عرب قبیلوں نے اسلام قبول کر لیا۔ جو لوگ بظاہر آپ کے دشمن تھے، وہ آپ کے دوست اور ساتھی بن گئے۔ اسلام کے سپاہی بن کر انھوں نے اسلام کی عالمی تاریخ بنائی۔

۱۳ ویں صدی عیسوی میں تاتاری قبائل ایک وحشی طوفان بن کر اٹھے اور انھوں نے سمرقند سے لے کر بغداد تک مسلمانوں کے تمام ملی نشانات کو مٹا ڈالا۔ بغداد کی عباسی خلافت ان کی فوج یلغار کی تاب نہ لا کر ختم ہو گئی۔

مگر اس کے بعد کیا ہوا۔ مسلمانوں کے قومی کھنڈر سے اسلام کی دعوتی قوت ظاہر ہونا شروع ہوئی۔ اسلام کے عقیدہ نے فاتح تاتاریوں کو مسخر کرنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ پچاس برس میں پوری تاریخ بدل گئی۔ مسلمانوں کے فاتح اسلام کے مفتوح بن گئے۔ ہلاکو نے مسلم دنیا کی جن مسجدوں کو ڈھایا تھا، اس کے پوتوں نے ان مسجدوں کو دوبارہ بنایا۔ اور ان مسجدوں میں خدائے واحد کے سامنے جھک کر پنے عجز کا اعتراف کیا۔

اسلامی تاریخ کا یہی واقعہ ہے جس کا ذکر علامہ اقبال نے ۱۹۳۰ میں آل انڈیا مسلم لیگ (الٰہ آباد) کے اجلاس میں اپنا خطبۂ صدارت پڑھتے ہوئے اس طرح کیا تھا کہ ــــــ مسلمانوں کی تاریخ سے مجھے یہ سبق ملا ہے کہ ان کی تاریخ کے نازک مواقع پر یہ اسلام تھا جس نے مسلمانوں کو بچایا نہ کہ مسلمانوں نے اسلام کو:

> One lesson I have learnt from the history of Muslims. At critical moments in their history it is Islam that has saved Muslims and not vice versa.

یہی بات اقبال نے عوامی انداز میں اپنے اس شعر میں کہی ہے :

ہے عیاں فتنۂ تاتار کے افسانے سے　　　پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانے سے

تاہم ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اقبال نے اس حقیقت کو ماضی کے اعتبار سے سمجھا۔ مگر اس کو انھوں نے حال کے اعتبار سے دریافت نہیں کیا۔ انھیں یہ تو دکھائی دیا کہ گزری ہوئی تاریخ میں اسلام کی دعوتی طاقت نے مسلمانوں کو بچایا ہے مگر حال کے اعتبار سے وہ اس طاقت کی اہمیت کو سمجھ نہ سکے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے ۱۹۳۰ میں جغرافی تقسیم کو ہندستان کے مسلمانوں کے مسئلہ کا حل بتایا۔ حالاں کہ

انہیں مسلمانوں کو یہ تلقین کرنا چاہئے تھا کہ تم غیر اقوام کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کرو۔ اس کے بعد تمہارے مسائل اپنے آپ حل ہو جائیں گے جس طرح وہ ماضی میں حل ہو گئے۔

کسی قوم کے رہنما اور دانشور ہی وہ لوگ ہیں جو پوری قوم کا ذہن بناتے ہیں۔ ان کی تقریریں اور تحریریں لوگوں کو کسی ایک طرف یا دوسری طرف لے جاتی ہیں۔ ہندستانی مسلمانوں کی مشکل یہ ہے کہ ان کے رہنماؤں اور دانشوروں میں دعوتی ذہن موجود نہیں۔ وہ صرف قومی طرز فکر کو جانتے ہیں۔ اور ہمیشہ قومی طرز فکر کے مطابق لکھتے اور بولتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انھیں ملک کے قومی مسائل تو دکھائی دیتے ہیں۔ مگر انھیں ملک کے دعوتی امکانات نظر نہیں آتے۔

اس کو سمجھنے کے لئے ایک مثال لیجئے۔ ہندستان میں کروروں کی تعداد میں وہ لوگ آباد ہیں جن کو اچھوت یا پست اقوام کہا جاتا ہے۔ ہندو مذہب اور روایات اس میں مانع ہیں کہ ان کو ملک میں برابر کا سماجی درجہ ملے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ مستقل طور پر مایوسی اور ذہنی انتشار میں مبتلا رہتے ہیں۔

ڈاکٹر امبیڈکر (۱۹۵۶-۱۸۹۳) ایک اچھوت خاندان میں پیدا ہوئے۔ مگر انھوں نے ملک کے اندر اور ملک کے باہر اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ یہاں تک کہ وہ چوٹی کے دانشور بن گئے۔ اپنی ذہنی اور علمی خصوصیات کی بنا پر انھوں نے پوری اچھوت برادری میں واحد نمائندہ لیڈر کی حیثیت حاصل کر لی۔

ڈاکٹر امبیڈکر کو اس بات کی بہت زیادہ فکر تھی کہ وہ اپنی قوم کو اوپر اٹھائیں اور ان کو ملکی سماج میں برابری کا درجہ دیں۔ ہندو ازم اور ہندو سماج کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ ہندو دائرہ میں رہتے ہوئے وہ اپنی قوم کو یہ درجہ نہیں دلا سکتے۔ دوسری طرف اسلام کے مطالعہ نے انھیں بتایا کہ یہ مطلوبہ درجہ ان کو اور ان کی قوم کو نہایت کامیابی کے ساتھ حاصل ہو سکتا ہے اگر وہ اسلام کے دائرہ میں داخل ہو جائیں۔ چنانچہ انھوں نے ارادہ کیا کہ وہ اپنی پوری برادری کے ساتھ اسلام قبول کر لیں۔

اس سلسلہ میں انھوں نے مختلف تقریریں کیں اور مضامین لکھے۔ مثال کے طور پر انھوں نے اپنے ایک مضمون میں لکھا کہ مجھے ایسا لگتا ہے کہ اسلام پست طبقات کو وہ سب کچھ دیتا ہے جس کی

انھیں ضرورت ہے۔ اقتصادی اعتبار سے اسلام کے ذرائع لامحدود ہیں۔ سماجی اعتبار سے مسلمان پورے انڈیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ مسلمان ملک کے ہر صوبے میں موجود ہیں اور وہ پست طبقات کے نومسلموں کی پوری مدد کرسکتے ہیں۔ سیاسی اعتبار سے پست طبقات وہ تمام حقوق پالیں گے جو مسلمانوں کو حاصل ہیں:

> Islam, seems to give the Depressed Classes all they need. Financially, the resources behind Islam are boundless. Socially, the Mohammedans are apread all over India. There are Mohammedans in every province and they can take care of new converts from the Depressed Classes and render them all help. Politically the Depressed Classes will get all the rights which Mohammedans are entitled to.
>
> *Politics of Conversion*, New Delhi, 1986, p.321

واقعات بتاتے ہیں کہ ڈاکٹر امبیڈکر اسلام کے بالکل قریب آچکے تھے اور عین ممکن تھا کہ وہ اپنی پوری برادری کے ساتھ اسلام قبول کرکے مسلمانوں کے گروہ میں شامل ہوجائیں۔ حتیٰ کہ انھوں نے ۱۳ اکتوبر ۱۹۳۵ کو وہ اعلان کیا جس کو ایولا ڈیکلریشن (Yeola Declaration) کہا جاتا ہے۔ اس اعلان میں انھوں نے ۴ ملین ہریجنوں سے اپیل کی کہ وہ اپنے موجودہ مذہب کو چھوڑ کر دوسرے مذہب میں داخل ہوجائیں (صفحہ ۳۳۲)

مگر مسلم لیڈروں میں سے کسی بھی قابل ذکر شخص نے ڈاکٹر امبیڈکر کی طرف توجہ نہ کی۔ حتیٰ کہ کسی نے ان سے ملاقات کی ضرورت بھی نہ سمجھی۔ دوسری طرف عین اسی زمانہ (۱۹۳۰ اور ۱۹۴۰ کے درمیان) مسلمانوں نے بحیثیت قوم یہ مظاہرہ کیا کہ انھیں ملک کی تقسیم کے سوا کسی اور چیز سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ مسلم رہنماؤں نے ہریجنوں کو اسلام کے سایۂ رحمت میں داخل کرنے سے کوئی حقیقی دلچسپی نہ لی۔ انھوں نے اپنی ساری دلچسپی اس بات کے لئے دکھائی کہ ملک سیاسی اعتبار سے دو حصوں (ہندو انڈیا، مسلم انڈیا) میں بانٹ دیا جائے۔

مسلمانوں کی یہ قومی پالیسی ڈاکٹر امبیڈکر کی امیدوں کے سراسر خلاف تھی۔ انھوں نے قدرتی طور پر یہ سمجھا کہ بٹوارہ کے بعد وہ اور ان کی قوم ہندو انڈیا میں باقی رہے گی۔ کیوں کہ ہریجن زیادہ تر اسی علاقہ میں آباد تھے۔ تقسیم کے بعد مسلمان اس حیثیت میں نہ ہوں گے کہ وہ ان کی کوئی مدد کرسکیں۔ دوسری طرف وہ تبدیلی مذہب کے نتیجہ میں مستقل طور پر ہندو غضب ناکی کا شکار ہو کر رہ جائیں گے۔

چنانچہ انھوں نے اسلام کے دائرہ میں داخل ہونے کا ارادہ ترک کر دیا۔

مسلم رہنماؤں میں اگر دعوتی ذہن ہوتا تو وہ سمجھتے کہ پست طبقات کو اسلام میں داخل کر کے اگر وہ ان کا درجہ اونچا کریں تو یہ خود ان کے لئے بھی حد درجہ مفید ہوگا۔ اس کے بعد ان کی آبادی ملک میں مجموعی طور پر تقریباً ۵۰ فی صد ہو جائے گی۔ اور اگر آئندہ تبلیغی عمل کو جاری رکھا جائے تو قریبی مستقبل میں وہ پچاس فیصد سے بھی زیادہ ہو سکتے ہیں۔ حتی کہ اس کی ضرورت ہی باقی نہ رہے گی کہ وہ "پاکستان" کی صورت میں اپنے لئے سیاسی پناہ کا ایک گوشہ تلاش کریں۔ مگر مسلم رہنماؤں کے غیر قرآنی ذہن کا یہ نقصان ہوا کہ انھیں قومی خطرات دکھائی دئے مگر انھیں دعوتی امکان نظر نہ آیا۔

دعوت الی اللہ سے عصمت من الناس کا فائدہ حاصل ہونا اتنا یقینی ہے کہ وہ کسی براہ راست کوشش کے بغیر اپنے آپ حاصل ہو سکتا ہے، بشرطیکہ مسلمان اپنی کسی نادانی سے اس کے عمل میں رکاوٹ ڈالنے کا سبب نہ بنیں۔

اس کا زندہ ثبوت ۱۹ ویں صدی اور پھر ۲۰ ویں صدی کے آغاز کی تاریخ ہے۔ واقعات بتاتے ہیں کہ اس زمانہ میں اسلام نہایت تیزی کے ساتھ ہندستان میں پھیل رہا تھا۔ ہر روز بلا مبالغہ ہزاروں آدمی اسلام میں داخل ہو رہے تھے۔ اگر اس عمل کو بدستور جاری رہنے دیا جاتا تو کسی اقبال یا جناح کی ضرورت نہ تھی جو بٹوارہ کی صورت میں مسلمانوں کے مسئلہ کا حل تجویز کرے۔ مگر پہلی عالمی جنگ (۱۸-۱۹۱۴) کے بعد مسلمانوں میں جو قومی تحریکیں اٹھیں، جس کا آخری عروج آل انڈیا مسلم لیگ تھی، اس نے سارا نقشہ بگاڑ دیا۔ ان تحریکوں نے انتہائی غیر دانشمندانہ طور پر ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اختلافی باتوں کو ابھارا۔ انھوں نے اپنی دھواں دھار کارروائی کے ذریعہ دونوں قوموں میں نفرت کی ناقابل عبور دیوار کھڑی کر دی۔ مسلم لیڈروں کی یہی نفرت انگیز سیاست ہے جس نے اسلام کی اشاعت کے اس سیلاب کو روک دیا جو مغل سلطنت کے زوال کے بعد انیسویں صدی میں اس ملک میں جاری ہوا تھا۔

ہندستان میں مسلمانوں کو مستقبل کی تعمیر کے لئے دو میں سے ایک کام کرنا تھا۔ یا تو وہ سچے داعی بن کر دوسری قوموں کو اپنا مدعو بناتے اور صبر اور حکمت کے ساتھ انھیں اسلام کی دعوت دیتے۔ اور اگر وہ ایسا نہیں کر سکتے تھے تو دوسرا کام ان کے کرنے کا یہ تھا کہ وہ اسلام کی فطری اشاعت کے عمل میں

کوئی رکاوٹ نہ کھڑی کریں۔ وہ اس معاملہ میں خاموش ہو جائیں اور اسلام کو اپنی ذاتی طاقت سے آگے بڑھنے کا موقع دیں۔

مسلمان ان دونوں میں سے جو بھی طریقہ اختیار کرتے اس کا نتیجہ جلد یا بدیر ایک ہی نکلتا۔ مگر وہ نہ سلام کے براہ راست داعی بن سکے اور نہ بالواسطہ معاون۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک صدی کی پرشور اور ہنگامہ خیز سیاست کے باوجود ان کے حصہ میں کچھ نہ آیا۔

موجودہ مسلمان

آج بھی ہندستانی مسلمانوں کے مسئلہ کا حل یہی ہے۔ اس موقع کو استعمال کرنے کا میدان اب بھی ان کے لئے کھلا ہوا ہے۔ آج بھی اگر ان کے اندر داعیانہ ذہن پیدا ہو جائے تو آج بھی وہ اس میدان میں متحرک ہو کر اس کے تمام فائدے حاصل کر سکتے ہیں۔ سورہ المائدہ (۶۷) میں خدا کی جو سنت بتائی گئی ہے، وہ ایک ابدی سنت ہے۔ وہ جس طرح ماضی کے لئے تھی، اسی طرح وہ آج کے لئے بھی ہے، اور وہ قیامت تک اسی طرح باقی رہے گی۔

انسان کی فطرت کبھی نہیں بدلتی۔ آج بھی جو انسان پیدا ہو رہے ہیں وہ یقیناً فطرت اللہ پر پیدا ہو رہے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آج کا انسان بھی اپنی پیدائشی فطرت کے تحت اس کا منتظر ہے کہ کوئی آئے اور اس کی فطرت کے دروازے کو کھٹکھٹائے، تاکہ وہ اپنے خالق کے سکھائے ہوئے سبق کے مطابق اس کا جواب دے سکے۔

تاہم اس دعوتی امکان کو حاصل کرنے کے لئے ایک شرط لازمی طور پر ضروری ہے، اور وہ صبر و اعراض ہے۔ مسلمانوں کو اس ملک میں داعی بننے کے لئے یہ کرنا ہوگا کہ وہ دوسری قوم کے ساتھ اپنے تمام نزاعات کو یک طرفہ طور پر ختم کر دیں۔ یہ ختم کرنا مصنوعی طور پر نہ ہو، بلکہ دل کی گہرائی کے ساتھ ہو۔ اب تک وہ دوسری قوم کو اپنا حریف بنائے ہوئے تھے۔ اب انھیں دوسری قوم کو اپنا دعوتی محبوب بنانا ہوگا۔ انھیں اس حد تک ان کا خیر خواہ بننا ہوگا کہ ان کے دل سے دوسری قوم کے لوگوں کے لئے دعائیں نکلنے لگیں۔

جس دن مسلمان ایسا کریں گے، اسی دن اس ملک میں دعوتی عمل کا آغاز ہو جائے گا، اور اسی کے ساتھ وہ نتیجہ بھی ظاہر ہونا شروع ہو جائے گا جو دعوت الی اللہ کے ساتھ اللہ نے ابدی طور پر مقدر کر دیا ہے۔

عسر کے ساتھ یسر

قرآن میں ایک نہایت اہم اصول یہ بتایا گیا ہے کہ یہ دنیا کبھی یک طرفہ طور پر کسی کے لئے غیر موافق نہیں ہو سکتی۔ خدا کے قانون کے مطابق، اس دنیا میں ہمیشہ مشکل کے ساتھ آسانی بھی موجود رہے گی۔ کوئی شخص یا قوم جب بھی کسی محرومی سے دوچار ہو تو یقینی طور پر وہیں اس کے لئے امکانات اور مواقع کا نیا دروازہ بھی کھلا ہوا ہوگا۔ یہ اصول قرآن کی اس آیت سے معلوم ہوتا ہے:

فَاِنَّ مع العسر یسرا اِنّ مع العسر یسرا (الانشراح)	پس بے شک مشکل کے ساتھ آسانی ہے بے شک مشکل کے ساتھ آسانی ہے

یہ آیت واضح طور پر بتاتی ہے کہ اس دنیا میں نہ صرف یہ ہے کہ ہر مشکل کا ایک کامیاب حل ہمیشہ موجود رہتا ہے۔ بلکہ مزید اطمینان بخش بات یہ ہے کہ مشکل کے مقابلہ میں حل کی مقدار دوگنا ہوتی ہے۔ یہی وہ بات ہے جو حدیث میں ان لفظوں میں بتائی گئی ہے کہ لن یغلب عسر یُسرَین (ایک مشکل دو آسانی پر غالب نہیں آسکتی)

ہندستان کے مسلم رہنما اور دانشور اپنی تحریروں اور تقریروں کے ذریعہ مسلسل یہ اعلان کر رہے ہیں کہ اس ملک میں مسلمانوں کے لئے مشکلات ہیں۔ یہاں ان کے خلاف تعصب اور ظلم کیا جاتا ہے۔ ہر لکھنے اور بولنے والا روزانہ یہی بات دہرا رہا ہے۔

مگر اس قسم کے بیانات خدا کی کتاب کے خلاف عدم اعتماد کا اظہار ہیں۔ وہ ثابت کرتے ہیں کہ یہ مسلمان خدا کی کتاب کے بیانات پر یقین نہیں رکھتے۔ اگر انھیں خدا کی کتاب پر یقین ہوتا تو وہ مشکل پیش آنے کی صورت میں آسانی کو تلاش کرتے۔ اس کے بعد وہ جان لیتے کہ جہاں مشکل پائی جا رہی تھی، وہیں آسانی (اس کا حل) بھی دگنا مقدار میں موجود تھا۔ اس کے بعد ان کے لئے اعلان کرنے کی چیز مسئلہ کا حل ہوتا نہ کہ صرف مسائل اور مشکلات۔

ہندو مسئلہ

ہندستان کے مسلمانوں کا عام ذہن یہ ہے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ ہندو ان کے حق میں متعصب اور ظالم ہے۔ ہندوؤں کے تعصب اور عناد نے ان کے لئے ناقابل حل مسائل پیدا کر رکھے ہیں۔ اس ملک میں ان کے لئے باعزت زندگی گزارنے کے تمام دروازے بند ہیں۔

مگر یہ رائے جن ہندوؤں کے تجربات کی بنیاد پر قائم کی گئی ہے وہ زیادہ تر عام قسم کے ہندو ہیں۔ وہ ہندو جو جلسہ اور جلوس کی بھیڑ میں اضافہ کرتے ہیں۔ جو سڑکوں پر جمع ہو کر نعرہ لگاتے ہیں۔ جو فساد کے موقع پر لوٹتے اور جلاتے ہیں۔ یہ سب ہندو عوام ہوتے ہیں نہ کہ ہندو خواص۔ مسلمانوں کو ہندو عوام یا ہندو فرقہ پرستوں کی طرف سے جو تجربہ ہو رہا ہے، اس کو وہ پوری ہندو قوم پر چسپاں کر دیتے ہیں اور سمجھ لیتے ہیں کہ ہندو سب کے سب ان کے مخالف ہیں۔

مگر یہ رائے خطرناک حد تک خلاف واقعہ ہے۔ ہندوؤں کا مذہبی طبقہ اور ہندو عوام دونوں میں بلاشبہ ایک ایسا گروہ ہے جو مسلمانوں کے ساتھ عناد رکھتا ہے۔ مگر ہندوؤں کا خواص طبقہ جس نے جدید طرز پر تعلیم حاصل کی ہے، اس کی بہت بڑی اکثریت فرقہ وارانہ عناد اور شورش کی سیاست میں کوئی دل چسپی نہیں رکھتی۔ مزید یہ کہ یہی ہندو خواص ہیں جو اپنی تعلیم کی بنا پر ملک کے تمام کلیدی عہدوں پر قابض ہیں۔ وہی ملک کا پورا سیاسی اور اقتصادی نظام چلا رہے ہیں۔ اخبارات اور تمام اشاعتی ادارے انھیں کے تحت چل رہے ہیں۔

اس معاملہ کی وضاحت کے لئے یہاں میں ایک حوالہ دوں گا۔ ٹائمس آف انڈیا (۹ فروری ۱۹۹۰) میں ایک مفصل آرٹیکل چھپا ہے۔ اس کے لکھنے والے مسٹر چندن مترا ہیں، اور اس کا عنوان ہے:

Militant Hinduism is self-limiting

مضمون نگار الہ آباد کے ماگھ میلہ (جنوری ۱۹۹۰) میں موجود تھے جہاں وشو ہندو پریشد نے اپنا "عظیم الشان" جلسہ کیا تھا۔ وہ وشو ہندو پریشد اور دوسری فرقہ پرست ہندو جماعتوں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ انھوں نے اگرچہ "رام جنم بھومی" کا جذباتی اشو لے کر عوامی ہندوؤں کی ایک بھیڑ اپنے گرد جمع کر لی ہے اور نومبر ۱۹۸۹ کے الکشن میں وقتی کامیابی بھی حاصل کی ہے، مگر مذہب کے نام پر اٹھنے والی ان ہندو جماعتوں کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ وہ ہندوؤں کے طبقۂ خواص کو اب تک اپنا ہم نوا نہ بنا سکے۔

وہ لکھتے ہیں کہ تاہم بی جے پی کا مسئلہ یہ ہے کہ دسیوں سال کی سخت کوشش کے باوجود وہ اس میں ناکام رہی ہے کہ سیکولر شہری ہندوؤں سے اپنے حق میں فکری جواز حاصل کر سکے جو کہ عوام کی رائے کو کنٹرول کرتے ہیں۔ اور یہ بعید از قیاس ہے کہ مستقبل قریب میں وہ اپنی اس کوشش

میں کامیاب ہوسکے:

> The BJP's problem, however, is that despite decades of strenuous effort, it has failed to acquire intellectual legitimacy from the secularised, urban Hindus who dominate public opinion. And it is unlikely to succeed in this endeavour in the foreseeable future.

مذہبی طبقہ اگر سچے مذہب پر ہو تو وہ انصاف پر کھڑا ہوا ہوتا ہے۔ مگر جب مذہبی طبقہ میں بگاڑ آجائے تو اس کے پاس تعصب کے سوا اور کوئی چیز نہیں ہوتی جس پر وہ اپنے آپ کو کھڑا کر سکے۔ ہندوؤں کا موجودہ مذہبی طبقہ حقیقتۃً ایک بگڑا ہوا مذہبی طبقہ ہے، اس لئے اس کا مذہب تمام تر تعصب پر مبنی ہے۔ وہ مذہبی سچائی پر نہیں بلکہ مسلم عناد کی زمین پر کھڑا ہوا ہے۔

ہندو عوام کا معاملہ بھی ایک اور اعتبار سے یہی ہے۔ ہندو عوام کی اکثریت جاہل اور غریب ہے۔ وہ ایک بے شعور انسانوں کی بھیڑ ہے۔ ایسے لوگوں کو کوئی بھی شوشہ کی بات کہہ کر بھڑکایا جا سکتا ہے۔ اس کی ایک قریبی مثال یہ ہے کہ ہندو عوام پچھلی نصف صدی سے زیادہ تر کانگرس کو ووٹ دیتے آرہے تھے۔ مگر ۲۲ نومبر ۱۹۸۹ کو ہونے والے الکشن میں فرقہ پرست ہندو جماعتوں نے اپنے عوام کو یہ کہہ کر بھڑکایا کہ راجیو گاندھی ایک سیکولر آدمی ہے۔ وہ خود پارسی کا لڑکا ہے، اور ایک عیسائی عورت سے شادی کئے ہوئے ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے اجودھیا میں مقدس رام مندر کی تعمیر نہیں ہو سکتی۔ یہ سن کر شمالی ہند کے ہندو بھڑک گئے اور انھوں نے مخالفانہ ووٹ دے کر راجیو گاندھی کی پارٹی کو شمالی ہند میں ہرا دیا۔

ان اسباب سے مسلمانوں کے لئے عقلمندی کی بات یہ ہے کہ وہ اختلافی معاملات کو ہندو خواص کی سطح پر لاکر حل کریں۔ وہ اس کو ہندو عوام (مذہبی طبقہ اور عوامی طبقہ) تک نہ جانے دیں۔

موجودہ ہندو قوم میں دو مختلف طبقے کا ہونا قرآن کے اس اصول کے عین مطابق ہے کہ اس دنیا میں ہمیشہ عُسر کے ساتھ یُسر موجود رہتا ہے۔ ہندوؤں کا فرقہ پرست طبقہ اگر مسلمانوں کے لئے عسر کے درجہ میں ہے، تو انھیں ہندوؤں کا جدید تعلیم یافتہ طبقہ مسلمانوں کے لئے یُسر کی حیثیت رکھتا ہے۔ مذہبی طبقہ کے اندر اگر مسلمانوں کے خلاف تعصب وعناد ہے، تو تعلیم یافتہ طبقہ اپنی روشن خیالی کی بنا پر مسلمانوں کے معاملہ میں انصاف کا اور حقیقت پسندی کا فیصلہ کرتا ہے۔

مزید یہ کہ قانون الٰہی کے مطابق، یہاں بھی عسر کے مقابلہ میں یُسر کی طاقت زیادہ ہے۔ ہندوؤں کے فرقہ پرست طبقہ کے پاس صرف جذباتی نعرے ہیں۔ دوسری طرف جدید تعلیم یافتہ طبقہ کا حال یہ ہے کہ وہی ہر قسم کے علمی، انتظامی، اقتصادی اور صحافتی اداروں پر قابض ہے۔ اعلیٰ سطح کے تقریباً تمام فیصلے اسی کے دفتروں سے کئے جاتے ہیں۔

دو مسجدوں کا قصہ

یہاں میں ایک تقابلی مثال پیش کرتا ہوں۔ اس سے اس اصول کی صداقت خالص عملی اور واقعاتی سطح پر ثابت ہوتی ہے۔ یہ اجودھیا اور دہلی کی مسجد کی مثال ہے۔

بابری مسجد (اجودھیا) کا مسئلہ اپنی موجودہ شکل میں ۱۹۸۶ میں پیدا ہوا۔ اس کے بعد مسلمانوں نے مسلم رہنماؤں کی رہنمائی میں کیا کیا۔ وہ اس مسئلہ کو سڑک پر لے آئے۔ جلسہ اور جلوس، ریلی اور مارچ، بائیکاٹ اور لاؤڈ اسپیکر کے شور کے ذریعہ انھوں نے اس مسئلہ کو حل کرنے کوشش کی۔ یہ طریقہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے ہندو عوام اور ہندو مذہبی طبقہ کی سطح پر مسئلہ کو حل کرنا تھا۔ چنانچہ وہ سراسر ناکام رہا۔

سڑک کی سیاست نے جوابی طور پر ہندوؤں میں اسی قسم کی شدید تر سیاست پیدا کی۔ ہندوؤں کے مذہبی طبقہ کو یہ موقع ملا کہ وہ جذباتی اپیلیں کر کے ہندو عوام کو بھڑکا دیں۔ انھوں نے ہندو عوام سے کہا کہ ۱۹۴۷ میں ملک کے بٹوارے کو مان کر ہم نے مسلمانوں کے مقابلہ میں پہلی شکست کھائی تھی، اب اجودھیا میں رام جنم بھومی کی تعمیر کے سوال پر ہم مسلمانوں سے دوسری شکست (second defeat). کبھی قبول نہیں کریں گے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شمالی ہند کے ہندو عوام بھڑک اٹھے۔ جگہ جگہ خوں ریز فرقہ وارانہ فسادات ہوئے۔ عوامی ضد اور جوش نے مسئلہ کو پہلے سے بھی زیادہ پیچیدہ بنا دیا۔ جو چیز پہلے محدود مقامی مسئلہ کی حیثیت رکھتی تھی وہ پورے ملک کے لئے قومی وقار کا مسئلہ بن گئی۔ مسلمانوں کو بابری مسجد تو حاصل نہیں ہوئی۔ البتہ بہت سی چیزیں جو اس سے پہلے انھیں حاصل تھیں وہ بھی انھوں نے اپنے غلط طریق کار کے نتیجہ میں کھو دیں۔ (اس مسئلہ کی مزید تفصیل کے لئے راقم الحروف کا مضمون "حکیمانہ تدبیر" ملاحظہ فرمائیں)

اب اس کے برعکس ایک مثال لیجئے۔ نئی دہلی کے ایک قیمتی علاقہ میں ایک قدیم شکستہ مسجد تھی۔ جس کے ساتھ وسیع زمین شامل تھی۔ اس زمین کا رقبہ مجموعی طور پر اٹھارہ ایکڑ ہوتا تھا۔ ۱۹۴۷ کے بعد اس زمین پر دہلی کی حکومت کے تین محکموں (آرکیالوجی، ڈی ڈی اے اور کارپوریشن) نے قبضہ کر لیا۔ وہاں انھوں نے اپنا دفتر قائم کر دیا۔ ان کا مقصد اس کو جدید قسم کے پکنک اسپاٹ میں تبدیل کرنا تھا۔ اس نقشہ کے مطابق کام بھی شروع ہو گیا۔ حتی کہ انھوں نے وہاں کئی لاکھ روپیہ خرچ کر دیا۔

اس کے بعد ایک مولوی صاحب کو یہ خیال آیا کہ اس قدیم مسجد پر قبضہ کیا جائے۔ انھوں نے اس مقصد کے لئے نہ مسلمانوں کا جلسہ کیا، نہ اخباروں میں بیانات چھپوائے، نہ پوسٹر بازی کی مہم چلائی، نہ سڑکوں پر "ہماری مسجد ہم کو واپس کر دو" کے نعرے لگائے۔ اس قسم کے کسی بھی مظاہراتی کام کو چھوڑ کر انھوں نے یہ کیا کہ نہایت خاموشی سے اس علاقہ کے ہندو خواص سے ملاقاتیں شروع کر دیں۔ ان سے نجی ملاقاتوں میں کہا کہ یہ ایک مسجد (عبادت خانہ) ہے اور عبادت خانہ ہر حال میں مقدس ہوتا ہے، خواہ وہ کسی بھی مذہب کا ہو۔ اس لئے آپ لوگ اس کو واگزار کرانے میں ہماری مدد کریں۔

ایک تعلیم یافتہ ہندو جو سکریٹری کے عہدے سے ریٹائر ہوا تھا وہ ان کا ساتھ دینے کے لئے پوری طرح تیار ہو گیا۔ اس نے مذکورہ تینوں محکموں سے باقاعدہ ربط قائم کیا۔ ہر قسم کے دستاویزات جمع کئے۔ اس سلسلہ کے تمام خطوط اور ڈرافٹ جو انگریزی میں ہوتے تھے وہ خود تیار کرتا اور مولوی صاحب کے ساتھ متعلقہ دفاتر میں جاتا۔

یہ خاموش دفتری جنگ تین سال تک جاری رہی۔ یہاں تک کہ مذکورہ ہندو سکریٹری اور کچھ دوسرے اعلیٰ طبقہ کے ہندوؤں کی مدد سے مذکورہ تینوں محکمے اس پر راضی ہو گئے کہ وہ مسجد کو واگزار کر دیں۔ مولوی صاحب کو باقاعدہ تحریری طور پر یہ اجازت مل گئی کہ وہ مسجد کو آباد کر سکتے ہیں اور ملحقہ ۱۸ ایکڑ زمین پر ۸ فٹ اونچی باؤنڈری تعمیر کر سکتے ہیں۔ آج یہاں نہ صرف مسجد اور مدرسہ قائم ہے بلکہ تمام تمدنی سہولتیں مثلاً بجلی، ٹیلیفون اور سیور لائن بھی وہاں آچکی ہیں۔ اب یہ جگہ ایک پررونق اسلامی مرکز کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔

اجودھیا کی مسجد کو مسلمانوں نے مزید نقصان کے ساتھ کھو دیا۔ اور دہلی کی نسبتاً زیادہ بڑی اور زیادہ اہم مسجد کو انھوں نے شاندار طور پر دوبارہ حاصل کر لیا۔ اس فرق کی وجہ یہ تھی کہ مسلمانوں

کے نادان رہنماؤں نے اجودھیا کی مسجد کو جاہل عوام کی سطح پر حل کرنا چاہا۔ اس کے برعکس دہلی کی مسجد کے مسئلہ کو تعلیم یافتہ خواص کی سطح پر حل کرنے کی کوشش کی گئی۔ یہی واحد وجہ ہے جس کے نتیجہ میں ایک مقام پر مسلمان مفتوح اور مغلوب ہو گئے اور دوسرے مقام پر انھوں نے شاندار فتح حاصل کی۔

یہ اصول صرف مسجد کے لئے خاص نہیں۔ مسلمان جس معاملہ میں بھی عوامی ہنگامہ کھڑا کریں گے وہاں ان کا ٹکراؤ عوامی ہندوؤں سے ہو جائے گا، اور آخر کار ان کو شکست ہو گی۔ اس کے برعکس جب وہ خاموش انداز اختیار کریں گے اور ہندوؤں کے خواص طبقہ سے ربط قائم کریں گے تو معاملہ ہندو خواص کی سطح پر رہے گا۔ ایسی صورت میں وہ ہمیشہ اپنے موافق فیصلہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوں گے، بشرطیکہ ان کا معاملہ انصاف اور صداقت پر مبنی ہو۔

ہم پئیں، وہ نہ پئیں

اس سلسلہ میں ایک صحابی کا قول نہایت بامعنی اور سبق آموز ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں غزوۂ بدر پیش آیا تو یہ سوال تھا کہ میدان جنگ کے لئے کس مقام کا انتخاب کیا جائے۔ ایک صحابی الحباب بن المنذر الجموح نے ایک مقام کی تجویز پیش کی۔ اس کی خصوصیت انھوں نے یہ بتائی کہ جب وہاں ہم ٹھہریں گے تو پانی کے چشمے ہمارے قبضہ میں آجائیں گے۔ اور فریق ثانی پانی کے ذخائر سے محروم ہو جائے گا۔ اس تجویز کی وضاحت کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ پھر ہم پئیں گے اور وہ نہ پئیں گے (فنشربُ ولا یشربون) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس تجویز کو پسند فرماتے ہوئے فوراً اس کو قبول کر لیا (سیرۃ ابن ہشام ۲/۲۶۱)

اسی قسم کا معاملہ ہندستان کا بھی ہے۔ موجودہ حالات میں اگر ہم اپنے مسئلہ کو ہندو عوام کی سطح پر لے جائیں تو ایسی صورت میں ہندوؤں کا فرقہ پرست طبقہ پانی پئے گا، اور مسلمان پانی سے محروم رہ جائیں گے۔ اس کے برعکس اگر ہم اپنے مسئلہ کو ہندو خواص کی سطح پر رکھ کر طے کریں تو ایسی صورت میں پانی مسلمان کے حصہ میں آئے گا، اور ہندو فرقہ پرست پانی سے محروم ہو کر رہ جائیں گے۔

دور اول کی مثال

عوام اور خواص کے اس فرق کی مثال اسلام کی ابتدائی تاریخ میں بھی موجود ہے۔ رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کی ایک تعداد مکہ سے ہجرت کر کے سمندر پار کے ملک حبش چلی گئی تھی۔ وہاں ان کے لئے عوام اور مذہبی طبقہ کی طرف سے اسی قسم کے مسائل پیدا ہوئے جو ہم کو ہندستان میں درپیش ہیں۔ مگر یہ مسائل جب وہاں کے خواص کے سامنے آئے تو انتہائی انصاف کے ساتھ یہ مسائل مسلمانوں کے حق میں طے کر دئے گئے۔

مسلمان جب حبش کے ساحل پر اترے تو وہاں کے باشندے خارجی ہونے کی بنا پر ان کو حقیر سمجھتے تھے اور انھیں پریشان کرتے تھے۔ یہ مسلمان اگر مشتعل ہو کر عوام کے خلاف ایجی ٹیشن کرتے تو نتیجہ برعکس نکلتا۔ مسلمان اقلیت میں تھے اور مقامی عوام اکثریت میں، اس لئے مسئلہ بڑھتا اور مسلمانوں کی پریشانیوں میں مزید اضافہ ہو جاتا۔

مگر مسلمانوں نے عوامی سطح پر شکایت اور احتجاج سے کامل پرہیز کیا۔ وہ ان سے اعراض کرتے ہوئے اپنا کام کرتے رہے۔ یہاں تک کہ ایک وقت آیا جب کہ ان کو بادشاہ وقت نجاشی کے دربار میں جانے کا موقع ملا۔ نجاشی نے ان سے پوچھا کہ کیا حبش میں کوئی تم کو ستاتا ہے۔ مسلمانوں نے کہا کہ ہاں۔ نجاشی نے فیصلہ دیا کہ جو شخص مسلمانوں کو ستائے، اس سے چار درہم بطور جرمانہ وصول کر کے مظلوم مسلمان کو دیا جائے۔ اس کے بعد اس نے مسلمانوں سے پوچھا کہ کیا اتنا جرمانہ کافی ہے۔ مسلمانوں نے کہا کہ نہیں۔ نجاشی نے دوبارہ فیصلہ دیا اور جرمانہ کی مقدار بڑھا کر آٹھ درہم کر دی (حیاۃ الصحابہ، الجزء الاول، صفحہ ۳۵۵)

اسی ہجرت کا دوسرا واقعہ یہ ہے کہ صحابہ کرام جب مکہ سے حبش پہنچے تو مکہ کے مشرکین نے اپنا ایک وفد حبش بھیجا تاکہ وہ مسلمانوں کو وہاں سے واپس لائے۔ مشرکین کے وفد نے حبش پہنچ کر وہاں کے مذہبی طبقہ سے ملاقاتیں کیں اور آخر میں نجاشی کے دربار میں حاضر ہوئے۔

مشرکینِ مکہ کے وفد کی باتوں کو سن کر وہاں کے مذہبی پیشواؤں کا گروہ (بگڑا ہوا مذہبی طبقہ) ان کا حامی بن گیا۔ انھوں نے نجاشی سے کہا کہ مسلم مہاجرین کو اس وفد کے حوالے کر دینا چاہئے۔ حتی کہ ایک موقع پر انھوں نے دربار میں مسلمانوں کے خلاف باقاعدہ شور وغل برپا کر دیا۔ ایسی حالت میں معاملہ اگر اس مذہبی طبقہ کی سطح پر لایا جاتا تو یقیناً اس کا فیصلہ مسلمانوں کے خلاف ہوتا۔

مگر مسلمان وہاں کے مذہبی طبقہ سے مطلق نہیں الجھے۔ انھوں نے مذہبی طبقہ کو نظر انداز کرتے

ہوئے صرف نجاشی کے سامنے اپنی بات پیش کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نجاشی نے مکمل طور پر مسلمانوں کے حق میں اپنا فیصلہ دے دیا۔ اس نے مشرکین مکہ کے وفد کو دربار سے نکال دیا۔ اور مسلمانوں سے کہا کہ تم لوگ جب تک چاہو حبش میں عزت کے ساتھ رہو۔ یہاں سے نکلنے پر تمھیں کوئی مجبور نہیں کر سکتا (سیرۃ ابن کثیر جلد ثانی)

حرف آخر

یہ دنیا مقابلہ کی دنیا ہے۔ مقابلہ کی یہ صورت حال ہمیشہ باقی رہے گی، کیوں کہ اس کو کسی "دشمن اسلام" نے قائم نہیں کیا ہے۔ بلکہ اس کو خود خدا نے اپنی دنیا میں قائم کیا ہے۔ اس لئے مخالفین کی سازش اور فساد کو لے کر اس کے خلاف فریاد کرنا سراسر احمقانہ ہے۔ اس قسم کی فریاد کسی کے کچھ کام آنے والی نہیں۔

اس دنیا میں کرنے کا کام صرف یہ ہے کہ حالات کو سمجھا جائے۔ "مخالفین" کے منصوبوں کو جان کر ان کے خلاف حکیمانہ انداز میں جوابی منصوبہ بندی کی جائے۔ مخالف حالات کو اپنے موافق بنانے کی کوشش کی جائے۔ ہر پیش آنے والے عُسر کو یُسر کی طاقت سے زیر کیا جائے۔ اس دنیا میں کامیابی اس شخص کے لئے ہے جو مشکل کو اپنی غذا بنا سکے، جو ناکامی کو کامیابی میں تبدیل کر سکے۔ جن لوگوں کے اندر یہ صلاحیت نہ ہو، ان کے لئے صرف یہ انجام مقدر ہے کہ وہ حالات کے خلاف بے فائدہ احتجاج کرتے رہیں، یہاں تک کہ تاریخ کے قبرستان میں ہمیشہ کے لئے دفن ہو جائیں۔

اوصاف انسانی

قرآن میں معمولی لفظی فرق کے ساتھ دو مقام پر یہ بات کہی گئی ہے کہ اللہ کسی قوم کی حالت کو اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک کہ وہ اس کو نہ بدل ڈالے جو اس کے جی میں ہے (ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتیٰ یغیروا ما بانفسھم، الرعد ۱۱)

اس خدائی سنت سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی گروہ کے مابقوم (اجتماعی حالت) کا انحصار اس کے ما بانفس (انفرادی حالت) پر ہے۔ اس کو دوسرے لفظوں میں اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ حیثیت قومی کا دار و مدار اوصاف انسانی پر ہے۔ کسی قوم کے افراد میں انسانی یا اخلاقی اوصاف جیسے ہوں گے، اسی نسبت سے اس کو دنیا میں اجتماعی مقام حاصل ہوگا، نہ اس سے کم اور نہ اس سے زیادہ۔

اس معاملہ کو سمجھنے کے لیے موجودہ زمانہ کی ایک مثال لیجئے۔ یہ بات سبھی لوگ مانتے ہیں کہ جاپان نے دوسری عالمی جنگ کے بعد بہت غیر معمولی ترقی کی ہے۔ اس ترقی کا ایک خاص راز ان کا اتحاد ہے۔ جاپانی ہر کام کو متحدہ انداز میں کرتے ہیں۔ وہ اپنے اتحاد کو آخر وقت تک برقرار رکھتے ہیں۔ اس کی وجہ سے ان کی طاقت بہت بڑھ جاتی ہے۔ وہ ہر معاملہ میں غیر معمولی طور پر کامیاب رہتے ہیں۔

جاپان کے اس اتحاد کا راز ان کے افراد کا ایک شخصی مزاج ہے جو تقریباً تمام جاپانیوں کے اندر پایا جاتا ہے۔ پروفیسر چی نکانی (Chie Nakane) کی جاپانی زبان میں ایک کتاب ہے جس کا ترجمہ انگریزی میں جاپانی سماج (Japanese Society) کے نام سے شائع ہوا ہے۔ اس کتاب میں جاپانی پروفیسر نے لکھا ہے کہ جاپانیوں کا انفرادی مزاج یہ ہوتا ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ میں کسی کے ماتحت ہوں:

I am under someone (p. 51).

دوسرے لفظوں میں یہ کہ ہر جاپانی احساس ماتحتی میں جیتا ہے۔ اس لیے جب بھی کوئی اجتماعیت قائم ہوتی ہے تو وہ فوراً اس سے جڑ جاتا ہے، وہ تنظیم کے سربراہ کو فوراً اپنا سربراہ مان لیتا ہے، کیوں کہ وہ پہلے ہی سے یہ مانے ہوئے تھا کہ میں کسی کے ماتحت ہوں ـــــــ یہ ہے جاپانیوں کے اس اتحاد کا راز جس کے نتیجہ میں انھوں نے موجودہ زمانہ میں حیران کن ترقی حاصل کی ہے۔

اب موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کو دیکھئے۔ مسلمانوں کا معاملہ جاپانیوں کے بالکل برعکس ہے۔ مسجد

سے لے کر سیاست تک کوئی معاملہ ایسا نہیں جس میں مسلمان متحد ہوں۔ موجودہ مسلمان دنیا کی سب سے زیادہ برباد قوم ہیں، اور اس کی سب سے بڑی وجہ بلاشبہ ان کا عدم اتحاد ہے۔ اس بے اتحادی نے ایک ارب انسانوں کی عظیم قوم کو دنیا کی سب سے کمزور قوم بنا دیا ہے۔

موجودہ مسلمانوں کی اس بے اتحادی کا سبب کیا ہے۔ اس کا سبب دوبارہ ان کے افراد کا وہ غلط مزاج ہے جو کسی بھی اتحاد کی راہ میں ایک مستقل رکاوٹ بن گیا ہے۔

موجودہ زمانہ میں جب مسلمان تنزل اور مغلوبیت کا شکار ہوئے تو ان کے رہنماؤں کی تشخیص یہ تھی کہ مغرب سے مرعوبیت نے ان کو زوال سے دوچار کیا ہے۔ چنانچہ تمام رہنماؤں نے ایک یا دوسری صورت میں یہ کیا کہ اسلام کو پرفخر انداز میں ان کے سامنے پیش کرنا شروع کر دیا۔ تاکہ ان کی مرعوبیت ختم کر سکیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی موجودہ پوری نسل فخر اور حاکمیت کے احساس پر پرورش پاکر اٹھی ہے۔ ہر آدمی نظری اور اعتقادی طور پر اپنے اندر برتری کا جذبہ لیے ہوئے ہے۔ کیوں کہ یہی جذبہ اس کے اندر بھرا گیا تھا۔

یہ نفسیات اتحاد کی قاتل ہے۔ اتحاد اس وقت قائم ہوتا ہے جب کہ ایک شخص کو بڑا بنا کر بقیہ تمام لوگ اس کے مقابلہ میں چھوٹے بننے پر راضی ہو جائیں۔ مگر مسلمانوں کی پرفخر نفسیات اس میں مانع ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب ہر آدمی سردار بننا چاہتا ہے۔ ہر آدمی چاہتا ہے کہ اس کی بات چلے۔ ہر آدمی چاہتا ہے کہ وہ حاکمانہ سیٹ پر بیٹھے۔ ایسی حالت میں اتحاد قائم ہونا ممکن نہیں۔ اور مسلمانوں کی یہی وہ نفسیات ہے جس نے آج ان کے درمیان کسی بھی اتحاد کو سراسر ناممکن بنا دیا ہے۔

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا اصل مسئلہ اقتدار کو کھونا نہیں ہے بلکہ انسانی اوصاف کو کھونا ہے۔ موجودہ مسلمان، اپنے رہنماؤں کی غلط رہنمائی کے نتیجہ میں، اعلیٰ انسانی اوصاف سے خالی ہو گئے ہیں۔ اب سب سے پہلا ضروری کام یہ ہے کہ مسلمانوں کے اندر وہ اوصاف پیدا کیے جائیں جو اعلیٰ انسانیت کی تشکیل کرتے ہیں۔ جب تک یہ کام نہیں کیا جائے گا مسلمانوں کے احوال تبدیل نہیں ہو سکتے۔ کوئی دوسری کوشش خواہ وہ کتنی ہی بڑی مقدار میں کی جائے، مسلمانوں کے لیے کسی نئے بہتر مستقبل کی تخلیق نہیں کر سکتی۔

یہ ایک قانون فطرت کا مسئلہ ہے، اور قانون فطرت میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی۔ یہ قانون فطرت

ماضی کی امتوں سے بھی مطلوب تھا اور موجودہ امت سے بھی یقینی طور پر مطلوب ہے۔

مُردہ سے زندہ

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ بنی اسرائیل جب مصر سے نکل کر صحرائے سینا میں پہونچے تو اللہ تعالیٰ نے ارضِ مقدس (شام و فلسطین) کو ان کے لیے لکھ دیا۔ حضرت موسیٰ کے ذریعہ بنی اسرائیل سے کہا گیا کہ تم لوگ اس سرزمین میں داخل ہو جاؤ۔ تم کو خدا کی مدد ملے گی اور تم وہاں کے لوگوں پر غالب آجاؤ گے (المائدہ ۲۱)

وہاں جو قوم اس وقت آباد تھی، وہ بظاہر ایک طاقتور قوم تھی۔ چنانچہ بنی اسرائیل ان کا نام سن کر ڈر گیے۔ ان پر ایسا خوف طاری ہوا کہ وہ خدا اور خدا کے رسول کی ہدایت کے باوجود ان کے خلاف اقدام کے لیے تیار نہ ہوئے (المائدہ ۲۲) بائبل میں ہے کہ: "تب ساری جماعت زور زور سے چیخنے لگی۔ اور وہ لوگ اس رات روتے ہی رہے۔ اور کُل بنی اسرائیل موسیٰ اور ہارون کی شکایت کرنے لگے۔ اور ساری جماعت ان سے کہنے لگی، ہائے کاش ہم مصر ہی میں مرجاتے۔ یا کاش اس بیابان ہی میں مرتے۔ خداوند کیوں ہم کو اُس ملک میں لے جاکر تلوار سے قتل کرانا چاہتا ہے۔ پھر تو ہماری بیویاں اور بال بچے لوٹ کا مال ٹھہریں گے۔ کیا ہمارے لیے بہتر نہ ہوگا کہ ہم مصر کو واپس چلے جائیں" (گنتی ۱۴ : ۱-۴)

اس کے بعد اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہوا کہ بنی اسرائیل چالیس سال (۱۴۰۰-۱۴۴۰ ق م) تک فاران اور شرقِ اُردن کے درمیان صحرا میں بھٹکتے رہیں گے۔ یہاں تک کہ ان میں جو ۲۰ سال سے نیچے ہیں، صرف وہی زندہ بچیں گے۔ ۲۰ سال سے اوپر کی عمر کے تمام لوگ ختم ہو جائیں گے۔ چنانچہ ۴۰ سال کی صحرائی زندگی میں ان کے تمام بڑی عمر والے مرکر ختم ہو گیے۔ اس دوران ان کے بچے نئے صحرائی حالات میں پرورش پاکر نئی طاقت کے ساتھ اٹھے۔ اس نئی نسل نے یوشع بن نون کی قیادت میں ارضِ مقدس کو فتح کیا۔

بنی اسرائیل نے ابتداءً حضرت موسیٰ سے کہا تھا کہ اگر ہم اس ملک پر حملہ کریں تو ان کے مقابلہ میں ہم ہار جائیں گے۔ اور پھر "ہمارے بچے لوٹ کا مال ٹھہریں گے"۔ مگر یہی بچے بعد کو بڑے ہو کر شام و فلسطین کے علاقہ میں داخل ہو گیے اور وہاں کے حکمران (عمالقہ) سے لڑ کر

اس پر قبضہ حاصل کر لیا۔

بنی اسرائیل کے بچوں میں یہ طاقت کیسے پیدا ہوئی۔ وہ بے حوصلہ سے باحوصلہ کیونکر بن گیے۔ اس کا سبب یہ تھا کہ انھوں نے اپنے باپ دادا کے برعکس، لمبی مدت تک صحرائی زندگی کی مشقتوں کو برداشت کیا۔ بچوں کے باپ جن سخت حالات کو اپنے بچوں کے حق میں موت سمجھتے تھے، انھیں سخت حالات کے اندر داخل ہونے میں ان بچوں کے لیے نئی زندگی کا راز چھپا ہوا تھا۔

موافق حالات میں زندگی گزارنا بظاہر اچھا معلوم ہوتا ہے۔ مگر موافق حالات ہمیشہ جمود پیدا کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ آدمی کے اندر تمام اعلیٰ خصوصیتیں اس وقت پیدا ہوتی ہیں جب کہ اس کو حالات کا مقابلہ کرکے زندہ رہنا پڑے۔ مصر میں بنی اسرائیل صدیوں تک عافیت کی زندگی گذارتے رہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ایک مردہ قوم بن گیے۔ مگر مصر سے خروج کے بعد ان کو غیر آباد صحرا میں زندگی گزارنی پڑی۔ یہ صحرائی زندگی ان کے لیے سراپا چیلنج تھی۔ ان پر مشقت حالات میں جو لوگ بچپن سے جوانی کی عمر کو پہونچے وہ قدرتی طور پر بالکل دوسری قسم کے انسان تھے۔

بنی اسرائیل کی یہ نسل اخلاق و کردار کے اعتبار سے اپنے باپ دادا سے بالکل مختلف تھی۔ صحرائی حالات نے ان کے اندر سادگی، جفاکشی، حوصلہ اور حقیقت پسندی جیسی خصوصیات پیدا کر دی تھیں۔ اور بلاشبہ یہی وہ اوصاف ہیں جو کسی قوم کے افراد کو زندہ افراد بناتے ہیں۔ کوئی قوم اگر طول امد (الحدید ۱۶) کے نتیجہ میں مردہ قوم بن جائے تو اس کو دوبارہ زندہ قوم بنانے کی تدبیر یہی ہے کہ اس کو غیر معمولی حالات میں ڈالا جائے۔ اور اس کو ایسے شدید عمل سے گزارا جائے جس کے دوران اس کی سابقہ غیر مطلوب شخصیت ختم ہو اور نئی مطلوب شخصیت ابھر آئے۔

کسی مقصد کے حصول کے لیے افرادِ کار کی اہمیت اتنی زیادہ ہے کہ اگر مطلوب افراد موجود نہ ہوں تو خدا کا آیا ہوا حکم اقدام بھی ملتوی کر دیا جاتا ہے۔ جیسا کہ اوپر سے واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے۔ جب ضروری افراد تیار نہ ہوں اس وقت بڑے بڑے اقدامات کی بات کرنا صرف غیر سنجیدگی کی علامت

ہے نہ کہ جوش اقدام کی علامت۔ کیونکہ ایسا اقدام بدترین ناکامی کے سوا کسی اور انجام تک پہنچانے والا نہیں۔

دس سال خاموش

خلافت تحریک بیسویں صدی کے آغاز میں اٹھی اور ۱۹۲۴ میں آخری طور پر ختم ہو گئی۔ تقریباً دس سال تک ہندستانی مسلمانوں میں اس کا ہنگامہ جاری رہا۔ مولانا اشرف علی تھانوی (۱۸۶۳ - ۱۹۴۳) غالباً واحد نمایاں شخص تھے جو اس کے مخالف تھے اور اس پر سخت تنقید کرتے تھے۔

مولانا تھانوی کے ملفوظات میں ہے کہ "جس زمانہ میں تحریک خلافت کا شباب تھا، شورش پسند طبعیتیں جوش میں بھڑک رہی تھیں۔ چہار طرف آگ لگی ہوئی تھی۔ یہاں تک نوبت آ گئی تھی کہ علاوہ برا بھلا کہنے اور لعن طعن اور قسم قسم کے بہتان و الزامات لگانے کی دھمکی کے خطوط میرے پاس آئے کہ یا تو شریک ہو جاؤ ورنہ قتل کر دئے جاؤ گے۔"

مولانا تھانوی اس سلسلہ کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس زمانہ میں تحریک خلافت کے ایک ممتاز حامی میرے پاس آئے اور کہا کہ آپ اس تحریک میں شریک کیوں نہیں ہوتے۔ میں نے کہا کہ اس کام کو کرنے کے لئے پہلی شرط یہ ہے کہ مسلمانوں کا کوئی امیر المومنین ہو۔ اس شرط کی تکمیل کے بغیر یہ ساری تحریک غلط ہے۔ وہ کہنے لگے کہ ہم آپ ہی کو امیر المومنین بناتے ہیں۔ میں نے کہا کہ میں امیر المومنین بننے کے لئے تیار ہوں۔ مگر اس میں کچھ شرائط ہیں۔

مولانا تھانوی کی پیش کردہ پہلی شرط کا خلاصہ یہ تھا کہ تمام ہندستان کے مسلمان اپنا تمام مال اور جائداد میرے نام ہبہ کر دیں۔ کیوں کہ مال کے بغیر کوئی امیر المومنین کچھ نہیں کر سکتا۔

دوسری شرط یہ ہے کہ ہندستان کے تمام مشاہیر علماء اور لیڈروں کے دستخط کراؤ کہ وہ مجھ کو امیر المومنین تسلیم کر لیں۔ اگر بلا اختلاف سب نے تسلیم کر لیا تو میں امیر المومنین ہوں گا۔ اگر ایک نے بھی اختلاف کیا تو میں امیر المومنین نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ اختلاف کی صورت میں امیر امیر نہیں ہو سکتا۔ ہاں اگر تسلیم کے بعد پھر کوئی اختلاف یا خلاف کرے تو امیر کو حق ہے کہ وہ اپنی قوت سے ایسے لوگوں کو دبائے اور ٹھیک کرے۔ قبل از تسلیم حق نہیں کہ اس کو دبایا جائے۔"

اس کے بعد مولانا تھانوی نے کہا: "اب سنئے کہ امیر المومنین ہونے کے بعد سب سے اول جو حکم دوں گا وہ یہ ہوگا کہ دس سال تک کے لئے سب خاموش۔ ہر قسم کی تحریک اور ہر قسم کا شور و غل

بند۔ اس دس سال میں انتظام کروں گا مسلمانوں کو مسلمان بنانے کے اور ان کی اصلاح کے لئے باقاعدہ انتظام ہوگا۔ غرض کہ مکمل انتظام کے بعد جو مناسب ہوگا حکم دوں گا۔ عملی صورت یہ ہے کام کرنے کی۔ اور اگر محض کاغذی امیرالمومنین بنانا چاہتے ہو تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آج امیرالمومنین ہوں گا کل کو اسیر الکافرین ہوں گا۔ آج سردار بنوں گا، کل سر دار ہوں گا"۔

مولانا تھانوی اس کے بعد کہتے ہیں: "خلاصہ یہ ہے کہ ہر کام اصول سے ہوسکتا ہے۔ بے اصول تو گھر کا انتظام بھی نہیں ہوسکتا۔ ملک کا تو کیا خاک انتظام ہوگا۔ یہ ہیں وہ اصولی باتیں جن پر مجھ کو برا بھلا کہا جاتا ہے اور قسم قسم کے الزامات و بہتان میرے سر تھوپے جاتے ہیں اور لوگ مجھ سے خفا ہیں۔ اور وجہ خفا ہونے کی صرف یہ ہے کہ میں کہتا ہوں کہ اصول کے ماتحت کام کرو۔ جوش سے کام مت لو۔ ہوش سے کام لو۔ جوش کا انجام خراب نکلے گا۔ حدود شرعیہ کی حفاظت رکھو۔ وہ ان باتوں کو اپنے مقاصد میں روڑا اٹکانا سمجھتے ہیں"۔ (الافاضات الیومیہ، جلد اول، صفحہ ۱۰۴-۱۰۱)

مولانا تھانوی کی ان انتہائی معقول باتوں کو کسی نے نہیں سنا۔ تمام مسلمان پر جوش خطیبوں کی آواز پر بے معنی دوڑ لگاتے رہے۔ اپنے زمانہ کے مسلمانوں کی تصویر کشی کرتے ہوئے مولانا تھانوی کہتے ہیں: مسلم عوام کی حالت یہ ہے کہ جس نے مرضی کے موافق فتویٰ دے دیا، یا کوئی عالم یا لیڈر ان کے ساتھ ہو لیا، اس میں سب کمالات ہیں۔ اس کو عرش پر پہنچا دیں گے۔ اگر کسی نے مرضی کے خلاف کوئی بات کی تو تحت الثریٰ میں اس کو جگہ ملنا مشکل۔ غرض کہ ایک گڑبڑ ہے۔ اور یہ طریقہ کار جو موجود ہے، یہ سراسر اسلام اور شریعت سب کے خلاف ہے۔ اس کو اسلام اور مسلمانوں سے کیا تعلق (صفحہ ۱۱۱)

اس واقعہ سے ان لوگوں کو سبق لینا چاہئے جو یہ کہتے ہیں کہ مسلمانوں کا کوئی صحیح لیڈر نہیں۔ اصل بات یہ نہیں ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ مسلمان اپنے بگڑے ہوئے مزاج کی بنا پر کسی صحیح آدمی کو اپنا لیڈر نہیں بناتے۔ وہ جھوٹے الفاظ بولنے والوں کے پیچھے دوڑتے ہیں، اور جو آدمی سچے الفاظ بولے، اس سے انھیں کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ آج مسلمانوں کا حال، قرآن کے مطابق، یہ ہو رہا ہے کہ اگر ہدایت کا راستہ دیکھیں تو اس کو اپنا راستہ نہ بنائیں گے اور اگر گمراہی کا راستہ دیکھیں تو اس کو اپنا راستہ بنالیں گے (الاعراف ۱۴۶)

قوموں کی قیادت کے سلسلہ میں اصل مسئلہ رہنما فرد کی موجودگی کا نہیں ہے۔ بلکہ خود قوم کے اندر

رہنمائی کو قبول کرنے کی استعداد کا ہے ، بہترین رہنما یا بہترین رہنمائی کی موجودگی بھی اس وقت عملاً بے فائدہ ہو جاتی ہے جب کہ قوم کے اندر صحیح رہنمائی کو قبول کرنے کی استعداد پائی نہ جا رہی ہو۔

قرآن میں بار بار مختلف انداز میں یہ بات کہی گئی ہے کہ بہت سے انسان ایسے ہیں جن کا حال یہ ہوتا ہے کہ ان کے سامنے سچائی کو ہر قسم کے دلائل کے ساتھ بیان کر دیا جائے ، تب بھی وہ اس کو قبول نہیں کریں گے۔ مثلاً حضرت صالح علیہ السلام کے تذکرہ کے ذیل میں بتایا گیا ہے کہ انھوں نے اپنی قوم کے سامنے حق کو پوری طرح واضح کر دیا ، اس کے باوجود وہ لوگ ماننے کے لئے تیار نہیں ہوئے۔ آخر میں وہ اپنی قوم سے نکل گئے اور کہا کہ اے میری قوم ، میں نے تم کو اپنے رب کا پیغام پہنچا دیا اور میں نے تمہاری خیر خواہی کی۔ مگر تم خیر خواہوں کو پسند نہیں کرتے (الاعراف ۷۹)

دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں اپنی نشانیوں سے ان لوگوں کو پھیر دوں گا جو زمین میں ناحق تکبر کرتے ہیں ۔ اور وہ ہر قسم کی نشانیاں دیکھ لیں تب بھی وہ ان پر ایمان نہ لائیں (ان کا حال یہ ہے کہ) اگر وہ ہدایت کا راستہ دیکھ لیں تو اس کو وہ نہیں اپنائیں گے۔ اور اگر وہ گمراہی کا راستہ دیکھیں تو اس کو وہ اپنالیں گے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ انھوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا اور ان کی طرف سے وہ غافل رہے (الاعراف ۱۴۶)

ان دونوں آیتوں میں ایسے گروہوں کا ذکر ہے جن کو خدا کے پیغمبر کے ذریعہ اعلیٰ ترین شکل میں دعوت پہنچی۔ اس کے باوجود انھوں نے دعوت حق کو قبول نہیں کیا۔ اس کا سبب کیا تھا۔ اس کا سبب ان کی بگڑی ہوئی نفسیات تھی ، نفسیات کا یہ بگاڑ اکثر حالات میں تکبر کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ چنانچہ مذکورہ دونوں آیتوں میں تکبر ہی کو اس کا سبب بتایا گیا ہے (الاعراف ۷۵ ، ۱۴۶)

نصیحت ہر انسان کے لئے ناپسندیدہ چیز ہے ۔ اور خاص طور پر متکبر انسان تو نصیحت کو بالکل ہی ناپسند کرتا ہے۔ جو لوگ تکبر کی نفسیات میں مبتلا ہو جائیں وہ کبھی اپنے خلاف کسی نصیحت کو سننے پر راضی نہیں ہوتے۔ ایسا کوئی حق ان کے لئے آخری حد تک ناقابل قبول ہوتا ہے جس میں انھیں اپنی شخصیت کی نفی دکھائی دے رہی ہو۔

جو لوگ اپنے آپ کو اونچے مقام پر بیٹھا ہوا فرض کر لیں وہ کسی ایسی دعوت کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے جس میں انھیں محسوس ہو کہ اس کو قبول کرنے کی صورت میں انھیں اپنے اونچے مقام سے نیچے

اترنا پڑے گا۔ جو لوگ فخر اور ناز کی نفسیات میں مبتلا ہوں، ان کی یہ نفسیات ان کے لئے کسی ایسی بات کو ماننے کی راہ میں رکاوٹ بن جاتی ہے جس میں ان کا فخر و ناز انھیں ٹوٹتا ہوا نظر آئے۔

جو لوگ اپنا منصب احتسابِ قوم سمجھ بیٹھیں وہ اپنے مزاج کی بنا پر ایسی کسی پکار کو نظر انداز کر دیتے ہیں جس میں احتسابِ خویش پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہو۔ جو لوگ آرزوؤں اور خوش خیالیوں کی دنیا میں جی رہے ہوں وہ کسی ایسے پیغام کو اپنے لئے اجنبی محسوس کرتے ہیں جس میں حقائق و واقعات کی رعایت کر کے زندگی کی تعمیر کا سبق دیا گیا ہو۔ جن لوگوں کی نگاہ اپنی ذمہ داریوں کے بجائے اپنے حقوق پر ہو، جن کے اندر خارجی طرزِ فکر پیدا ہو جائے وہ ایسی کسی دعوت کو غیر ضروری سمجھ کر رد کر دیتے ہیں جس میں انھیں ان کی ذمہ داریاں یاد دلائی جائیں اور ان کے اندر داخلی طرزِ فکر ابھارنے کی کوشش کی جائے۔

جو لوگ اپنے متعلق یہ سمجھ لیں کہ وہ بخشے ہوئے لوگ ہیں وہ ایسے پیغام کی معنویت کو سمجھ نہیں پاتے جس میں اپنی موجودہ حالت کے تحت انھیں اپنی بخشش مشتبہ نظر آتی ہو۔ جن لوگوں نے تخیلات کی رومانی دنیا میں اپنے قلعے بنا رکھے ہوں وہ کسی ایسے پیغام کو اہمیت دینے میں ناکام رہتے ہیں جس کو ماننے کی صورت میں انھیں دکھائی دے کہ وہ کسی محفوظ قلعہ میں نہیں ہیں بلکہ صحرا میں کھڑے ہوئے ہیں۔ جن لوگوں نے یہ عقیدہ بنا رکھا ہو کہ کسی عمل کے بغیر پیشگی طور پر ان کے لئے جنت کے محلات رزرو ہو چکے ہیں وہ کسی ایسی تحریک میں حصہ لینا غیر ضروری سمجھتے ہیں جس میں عمل کی بنیاد پر جنت میں داخلہ کا راز بتایا گیا ہو۔

حق کو قبول کرنے کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ بگڑا ہوا مزاج ہے۔ جو لوگ بگڑے ہوئے مزاج میں مبتلا ہوں، ان کو صرف اپنے مزاج کے مطابق بات ہی اپیل کرتی ہے۔ دوسری کوئی بات، خواہ وہ کتنے ہی زیادہ دلائل کے ساتھ بیان کر دی جائے، وہ کسی طرح انھیں اپیل نہیں کرتی۔ اپنے مخصوص مزاج کے خلاف کسی بات کو ماننا ان کے لئے اتنا ہی مشکل ہو جاتا ہے جتنا کہ بکری کے لئے گوشت کھانا اور شیر کے لئے گھاس چرنا۔

غلط رہنمائی

جون ۱۹۸۷ میں میں ایک بیرونی سفر پر تھا۔ اس سفر کی روداد الرسالہ فروری ۱۹۸۸ میں شائع ہو چکی ہے۔ اس سفر کے دوران میری ملاقات ویسٹ انڈیز کے ایک مسلمان سے ہوئی۔ انھوں نے اپنا ایک واقعہ بتایا۔ ان کی ملاقات امریکہ کے ایک تعلیم یافتہ مسیحی سے ہوئی تھی۔ ان کی داڑھی اور ان کی ٹوپی کو دیکھ کر اس نے سمجھا کہ شاید یہ مسلمان ہیں۔ اس کے بعد دونوں کے درمیان جو سوال و جواب ہوا، وہ ان کے الفاظ میں یہ تھا:

Are you a Muslim?
Yes.
Then you are a terrorist.

ویسٹ انڈیز کے مذکورہ مسلمان نے یہ بات شکایت کے طور پر بتائی تھی۔ مگر میں اس کو عین واقعہ سمجھتا ہوں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی تصویر ساری دنیا میں دہشت گرد (Terrorist) کی تصویر بن گئی ہے۔ دور اول کے مسلمانوں کی تصویر یہ تھی کہ وہ دین رحمت کے نمائندہ ہیں۔ مگر موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی تصویر ساری دنیا میں یہ ہے کہ وہ دین دہشت کے نمائندہ ہیں۔

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا حال ساری دنیا میں یہ ہے کہ وہ یا تو لڑ رہے ہیں یا لڑنے کی باتیں کر رہے ہیں۔ کوئی عملی جنگ میں مشغول ہے اور کوئی قولی جنگ میں۔ یہ بات اتنی عام ہے کہ مشکل ہی سے کچھ لوگوں کو اس سے مستثنیٰ کیا جا سکتا ہے۔

یہ عملی یا قولی جنگ تین صورتوں میں جاری ہے۔ ایک وہ جنگ جس میں مسلمان اپنی مدعو قوموں سے سیاسی حقوق کی جنگ کرنے میں مشغول ہیں، مثلاً فلپائن۔ دوسری وہ جنگ جس میں مسلمان اپنے ملک کے مسلم حکمرانوں سے اسلامی قانون کے نفاذ کے نام پر لڑ رہے ہیں۔ مثلاً مصر۔ تیسری وہ جنگ جس میں مسلمان باہمی شکایت کی بنیاد پر خود آپس میں لڑ رہے ہیں، مثلاً پاکستان میں مہاجروں اور غیر مہاجروں کی لڑائی۔

مسلمانوں کا ایک طبقہ براہ راست طور پر ان لڑائیوں میں مشغول ہے۔ دوسرا طبقہ، جس کو دانشور طبقہ کہا جا سکتا ہے۔ وہ تقریر یا تحریر کی صورت میں اس جنگ کی موافقت کر کے لڑنے والوں کی ہمت

افزائی کر رہا ہے۔

یہ لڑائیاں بلاشبہہ اسلام کے خلاف ہیں۔ اور یہ واقعہ بذات خود اس بات کا ثبوت ہے کہ پوری امت اور امت کے تمام اکابر سو سال سے بھی زیادہ عرصہ سے ان لڑائیوں میں مشغول ہیں۔ مگر ان گنت قربانیوں کے باوجود اس کا کوئی بھی مثبت نتیجہ امت کو نہیں ملا۔ ہر لڑائی امت کے مسائل میں مزید کچھ اضافہ کر دیتی ہے، وہ کسی بھی درجہ میں اس کے مسائل کو حل کرنے والی نہ بن سکی۔

انیسویں صدی میں جب مغربی قومیں دنیا پر چھا گئیں۔ انھوں نے مسلم سلطنتوں کو مغلوب کرکے ہر جگہ اپنا براہ راست یا بالواسطہ غلبہ قائم کر لیا تو ہر جگہ مسلم مصلحین اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان لوگوں کا مشترک نعرہ صرف ایک تھا جس کو انھوں نے جہاد کا عنوان دیا۔ ہر ایک نے مسلمانوں کے اندر جہاد و قتال کا جذبہ ابھارا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پوری امت لڑنے بھڑنے والی امت بن گئی۔

انیسویں صدی میں جو واقعہ پیش آیا۔ اس کا صحیح رد عمل یہ تھا کہ مسلمانوں میں جذبۂ دعوت کو ابھارا جائے نہ کہ جذبۂ قتال کو۔ مسلم مصلحین کی یہی وہ اجتہادی غلطی ہے جس نے مسلمانوں کا یہ حال کر دیا ہے کہ وہ ہر جگہ لاحاصل لڑائیوں میں مشغول ہیں، کیوں کہ انھیں اس کے سوا کچھ اور بتایا ہی نہیں گیا۔

انیسویں صدی میں مغربی قوموں کے مقابلہ میں مسلمانوں کی مغلوبیت کا سبب اندر تھا نہ کہ باہر۔ یہ حادثہ حقیقۃً مسلمانوں کے اپنے زوال کی بنا پر پیش آیا نہ کہ دوسری قوموں کی زیادتیوں اور سازشوں کی بنا پر۔ معاملہ اگر سادہ طور پر دوسری قوموں کی زیادتی کا ہوتا تو مسلمانوں کی قربانیاں اس کو دفع کرنے کے لئے کافی ہو جاتیں۔ مگر معاملہ مسلمانوں کی اپنی داخلی کمزوریوں کا تھا اور خارجی اقدامات کے ذریعہ داخلی کمزوریوں کا علاج نہیں کیا جا سکتا۔

دعوت داخلی کمزوریوں کا علاج ہے۔ زوال کے بعد مسلمانوں کو دوبارہ اٹھانے کا واحد راز دعوت ہے (الحدید ۱۶ - ۱۷) موجودہ زمانہ کے مسلم مصلحین اگر بر وقت اس راز کو جان لیتے کہ یہ داخلی زوال کا معاملہ ہے نہ کہ خارجی تعدی کا معاملہ، تو وہ مسلمانوں میں جذبۂ دعوت کو ابھارتے۔ وہ مسلمانوں کے اندر داعیانہ اسپرٹ کو زندہ کرتے۔ اگر وہ ایسا کرتے تو مسلمانوں کی نئی تعمیر شروع ہو جاتی۔ وہ اٹھ کر دوبارہ نئی کامیابی حاصل کر لیتے۔

مگر مصلحین نے انتہائی نادانی کا ثبوت دیتے ہوئے مسلمانوں کے اندر جذبۂ قتال کو ابھارا۔ اس

کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں نے ایسی لڑائیاں چھیڑ دیں جس کا نتیجہ اس کے سوا کسی اور شکل میں بر آمد نہیں ہو سکتا تھا کہ جو کچھ ان کے پاس باقی بچا ہے اس کو بھی وہ آخر کار کھو دیں۔

نشانۂ عمل

دور اول کے مسلمانوں نے اپنی طاقت کو مثبت کاموں میں استعمال کیا اور اسلام کی عظیم تاریخ بنائی۔ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا حال، اس کے برعکس، یہ ہے کہ وہ آپس میں لڑ کر اپنی قوتوں کو ضائع کر رہے ہیں۔ اس معاملہ میں ان کی پستی کا حال یہ ہے کہ مصر کے اسلام پسندوں نے فوجی افسروں کے ساتھ مل کر شاہ فاروق کا خاتمہ (۱۹۵۲) کیا، اور جب شاہ فاروق کو مصر سے جلا وطن کر چکے تو اس کے بعد دونوں خود آپس میں لڑنے لگے۔ اسی طرح برصغیر ہند کے مسلمانوں نے ہندوؤں سے لڑ کر پاکستان (۱۹۴۷) بنوایا۔ اور جب پاکستان بن چکا تو انھوں نے خود اپنے درمیان لڑائی شروع کر دی۔

اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلم رہنماؤں نے مسلمانوں کو اٹھانے کے لئے سنت رسول پر عمل نہیں کیا، حتی کہ وہ لوگ بھی ایسا نہ کر سکے جو بظاہر "نظام مصطفی" اور "الرسول قائدنا" جیسے نعرے بلند کر رہے تھے۔

اس معاملہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت یہ ہے کہ آپ نے مسلمانوں کو ایسے تعمیری نشانے دئے جن میں وہ پوری طرح مشغول ہو جائیں اور باہمی ٹکراؤ سے بچتے ہوئے اپنی قوتوں کو مفید کاموں میں استعمال کریں۔ یہ تعمیری نشانے خاص طور پر دو تھے —— دعوت الی اللہ، اور علوم اسلامی کی تدوین۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے تمام اصحاب میں، اور آپ کے اصحاب نے تمام تابعین میں یہ تڑپ پیدا کر دی کہ وہ لوگوں کو اللہ کی طرف بلانے کے لئے اٹھ کھڑے ہوں۔ وہ اس وقت تک مطمئن نہ ہوں جب تک تمام انسانوں کو اللہ کی مرضی سے پوری طرح باخبر نہ کر دیں۔ اس داعیانہ مشن نے مسلمانوں کے جذبۂ عمل کو باہمی ٹکراؤ سے ہٹا کر خارجی پیغام رسانی کی طرف موڑ دیا۔

دوسرے مقصد کے تحت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تدبیر اختیار فرمائی کہ ابتداءً آپ نے اعلان فرمایا کہ: لاتکتبوا عنی غیر القرآن (مجھ سے قرآن کے سوا کچھ اور نہ لکھو) اس طرح آپ کی حیات میں لوگ قرآن کو پڑھنے پڑھانے اور اس کو جمع کرنے میں لگے رہے۔ آخر

عمر میں آپ نے لوگوں کو اپنی احادیث لکھنے کی اجازت دے دی۔

یہ ایک بے حد اہم قسم کی حکیمانہ تدبیر تھی۔ اس طرح آپ نے اپنے بعد امت کے اذہان کو حدیث کی جمع و تدوین میں لگا دیا۔ آپ کی وفات کے بعد کئی سو سال تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف اسباب سے جو تاریخی عظمت حاصل کی تھی، اس کی بنا پر آپ کی احادیث کو جمع کرنا ایک ایسا باعظمت کام بن گیا کہ اس زمانہ میں بڑے بڑے محدثین کو خلفاء و سلاطین سے بھی زیادہ اونچا درجہ معاشرہ میں حاصل ہو گیا۔ لوگ نہایت شوق اور محنت کے ساتھ اس کام میں لگ گئے۔ قرآن کی طرح اگر حدیث بھی آپ کی زندگی میں ایک کتاب کی صورت میں مدون ہو جاتی تو لوگوں کے لئے وہ اس سرگرمی کا سبب نہ بنتی جو عملاً پیش آیا۔

ابتداءً یہ کام صرف جمع حدیث یا تدوین حدیث کا کام تھا۔ پھر اس سے اور بہت سے علوم پیدا ہوئے۔ اولاً علوم حدیث، اس کے بعد علوم لغت، علوم تفسیر، علوم فقہ، علوم تاریخ، وغیرہ۔ اور جب مسلم معاشرہ میں علمی سرگرمیاں جاری ہوئیں تو وہ بالآخر علوم منقولات سے گزر کر علوم معقولات تک پہنچ گئیں۔ پوری مسلم دنیا علمی سرگرمیوں سے گونج اٹھی۔ تدوین حدیث کی مہم اپنے آخر میں پہنچ کر علوم اسلامی کی تدوین کی مہم بن گئی۔ اس طرح امت تقریباً ایک ہزار سال تک اس میں مشغول رہی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو سراسر تعمیری نشانہ دیا تھا۔ موجودہ زمانہ کے مسلم رہنماؤں نے اس کے برعکس مسلمانوں کو تخریبی نشانہ دے دیا۔

موجودہ زمانہ کے مسلم رہنماؤں کی بنیادی غلطی یہ ہے کہ انھوں نے اسلام کی تعبیر سیاسی انداز میں کی۔ موجودہ زمانہ کے مسلم رہنما مسلمانوں کے سیاسی زوال کے حالات سے متاثر ہو کر اٹھے۔ اس لئے ہر ایک نے، کسی ایک یا دوسری صورت میں یہی کیا کہ اسلام کو ایک سیاسی نظریہ کے روپ میں پیش کیا۔ اس تعبیر کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر ایک کا نشانہ سیاست بن گیا۔ ہر ایک کا ذہن یہ بن گیا کہ ہمیں سیاسی نظام میں تبدیلی لاکر دوبارہ اسلامی حکومت قائم کرنا ہے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سب سے اہم کام یہ قرار پایا کہ حکمراں افراد سے ٹکراؤ کیا جائے تاکہ ان کو ہٹا کر دوسرا نظام حکومت قائم کیا جاسکے۔

جن ملکوں میں حکومت غیر مسلموں کے ہاتھ میں تھی، وہاں وہ حکومت کے خلاف اس لئے ٹکرا گئے

کہ وہ "کافر" ہونے کی وجہ سے یہ حق نہیں رکھتے کہ وہ خدا کی زمین پر اپنا اقتدار قائم کریں۔ اور جہاں حکومت مسلم افراد کے ہاتھ میں تھی وہاں اس لئے وہ ان سے لڑ گئے کہ ان کے نزدیک وہ نام کے مسلمان تھے، اور خدا کے قانون کو زمین پر جاری نہیں کر رہے تھے۔

اس طرح مسلمان کی تصویر ساری دنیا میں لڑاکو قوم کی تصویر بن گئی۔ وہ غیر قوموں کے ملک میں بھی دہشت گرد کی نظر سے دیکھے جانے لگے اور خود اپنے ملک میں بھی۔

تعمیری کام کا نقشہ

دور اول میں جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو تدوین حدیث اور تدوین علوم اسلامی کا نشانہ دیا۔ اسی طرح موجودہ زمانہ کے مصلحین مسلمانوں کو ایک اعلیٰ تعمیری نشانہ دے سکتے تھے۔ یہ نشانہ تھا اسلامی لٹریچر کی تیاری اور اس کی اشاعت۔

موجودہ زمانہ میں ایک طرف پریس اور جدید مواصلات کے ظہور نے اشاعت کے بالکل نئے مواقع کھول دئے ہیں۔ اسی کے ساتھ مختلف تحریکوں اور مختلف انقلابات کے نتیجہ میں عالمی سطح پر فکر انسانی میں تبدیلی ہوئی ہے۔ آج کا انسان بالکل نئے انداز سے سوچتا ہے اور نئے انداز سے باتوں کو سمجھنا چاہتا ہے۔

ان حالات میں اسلامی لٹریچر کی اشاعت کا کام ایک ایسا عظیم کام بن گیا ہے کہ اگر امت کے تمام ذہین افراد اس کام میں لگ جائیں تو ایک صدی تک وہ ان کی مشغولیت کے لئے کافی ہو جائے۔

۱. اس سلسلے میں پہلا کام یہ ہے کہ قرآن کے ترجمے تمام زبانوں میں شائع کئے جائیں۔ اسی کے ساتھ حدیث اور سیرت کی مستند کتابوں کے ترجمے کر کے ان کو ساری دنیا میں اور تمام قوموں کے درمیان پہنچا دیا جائے تاکہ ان پر خدا کی حجت تمام ہو سکے۔

۲. دوسرا کام یہ ہے کہ جدید سائنٹفک انداز میں دعوتی لٹریچر تیار کیا جائے اور اس کو دنیا کی تمام اہم زبانوں میں شائع کر کے تمام قوموں میں پھیلا دیا جائے۔

۳. تیسرا کام یہ ہے کہ ہفتہ وار اور ماہوار پرچے اعلیٰ معیار پر ہر ملک میں شائع کئے جائیں۔ ان میں عالم اسلام کی خبریں۔ جدید دنیا کے موافق اسلامی واقعات اور دوسری مناسب چیزوں کو فراہم کر کے شائع کیا جائے۔

۴. چوتھا کام یہ ہے کہ خالص دعوتی انداز میں اجتماعات کئے جائیں۔ موجودہ زمانہ میں اجتماعات اور کانفرنسوں کا کام بڑے پیمانہ پر جاری ہے۔ مگر یہ کسی نہ کسی اعتبار سے احتجاجی اجتماعات ہیں۔ اس کے بجائے مثبت انداز پر دعوتی اجتماعات بڑے پیمانہ پر منظم کرنے کی ضرورت ہے۔

۵. ایسے تعلیمی ادارے قائم کئے جائیں جہاں دعوتی مقاصد کے تحت نصاب تیار کرکے لوگوں کی تعلیم وتربیت کی جائے۔

۶. ریسرچ ادارے قائم کئے جائیں جہاں جدید موضوعات پر اسلامی انداز میں تحقیق کا کام کیا جاسکے۔

مسلمان اگر اس قسم کے تعمیری کاموں میں لگ جائیں تو وہ اپنی قوت کے استعمال کا ایک مثبت میدان پالیں گے، اور اسی کے ساتھ وسیع تر انسانیت کے لئے اپنے آپ کو نفع بخش ثابت کرسکیں گے۔

صبر کا ہتھیار

۶ ستمبر ۱۹۸۰ کا واقعہ ہے۔ مسز کملیش (۲۲ سال) شاہدرہ کی ایک سڑک پر چل رہی تھیں۔ ان کے گلے میں سونے کی زنجیر تھی۔ اچانک اشوک نامی ایک شخص جس کی عمر ۲۵ سال تھی جھپٹا اور مسز کملیش کی زنجیر کھینچ کر بھاگا۔ پولیس کانسٹبل کشن چند تیاگی (۴۲ سال) اس وقت ڈیوٹی پر گھوم رہے تھے۔ کسی نے ان کو واقعہ کے بارہ میں بتایا۔ وہ تلاش کرتے ہوئے ایک بالمیکی مندر میں پہنچے جہاں مجرم موجود تھا۔ پولیس کی وردی دیکھتے ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا کشن چند نے اس کا پیچھا کیا۔ مجرم کے پاس ایک ریوالور تھا۔ اس نے فائر کیا تو اس کی گولی کشن چند کی آنکھ کے نیچے ان کے چہرہ اور گردن کو زخمی کرتی ہوئی گزر گئی۔ انھوں نے چلّا کر کہا "ایک بار تو نے مجھے مار دیا۔ پر دوبارہ تو نہیں مار سکتا۔ مجھے معلوم نہیں تھا تیرے پاس ریوالور ہے" اب وہ چوکنا ہو گئے۔ مجرم نے دو بار اور گولی چلائی۔ مگر ہر بار وہ نہایت پھرتی کے ساتھ بیٹھ گئے اور اس کے وار کو خالی کر دیا۔ کشن چند کسی خوف کے بغیر تنہا مجرم کا پیچھا کرتے رہے جب کہ "دشمن" کے پاس ریوالور تھا اور ان کے اپنے پاس لاٹھی بھی نہیں تھی۔ دوڑتے دوڑتے آخر کار ساڑھے چار فٹ کی ایک چہار دیواری سامنے آ گئی۔ مجرم اس پر کود گیا۔ کشن چند نے بھی فوراً چھلانگ لگائی اور دوسری طرف جا کر اس کو پکڑ لیا۔

"ایک مسلّح مجرم کو دوڑاتے ہوئے آپ کو ڈر نہیں لگا" ایک اخبار نویس نے کشن چند سے پوچھا "نہیں" انھوں نے جواب دیا۔ "میں جانتا تھا کہ جب اس کا ریوالور خالی ہو چکا ہو گا تو میں اس کو پکڑ لوں گا"۔ مجرم کے پاس تین گولی تھی۔ کشن چند نے نہایت ہوشیاری کے ساتھ اس کی تینوں گولیاں خالی کرا دیں۔ اب مجرم کا ہتھیار ناقابل استعمال ہو چکا تھا۔ کشن چند نے اس کو پکڑ لیا (ہندستان ٹائمز، ۷ ستمبر ۱۹۸۰)

اس چھوٹے سے واقعہ میں بہت بڑا سبق ہے۔ اکثر حالات میں حریف سے مقابلہ کا بہترین طریقہ یہ ہوتا ہے کہ ابتدائی مرحلہ میں اس کے وار کو خالی کر دیا جائے، یہاں تک کہ اس کے ہتھیار کی "تین گولی" ختم ہو جائے۔ پھر اس سے مقابلہ کرنا نہایت آسان ہو گا۔ مثلاً ایک

شخص آپ سے طاقت ور ہے اور وہ آپ کی کسی بات پر برہم ہوجاتا ہے۔ جب وہ آپ کو ڈانٹنا اور بگڑنا شروع کرے تو ابتداءً آپ اس کے وار کو خالی کر دیں، یعنی بالکل چپ ہوکر اس کی بات کو سنتے رہیں۔ یہاں تک کہ جب اس کے الفاظ ختم ہوجائیں اور اس کی بھڑاس نکل جائے، اس وقت سنجیدگی کے ساتھ صورت حال کے بارہ میں اس کو بتائیں۔ اگر آپ ابتداء میں اس قسم کا صبر دکھائیں تو آپ یقیناً کامیاب رہیں گے۔ کیوں کہ اب وہ اپنے ہتھیار کی "تین گولیاں" ختم کر چکا ہے اور اب بہت آسانی کے ساتھ اس کا مقابلہ کیا جاسکتا ہے۔

اسی طرح کچھ لوگ ہیں جو آپ کے خلاف متحد ہوکر آگئے ہیں اور آپ کو مٹا دینا چاہتے ہیں۔ غور کیجئے تو یہ اتحاد صرف اس بنیاد پر ہوگا کہ آپ ان کے سامنے ان کے حریف بن کر کھڑے ہوئے ہیں۔ اگر آپ حکمت عملی کا طریقہ اختیار کریں اور کچھ دیر کے لئے اپنے کو نشانہ سے ہٹا دیں تو آپ دیکھیں گے کہ ان کا اتحاد ٹوٹ رہا ہے۔ ان کے اتحاد کے ہتھیار کی گولی آپ کا حریف بن کر کھڑا ہونا تھا۔ جب آپ نے اپنے کو حریف کے مقام سے ہٹا دیا تو گویا آپ نے ان کی "تینوں گولیاں" خالی کرا دیں۔ اس کے بعد وہ اپنے آپ منتشر ہوجائیں گے اور جو گروہ اختلاف اور انتشار میں پڑجائے اس کو ختم کرنے کے لئے کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔ ایسا گروہ خود اپنے ہی ہاتھوں اپنے کو ختم کر لیتا ہے۔

کوئی حریف جب سامنے آتا ہے تو آدمی جوش میں آکر اس سے لڑنے لگتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پہلے ہی مرحلہ میں وہ حریف کی طاقت کا نشانہ بن جاتا ہے۔ اگر آدمی صبر اور دانش مندی سے کام لے اور مقابلہ کے ابتدائی مرحلہ میں حریف کے وار کو خالی جانے دے تو بہت جلد ایسا ہوگا کہ حریف خود اپنی کارروائیوں کے نتیجہ میں اپنے کو غیر مسلح کر چکا ہوگا۔ یاد رکھئے، کوئی بھی شخص جو آپ کے مقابلہ میں آتا ہے اس کے پاس ہمیشہ "تین" ہی گولیاں ہوتی ہیں۔ لاتعداد گولیاں کسی کے پاس نہیں ہوتیں۔ اگر آپ یہ ہوشیاری دکھائیں کہ مقابلہ کے آغاز میں کسی طرح اپنے کو نشانہ سے ہٹا لیں تو اس کے بعد یقینی طور پر ایسا ہوگا کہ دشمن اپنی "تین گولیوں" کو ختم کر کے خالی ہاتھ ہو چکا ہوگا۔ اب زیادہ بہتر طور پر وہ وقت آجائے گا کہ آپ اس کو زیر کر سکیں۔ یہ کامیابی ہر ایک حریف کے اوپر حاصل کی جاسکتی ہے۔ بشرطیکہ مقابلہ پیش

آنے کے بعد آدمی اپنے حواس کو نہ کھوئے۔

خدا جلدی نہیں چاہتا

ایک شخص اپنے عیسائی دوست سے ملنے گیا۔ جب وہ دوست کے یہاں پہنچا تو اس نے دیکھا کہ وہ اپنے گھر کے سامنے بے تابی کے ساتھ ٹہل رہے ہیں۔ "آج میں آپ کو پریشان دیکھ رہا ہوں، آخر کیا بات ہے۔" اس نے پوچھا۔ عیسائی دوست اچانک سنجیدہ ہو گئے۔ انھوں نے کہا:

I am in hurry, but God isn't

میں جلدی چاہتا ہوں۔ مگر خدا جلدی نہیں چاہتا۔ اس کے بعد انھوں نے اپنے صحن میں ایک مرجھائے ہوئے آم کے درخت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: میں نے اس کو بڑی امیدوں کے ساتھ پچھلے ہفتہ لگایا تھا۔ مگر اب وہ سوکھ کر ختم ہو چکا ہے۔

"یہ درخت تو کافی بڑا ہے، پھر ایک ہفتہ پہلے کیسے آپ نے اس کو لگالیا تھا۔" آدمی نے پوچھا۔ "یہی تو اصل بات ہے" عیسائی دوست نے کہا "میں نے چاہا کہ میں اچانک ایک بڑا درخت اپنے یہاں کھڑا کر دوں۔ مگر خدا کی اس دنیا میں ایسا ہونا ممکن نہیں۔ میں نے آم کا چھوٹا پودا بونے کے بجائے یہ چاہا کہ پانچ سال کا درخت لاکر اپنے صحن میں لگاؤں اور اس طرح پانچ سال کا سفر ایک دن میں طے کرلوں۔ میں نے درخت تو کہیں نہ کہیں سے لاکر لگالیا۔ مگر وہ اگلے ہی دن سوکھ گیا۔ اور اب اس کی جو صورت ہے وہ تم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو۔

اس کے بعد عیسائی دوست نے کہا: اس دنیا میں کسی چیز کو وجود میں لانے کے لئے خدا کا ایک قانون ہے۔ ہم اس قانون کی پیروی کرکے ہی اس چیز کو اپنے لئے وجود میں لاسکتے ہیں۔ اگر ہم قدرت کے اصول کی پیروی نہ کریں اور اپنی خواہشوں پر چلنے لگیں تو ہمارے حصہ میں "سوکھا درخت" آئے گا نہ کہ "ہرا بھرا باغ"۔

لکڑی کی ایک کشتی کی تاریخ اگر چھوٹے پودے سے شروع کی جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہر کشتی والا انتظار کرتا ہے کہ قدرت ایک درخت اگائے۔ زمین و آسمان کے تمام انتظامات

اس کو پروان چڑھانے کے لئے وقف ہوں۔ یہ کام سو برس تک ہوتا رہے۔ یہاں تک کہ جب مسلسل عمل کے نتیجہ میں ننھا پودا پختہ درخت کی عمر کو پہنچ جاتا ہے، اس وقت کشتی والا اس کو کاٹتا ہے۔ اس کے تختے بناتا ہے اور پھر ان تختوں کو لوہے کی کیلوں سے جوڑ کر وہ کشتی تیار کرتا ہے جو انسانی قافلوں کو پانی کے اوپر سفر کرنے کے قابل بنائے۔

ذاتی معاملات میں ہر آدمی اس بات کو جانتا ہے۔ مگر جب ملت کا معاملہ ہو تو وہ چاہتا ہے کہ فی الفور ایک عظیم الشان کشتی دریا میں اتار دے۔ خواہ اس کے پاس کشتی کے نام سے کاغذ کی ناؤ ہی کیوں نہ ہو۔

یاد رکھئے، یہ دنیا خدا کی دنیا ہے۔ اس کو خدا نے بنایا ہے۔ اور وہ اسی خدا کے قانون کے تحت چل رہی ہے۔ ہم اس سے موافقت کرکے اپنی زندگی کی تعمیر کرسکتے ہیں۔ اگر ہم اس کے ساتھ موافقت نہ کریں تو ہمیں اس دنیا میں کچھ ملنے والا نہیں۔

جس طرح درخت تدریج کے ساتھ اگتا ہے، اسی طرح انسانی زندگی کے معاملات بھی تدریج کے ساتھ درست ہوتے ہیں۔ اگر آپ اپنی زندگی کی تعمیر کرنا چاہتے ہیں تو سب سے پہلے قدرت کے اس تدریجی قانون کو جانئے اور اس کے ساتھ موافقت کرتے ہوئے اپنا سفر شروع کیجئے۔ اس کے سوا اس دنیا میں کامیابی کا کوئی اور راستہ نہیں۔ بقیہ تمام راستے کھڈ کی طرف جاتے ہیں نہ کہ کسی منزل کی طرف۔

قرآن میں بار بار صبر کی تاکید کی گئی ہے۔ صبر کا مطلب بے عملی نہیں، صبر دراصل منصوبہ بند عمل کا دوسرا نام ہے۔ بے صبر آدمی فوری ردعمل کے تحت بے سوچے سمجھے کارروائی کرتا ہے۔ اس کے برعکس صبر والا آدمی اپنے جذبات کو روک کر پورے معاملہ پر غور کرتا ہے۔ وہ اپنی طاقت اور دوسرے کی طاقت کا اندازہ کرتا ہے۔ وہ حالات کا جائزہ لیتا ہے۔ وہ قانون قدرت کو سمجھتا ہے جس کے دائرہ میں اس کو اپنا عمل کرنا ہے۔

اسی طرح سوچ بچار کے بعد عمل کا نقشہ بنانے کے لیے اپنے جذبات کو تھامنا پڑتا ہے، اس لیے اس کو شریعت میں صبر کہا گیا ہے۔ موجودہ زمانہ میں اسی کو منصوبہ بند عمل کہتے ہیں۔ اس دنیا میں صابرانہ عمل ہمیشہ کامیاب ہوتا ہے، اور غیر صابرانہ عمل ہمیشہ ناکام۔

اللہ تعالیٰ نے دنیا کا نظام اس طرح بنایا ہے کہ یہاں عُسر میں یُسر ہے۔ یہاں ہر ڈِس ایڈوانٹج کے ساتھ ہمیشہ ایڈوانٹج موجود ہوتا ہے۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے :

الم نشرح لَكَ صَدْرَكَ ووضعنا عنك وزرك الذی انقض ظهرك و رفعنا لك ذكرك فَاِنَّ مَعَ العُسرِ يُسراً ان مع العُسر يسراً فاذا فَرَغْتَ فانصب و الیٰ رَبِّكَ فارغب

کیا ہم نے تمہارا سینہ تمہارے لئے کھول نہیں دیا۔ اور تمہارا وہ بوجھ اتار دیا جو تمہاری پیٹھ کو توڑ رہا تھا۔ اور ہم نے تمہارا ذکر بلند کیا۔ پس مشکل کے ساتھ آسانی ہے، بے شک مشکل کے ساتھ آسانی ہے۔ پس جب تم فارغ ہو جاؤ تو محنت کرو، اور اپنے رب کی طرف توجہ رکھو (الانشراح)

یہ سورہ مکّہ کے ابتدائی زمانہ میں اتری۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں جب دعوت توحید کا آغاز کیا تو یہ ان تمام لوگوں کو دینی لحاظ سے غیر معتبر ٹھہرانے کے ہم معنی تھا جو غیر اللہ کی بنیاد پر بڑائی اور سرداری کا مقام حاصل کئے ہوئے تھے۔ چنانچہ یہ لوگ آپ کے سخت دشمن ہو گئے۔ وہ آپ کو طرح طرح کی اذیتیں پہنچانے لگے۔ اس صورت حال نے آپ کو سخت پریشانی میں مبتلا کر دیا۔

اس وقت اس سورہ کے ذریعے آپ کو ایک سنّت الٰہی سے باخبر کیا گیا۔ وہ یہ کہ اس دنیا میں یُسر کا رشتہ عُسر سے بندھا ہوا ہے۔ اس دنیا میں مشکل کا پیش آنا کسی نئی آسانی کی تمہید ہوتا ہے، بشرطیکہ آدمی حوصلہ نہ کھوئے اور آنے والے بہتر مستقبل کا انتظار کر سکے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت سے پہلے یہ مرحلہ گزرا کہ آپ حق کی تلاش میں سخت سرگرداں ہوئے۔ وقت کے ماحول اور مروّجہ مذہب میں آپ کو اطمینان نہیں مل رہا تھا۔ "سچائی کیا ہے" اس سوال نے آپ کی راتوں کی نیند اور دن کا سکون غارت کر دیا۔ یہ اضطراب اگرچہ ابتداءً "عسر" تھا، مگر اس کے اندر "یسر" کا پہلو نکل آیا۔ کیوں کہ اس نے آپ کو خشک زمین کی مانند بنا دیا تاکہ جب وحی کی صورت میں ہدایت آئے تو اس کی ایک ایک بوند آپ کے اندر جذب ہوتی چلی جائے۔ آپ بھرپور طور پر اس کو اخذ کر لیں۔ وہ پوری طرح آپ کے ذہن کو واضح اور روشن کر دے۔

دوسری چیز جو مذکورہ سنت کے لئے بطور مثال پیش کی گئی، وہ رفع ذکر کا معاملہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت توحید سے جن لوگوں کو مخالفت پیدا ہوئی، انھوں نے اس کو ناکام

کرنے کے لئے دعوت اور صاحب دعوت کو بدنام کرنے کی ہم شروع کر دی۔ وہ آپ کے خلاف اشعار کہہ کر اس کو پھیلاتے جو گویا اس زمانہ کی صحافت تھی۔ میلے اور بازار جو گویا اس زمانہ کے اجتماعات تھے، وہاں جاکر وہ لوگوں کو آپ کے خلاف بھڑکاتے۔ وہ لوگوں کے سامنے آپ کی بری تصویر پیش کرتے تاکہ وہ آپ سے اور آپ کے سچے مشن سے بدگمان ہو جائیں۔

مخالفین نے عیب جوئی اور الزام تراشی کی جو مہم چلائی، اس کا مقصد ان کے اپنے خیال کے مطابق یہ تھا کہ صاحب دعوت کو بدنام کریں اور اس طرح لوگوں کو آپ کی دعوت سے متوحش کر دیں۔ مگر اس عسر میں بھی یسر کا پہلو نکل آیا۔ مخالفین کے نزدیک وہ آپ کو بدنام کرنے کی کوشش تھی، مگر دوسروں کے لئے وہ تجسس کے ہم معنی بن گئی۔ اس طرح آپ کی شخصیت نہایت وسیع پیمانہ پر لوگوں کے سامنے سوال بن کر کھڑی ہو گئی۔ ہر آدمی تفصیلی طور پر یہ جاننے کا طالب بن گیا کہ محمد کون ہیں اور ان کی دعوت کیا ہے۔

انسانی فطرت کبھی جزئی علم پر قانع نہیں ہوتی۔ وہ ہمیشہ پوری بات جاننا چاہتی ہے۔ چنانچہ آپ کے خلاف کچھ باتیں سن کر لوگ اتنے ہی پر رک نہیں جاتے تھے، بلکہ وہ دعوت اور صاحبِ دعوت کے بارہ میں مزید معلومات حاصل کرنے کے لئے براہ راست تحقیق کرتے تھے۔ وہ آپ سے ملتے اور قرآن کا مطالعہ کرتے۔ اس طرح مخالفین کی مخالفت کا یہ نتیجہ ہوا کہ آپ کی دعوت ان دور دور کے حلقوں میں پہنچ گئی جہاں آپ خود ابھی تک اس کو نہیں پہنچا سکے تھے۔ مخالفین نے آپ کو بدنام کر کے آپ کے بارہ میں لوگوں کے اندر شوق تحقیق پیدا کیا۔ اور جب ان لوگوں نے براہ راست تحقیق کی تو ان میں سے بہت سے لوگ آپ کی دعوت کو حق پاکر اس کے حامی بن گئے۔

اس سورہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا گیا کہ عُسر کے یُسر میں تبدیل ہونے کا دو تجربہ تم کر چکے ہو —— تلاش حق کی بے چینی کے بعد ہدایت کا ملنا، بدنامی کی مہم سے اشاعتِ دعوت کے نئے مواقع پیدا ہونا۔ اسی طرح اس سنت الٰہی کا تیسرا ظہور بھی عنقریب تمہارے سامنے آجائے گا۔ حالات کی فطری رفتار کو اپنی حد پر پہنچنے دو اور مستقبل کے ظہور تک صبر کے ساتھ اس کا انتظار کرو۔

اس تیسرے دور سے مراد دعوت اور صاحب دعوت کا نزاعی دور سے نکل کر مسلّمہ دور میں

داخل ہونا ہے۔ جس کو سورہ نصر میں "فتح" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ موجودہ دور نزاع میں جو سخت حالات پیش آرہے ہیں، وہ آنے والے یسر کی تمہید ہیں۔ اس طرح وہ تمام ضروری اسباب جمع کئے جارہے ہیں کہ آئندہ جب مرحلہ استحکام آئے تو وہ حقیقی معنوں میں استحکام اور ثبات بن سکے۔

اس عمل کے دوران دعوت کے تمام پہلو پوری طرح واضح ہو جائیں۔ سچے انسان اور جھوٹے انسان ایک دوسرے سے الگ کر دئے جائیں۔ یہ معلوم ہو جائے کہ کون واقعی معنوں میں حق کا طالب ہے اور وہ کون لوگ ہیں جو حق کا نام صرف اس لئے لیتے ہیں کہ اس کی آڑ میں اپنا ذاتی مفاد حاصل کر سکیں۔ گم نامی میں پڑے ہوئے جواہر نکھر اٹھیں اور مصنوعی شہرت کا لبادہ اوڑھنے والے لوگ بے نقاب ہو جائیں۔

نیز یہ کہ جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو اور آپ کی فکر کو ماحول میں غلبہ حاصل ہو تو اس طرح ہو کہ وہ ان کا ایک ثابت شدہ حق بن چکا ہو، اور اسی طرح جب آپ کے مخالفین کو مغلوب کیا جائے تو یہ مغلوبیت اس طرح آئے کہ وہ لوگوں کو ایک کھلی ہوئی تاریخی ضرورت دکھائی دینے لگے۔

عُسر میں یُسر کا یہ تجربہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہوا، یہی آئندہ بھی آپ کے امتیوں کو ہوتا رہے گا، بشرطیکہ وہ اسی صراط مستقیم پر چلیں جس پر آپ چلے اور اسی صبر اور استقامت کا ثبوت دے سکیں جس کا ثبوت آپ نے اپنے زمانہ میں دیا۔

فرقہ وارانہ مسئلہ

الرسالہ مارچ ۱۹۸۹ کے سرورق پر لکھا گیا تھا ــــــ ہر قسم کے فساد کے خلاف سب سے بڑا روک صرف ایک ہے : اشتعال انگیزی کے باوجود مشتعل نہ ہونا۔

اس میں شک نہیں کہ یہی فسادات کو روکنے کا واحد کارگر اصول ہے۔ اس کے سوا جو باتیں کہی جاتی ہیں وہ سب کی سب صرف جھگڑے کو بڑھانے والی ہیں نہ کہ اس کو ختم کرنے والی۔ مزید یہ کہ اس اصول کا تعلق صرف ہندستان سے نہیں، بلکہ تمام دنیا سے ہے۔ خواہ مسلم ملک ہو یا غیر مسلم ملک، ایک قوم کا معاملہ ہو یا کئی قوموں کا معاملہ، ہر جگہ فساد سے بچنے اور پر امن زندگی گزارنے کا یہی بے خطا اصول ہے۔ مسلمانوں کو جہاں کہیں بھی پر امن زندگی حاصل ہے، وہ اسی لیے حاصل ہے کہ وہاں انھوں نے یہ قیمت ادا کر دی ہے۔ اور جہاں کہیں انھیں پر امن زندگی حاصل نہیں، وہ اسی لیے حاصل نہیں کہ وہاں وہ یہ ضروری قیمت دینے کے لیے تیار نہ ہو سکے۔

مسلمانوں کے لیڈر اور دانشور اب تک جس روش پر قائم رہے ہیں، اس کو، ایک لفظ میں، دل کی بھڑاس نکالنا کہا جا سکتا ہے۔ مگر الفاظ بول کر دل کی بھڑاس نکالنا کسی مسئلہ کا حل نہیں۔ ضرورت ہے کہ اب اس معاملہ میں اپنی کوششوں کو نتیجہ رخی (Result-oriented) بنایا جائے۔ مسئلہ کا حل تلاش کرنے پر ساری توجہ صرف کی جائے نہ کہ مسئلہ کے خلاف لفظی احتجاج کرنے پر۔

ہندستان کے فسادات

ہندستان میں پچھلی آدھی صدی سے فرقہ وارانہ فسادات ہو رہے ہیں۔ ان فسادات کی کہانی ہمیشہ تقریباً ایک ہوتی ہے۔ انتہا پسند ہندوؤں کی طرف سے کوئی اشتعال انگیز کارروائی کی جاتی ہے۔ اس پر مسلمان مشتعل ہو کر جوابی کارروائی کرتے ہیں۔ اب نزاع بڑھتی ہے، یہاں تک کہ باقاعدہ فساد ہو جاتا ہے جو بالآخر مسلمانوں کے سخت جانی و مالی نقصان پر ختم ہوتا ہے۔

ایسے موقع پر مسلم رہنما اور دانشور ہمیشہ مسلمانوں کے ردعمل کو یہ کہہ کر جائز قرار دیتے ہیں کہ وہ جوابی طور پر پیش آیا۔ اس سلسلہ میں کوٹہ (راجستھان) کے فساد کی مثال لیجئے۔ ایک مسلم انگریزی ہفت روزہ (۸۔۱۴ اکتوبر ۱۹۸۹) کی اپنی رپورٹ کے مطابق، ۱۴ ستمبر ۱۹۸۹ کو کوٹہ میں ہندوؤں نے اننت چتردشی کا جلوس نکالا۔ یہ جلوس مسلم علاقہ سے گزرا۔ وہاں اس نے اشتعال انگیز نعرے لگائے جو مسلمانوں کے جذبات

کو مجروح کرنے والے تھے۔ مسلمانوں نے جلوس والوں کو ایسے نعرے لگانے سے روکا۔ مگر وہ نہیں رکے۔ اس کے بعد مسلمانوں نے بھی جوابی طور پر نعرے بلند کیے۔ اس کے بعد (ہندوؤں کی طرف سے) مسلمانوں پر پتھر پھینکے گئے۔ اس کے جواب میں مسلمانوں نے بھی ان پر پتھر پھینکے۔ اس کے بعد فساد بھڑک اٹھا۔ ۱۰ مسلمان مارے گئے۔ بہت سے زخمی ہوئے۔ ان کی بہت سی دکانیں اور مکانات جلا دیے گئے۔ (صفحہ ۳) نیز دعوت ۱۳ اکتوبر ۱۹۸۹

اسی طرح بدایوں (یوپی) میں ۲۸ ستمبر ۱۹۸۹ کو فرقہ وارانہ فساد ہوا جس میں مسلمانوں کا زبردست جانی و مالی نقصان ہوا۔ اس کا مختصر قصہ یہ ہے کہ اتر پردیش کی کانگرسی حکومت نے اردو کو ریاست کی سکنڈ لینگویج قرار دینے کا بل پاس کیا۔ اس پر بدایوں کے شری کرشن انٹر کالج کے ہندو طلبہ نے اردو کی مخالفت میں ایک جلوس نکالا۔ اس جلوس میں مشتعل کرنے والے نعرے لگائے گئے۔ یہ جلوس کلکٹریٹ تک جاکر ختم ہوگیا اور اس دن کوئی فساد پیش نہیں آیا۔

اگلے دن (۲۸ ستمبر) کو بدایوں کے اسلامیہ انٹر کالج کے مسلم طلبہ نے تقریباً تین سو کی تعداد میں جمع ہوکر جوابی جلوس نکالا۔ یہ جلوس نعرہ لگاتا ہوا شری کرشن انٹر کالج کے سامنے سے گزرا۔ وہاں مسلم طلبہ پر پتھراؤ ہوا۔ اس کے جواب میں مسلمانوں نے بھی ویسا ہی کیا۔ اس کے بعد فرقہ وارانہ فساد پھوٹ پڑا (قومی آواز ۹ اکتوبر ۱۹۸۹)

یہی اکثر فسادات کی کہانی ہے۔ مسلم ترجمانوں کے خود اپنے بیان کے مطابق، ہندوؤں کی طرف سے جلوس، لاؤڈ اسپیکر، ہولی کے رنگ، نعرہ بازی یا اور کسی صورت میں اشتعال انگیزی کا واقعہ پیش آتا ہے۔ اس پر مسلمان مشتعل ہوکر ان سے ٹکرا جاتے ہیں۔ اب لڑائی بڑھتی ہے اور باقاعدہ فساد کی صورت اختیار کرلیتی ہے جو "نزلہ بر عضو ضعیف" کے اصول پر ہمیشہ مسلمانوں کے جانی و مالی نقصان پر ختم ہوتی ہے۔

منفی ردعمل

مسلمانوں کا یہ طریقہ منفی ردعمل کا طریقہ ہے۔ اور ایسا طریقہ یقینی طور پر قرآن وسنت کے خلاف ہے۔ ایسے مواقع پر قرآن نے اعراض کا حکم دیا ہے نہ کہ جوابی طور پر الجھنے کا۔ یہ صحیح ہے کہ مذکورہ قسم کی جوابی کارروائی میں مسلمانوں کا ایک محدود طبقہ ہی ملوث ہوتا ہے۔ مگر دوسرے مسلمان، خاص طور پر مسلمانوں کا رہنما اور دانشور طبقہ، بھی پوری طرح اس میں شریک ہے، کیونکہ وہ ان کی مذمت نہیں کرتا، بلکہ ان کی جوابی کارروائی کو جائز قرار دے کر ان کا لفظی دفاع کرتا ہے۔ کچھ مسلمان اگر اس منفی ردعمل میں براہ راست طور پر شریک ہیں تو بقیہ مسلمان

اس میں بالواسطہ طور پر شریک قرار پاتے ہیں۔

مسلمان پچھلے پچاس برس سے اسی جوابی روش پر قائم ہیں اور وہ اس کو جہاد سمجھتے ہیں۔ مگر اصل مسئلہ کا حل نہ ہونا بلکہ اس کا بڑھتے رہنا ثابت کرتا ہے کہ وہ خدا کی منشا کے خلاف ہے۔ اگر ان کا عمل خدا کی منشا کے مطابق ہوتا تو خدا کی مدد آتی اور مسئلہ کو حل کر دیتی۔ مگر جان و مال کی بے پناہ ہلاکت کے باوجود اب تک اس معاملہ میں خدا کی مدد نہیں آئی۔ یہی واقعہ یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ مسلمانوں کا یہ عمل خدا کے نقشہ کے مطابق نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اب آخری وقت آگیا ہے کہ مسلمان اور ان کے رہنما اپنی اس روش کو مکمل طور پر بدل ڈالیں۔ ورنہ اندیشہ ہے کہ صورت حال اور خراب ہو جائے۔ اب تک وہ انسانوں کی پکڑ میں تھے، آئندہ وہ خدائے ذو الجلال کی پکڑ میں آجائیں۔

قرآن وحدیث کی رہنمائی

مسلمانوں کا یہ طریقہ منفی ردعمل کا طریقہ ہے، اور اس قسم کے ردعمل سے قرآن وحدیث میں صراحۃً منع کیا گیا ہے۔ قرآن میں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ بھلائی اور برائی دونوں برابر نہیں۔ تم جواب میں وہ کہو جو اس سے بہتر ہو۔ پھر تم دیکھو گے کہ تم میں اور جس میں دشمنی تھی، وہ ایسا ہو گیا جیسے کوئی دوست قرابت والا۔ اور یہ بات انھیں کو ملتی ہے جو صبر کرنے والے ہیں، اور یہ بات اسی کو ملتی ہے جو بڑا نصیبہ والا ہے (حم السجدہ ۳۴ ـ ۳۶)

حضرت عبد اللہ بن مسعود سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ان اللہ لا یمحوا السیئ بالسیئ ولکن یمحوا السیئ بالحسن ـ ان الخبیث لا یمحوا الخبیث (مشکاۃ المصابیح، الجزء الثانی، صفحہ ۸۴۵)	اللہ برائی کو برائی کے ذریعہ نہیں مٹاتا بلکہ برائی کو بھلائی کے ذریعہ مٹاتا ہے۔ بری چیز کبھی بری چیز کو نہیں مٹاتی۔

حضرت عبد اللہ بن عباس نے مذکورہ قرآنی آیت کی تشریح ان الفاظ میں کی ہے:

امر اللہ المومنین بالصبر عند الغضب والحلم عند الجھل والعفو عند الإساءة فاذا فعلوا ذلك عصمھم اللہ من الشیطان وخضع لھم عدوھم کانہ ولی حمیم	اللہ نے اہلِ ایمان کو حکم دیا ہے غصہ کے وقت صبر کا، جہالت کے وقت برداشت کا، اور برائی کے وقت معافی کا۔ جب وہ ایسا کریں تو اللہ انہیں شیطان سے محفوظ کر دے گا اور ان کے دشمن کو ان کے لیے جھکا دے گا۔ گویا

کہ وہ ان کا قریبی دوست ہو۔ (تفسیر ابن کثیر، الجزء الرابع، صفحہ ۱۰۱)

مذکورہ آیت اور حدیث اور صحابی کی تشریح کو سامنے رکھ کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ ہندستان کے موجودہ حالات میں مسلمان جو کچھ کرتے رہے ہیں وہ سراسر شریعت اسلامی کے خلاف ہے۔ مسلمان ردعمل کا طریقہ اختیار کیے ہوئے ہیں، حالانکہ صحیح یہ ہے کہ وہ صبر واعراض کا طریقہ اختیار کریں۔

مسلمان اپنے نام نہاد رہنماؤں کے بتائے ہوئے حل پر پچاس برس تک کم از کم پچاس ہزار بار عمل کر چکے اور ہمیشہ ناکام رہے۔ اب انھیں خدا اور رسولؐ کے بتائے ہوئے طریقہ کا تجربہ کرنا چاہیے۔ وہ یہ کہ مسلمان برائی کے بدلہ میں بھلائی کی روش اختیار کریں۔ وہ شور کا جواب خاموشی سے دیں اور نفرت کے مقابلہ میں محبت کا مظاہرہ کریں۔

خدا نے اپنی دنیا کا جو نظام بنایا ہے اس میں برائی کا خاتمہ جوابی برائی سے نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کا خاتمہ اس طرح ہوتا ہے کہ برائی کے جواب میں بھلائی کی جائے۔ خدا کی دنیا میں صبر کی طاقت غصہ سے زیادہ ہے۔ یہاں جہالت کے مقابلہ میں برداشت زیادہ وزن رکھتی ہے۔ یہاں انتقام کے بجائے معاف کر دینا اپنے اندر تسخیری طاقت رکھتا ہے۔ یہاں دشمن کو زیر کرنے کا سب سے زیادہ کارگر طریقہ یہ ہے کہ اس کے ساتھ دوستی اور خیر خواہی کا معاملہ کیا جائے۔

نرمی اور تحمل کے طریقہ کی اہمیت حدیث میں مختلف طریقوں سے نہایت وضاحت کے ساتھ بتائی گئی ہے۔ اس سلسلہ کی ایک حدیث یہاں نقل کی جاتی ہے:

ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال: ان اللّٰہ تعالیٰ رفیق یحب الرفق ویُعطی علی الرفق مالا یُعطی علی العنف ومالا یعطی علی ما سواہ۔ ۔ ۔ انّ الرفق لایکون فی شیئٍ الازانہ ولا یُنزع من شیئٍ الاشانہ ۔ ۔ ۔ من یحرم الرفق یُحرم الخیر (مشکاۃ المصابیح — الجزء الثالث، صفحہ ۱۴۰۷)

رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللّٰہ تعالیٰ نرم ومہربان ہے اور نرمی ومہربانی کو پسند کرتا ہے۔ اللّٰہ نرمی پر وہ چیز دیتا ہے جو وہ سختی پر نہیں دیتا اور نہ کسی اور چیز پر دیتا۔ نرمی جس چیز میں بھی ہو وہ اس کو زینت دے گی۔ اور وہ جس چیز سے بھی اٹھ جائے وہ اس کو عیب دار بنا دے گی۔ جو شخص نرمی سے خالی ہو وہ ہر بھلائی سے خالی ہو جائے گا۔

صبر واعراض ایک اعلیٰ ترین حفاظتی تدبیر ہے۔ اس تدبیر کے ذریعہ آپ فساد کے ہر بم کو یقیناً ناکارہ

(Defuse) کر سکتے ہیں۔ یہ حل ہم خرما و ہم ثواب کا مصداق ہے۔ اس کو اختیار کرکے مسلمان اپنا مسئلہ بھی حل کریں گے، اور اسی کے ساتھ انھیں عبادت کا ثواب بھی حاصل ہوگا، کیونکہ یہ حل خود خدا و رسولؐ کی طرف سے ہمیں بتایا گیا ہے۔

مثبت طرز عمل کی مثال

اوپر کوٹہ اور بدایوں کی مثال نقل کی گئی ہے جب کہ مسلمانوں نے منفی ردعمل کا طریقہ اختیار کیا اور اس کا برا انجام ان کے سامنے آیا۔ اب اس کے برعکس دو مثالیں لیجئے جب کہ مسلمانوں نے جوابی کارروائی سے پرہیز کرتے ہوئے مثبت روش اختیار کی۔ اس کے نتیجہ میں ان کے جان و مال بربادی سے محفوظ رہے۔

فروری ۱۹۸۹ میں شیوگنج (راجستھان) میں ہیڈگواڑ جنم شتابدی کے موقع پر ہندوؤں نے جلوس نکالا۔ جلوس مقامی جامع مسجد کے سامنے پہنچ کر اشتعال انگیز نعرے لگانے لگا۔ مگر وہاں کوئی مسلمان ان کا جواب دینے یا روک ٹوک کرنے کے لیے سامنے نہیں آیا۔ اس کے برعکس یہ ہوا کہ مسجد کے امام مولانا خدا بخش بلوچ باہر نکلے۔ انھوں نے جوابی اشتعال کا مظاہرہ کرنے کے بجائے سادہ طور پر یہ کیا کہ جلوس کے افراد سے دوستانہ ملاقات شروع کردی۔ ان کے "آداب عرض" کو دیکھ کر جلوس کے نوجوان بھی "مولوی جی نمستے، مولوی جی نمستے" کے الفاظ بولنے لگے۔ اس کے بعد جلوس کا سارا زور اپنے آپ ختم ہوگیا۔ پانچ منٹ میں لوگ ٹھنڈے ہوکر اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے۔

دوسری مثال دہلی کی ہے۔ ۲۲ ستمبر ۱۹۸۹ کو وشو ہندو پریشد کی طرف سے دہلی میں "وراٹ ہندو سمیلن" منایا گیا۔ بوٹ کلب پر بڑی تعداد میں ہندو جمع ہوئے۔ وہاں اشتعال انگیز تقریریں کی گئیں اور مخالفانہ نعرے لگائے گئے۔ ہندوؤں کا یہ ہجوم بوٹ کلب سے واپس ہوا تو وہ مسلم مخالف نعرے لگا رہا تھا۔ مثلاً "ہندو بن کر رہنا ہوگا، بندے ماترم کہنا ہوگا" وغیرہ۔ انھوں نے اپنے راستہ میں مسجدوں کی بے حرمتی کی۔ نئی دہلی کی ایک مسجد کا بورڈ توڑ ڈالا۔ وغیرہ

یہ سب کچھ ہوا۔ مگر دہلی کے مسلمان پوری طرح اعراض کی پالیسی پر قائم رہے۔ انھوں نے سنا مگر اپنے کان بند کرلیے۔ انھوں نے دیکھا مگر اپنی نظریں پھیر لیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ نہ ۲۲ ستمبر کو دہلی میں کوئی فساد ہوا اور نہ اس کے بعد۔ ہندوؤں کے مخالفانہ الفاظ وقتی شور وغل بن کر فضا میں تحلیل ہو گئے۔

یہ صرف دو مثالیں نہیں ہیں۔ اس طرح کی مثالیں بڑی تعداد میں ہر جگہ پائی جاتی ہیں۔ حقیقت یہ

ہے کہ فساد ہونے کے مقابلہ میں فساد نہ ہونے کے واقعات کی تعداد کہیں زیادہ ہے۔ مگر اول الذکر واقعات اخباروں میں چھپ کر مشہور ہو جاتے ہیں۔ جب کہ ثانی الذکر واقعات اخباروں میں نہیں چھپتے، اس لیے وہ لوگوں کے علم میں بھی نہیں آتے۔

صحابی کی نصیحت

ہندستان کے فسادات کا بہترین حل وہ ہے جو ایک صحابی نے ۱۴ سو سال پہلے بتا دیا تھا یہ حضرت عُمیر بن حبیب بن خُماشہ ہیں۔ انھوں نے اپنے لڑکے کو نصیحت کرتے ہوئے کہا:

من لا یرضی بالقلیل مما یأتی بہ السفیہ یرضی بالکثیر (حیاۃ الصحابۃ، الجزء الثانی، صفحہ ۶۴۷)

جو شخص نادان کی طرف سے پیش آنے والی چھوٹی تکلیف پر راضی نہ ہوگا اس کو نادان کی طرف سے بڑی تکلیف پر راضی ہونا پڑے گا۔

صحابی کے اس قول میں زندگی کی ایک حقیقت بتائی گئی ہے۔ یہ ڈیڑھ ہزار سال پہلے کے دور میں جتنی بامعنی تھی، اتنی ہی بامعنی وہ آج بھی ہے۔ وہ جس طرح مسلم اکثریت کے ملک میں اہمیت رکھتی تھی، اسی طرح وہ غیر مسلم اکثریت کے ملک میں بھی اہمیت رکھتی ہے۔

موجودہ دنیا ایک ایسی دنیا ہے جہاں بہر حال دوسروں کی طرف سے تکلیف کی باتیں پیش آتی ہیں۔ یہاں عقل مندی اور کامیابی یہ ہے کہ ابتدائی چھوٹی تکلیف کو برداشت کر لیا جائے۔ اگر آپ ایسا نہ کریں تو معاملہ بڑھتا ہے اور زیادہ بڑی تکلیف سے سابقہ پیش آتا ہے۔ بڑی تکلیف سے بچنے کا واحد راز چھوٹی تکلیف کو نظر انداز کرنا ہے۔ یہی کامیاب زندگی کا واحد اصول ہے، خواہ گھر کا معاملہ ہو یا سماج کا معاملہ یا پورے ملک کا معاملہ۔

اس کی ایک مثال جلوس کا مسئلہ ہے۔ ۱۹۴۷ سے پہلے ہندوؤں کا جلوس باجا بجاتا ہوا مسجد کے سامنے سے گزرتا تھا اس وقت مسلمانوں نے باجا کو برداشت نہیں کیا اور جلوس کی روٹ بدلنے پر اصرار کیا۔ اس سے مسئلہ تو ختم نہیں ہوا۔ البتہ بعد کو مزید یہ خرابی پیدا ہوئی کہ ہندوؤں کا جلوس اسی کے ساتھ مسلم مخالف نعرے بھی لگانے لگا۔ اس پر مسلمانوں نے دوبارہ روک ٹوک کی۔ اب یہ ہوا کہ جلوس اور نعرہ تو ختم نہیں ہوا۔ البتہ اس میں تیسری چیز کا اضافہ ہوا۔ وہ یہ کہ جلوس باجے اور نعرے کے ساتھ ٹرک میں پتھر بھر کر چلنے لگا تاکہ مسجدوں اور مسلم محلوں پر خشت باری کرتا ہوا گزرے۔ مزید یہ کہ پہلے اگر جلوس سال میں چند بار

نکلتا تھا تو اب وہ روزانہ اور ہر جگہ نکلنے لگا۔

بڑھتے ہوئے مسائل کی یہ صورت حال صحابی کی نصیحت کی تصدیق کرتی ہے۔ وہ مسلمانوں کی ردعمل کی سیاست کو بالکل بے فائدہ ثابت کر رہی ہے۔ اب آخری وقت آگیا ہے کہ مسلمان صحابی کی مذکورہ نصیحت کی اہمیت کو سمجھیں اور ردعمل کی روش کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیں۔

دوسری غلطی نہیں

فساد کا حل سادہ لفظ میں صرف ایک ہے ——— "دوسری غلطی نہ کیجئے"۔ ایک فریق کی طرف سے کی جانے والی پہلی غلطی کبھی فساد تک نہیں پہنچ سکتی، جب تک فریق ثانی دوسری غلطی نہ کرے۔ جس طرح دونوں ہاتھوں کو حرکت میں لائے بغیر تالی نہیں بجتی، اسی طرح صرف پہلی غلطی فساد برپا کرنے کی طاقت نہیں رکھتی۔ مسلمان اگر یہ طے کر لیں کہ وہ فرقہ پرست عناصر کی پہلی غلطی کے باوجود کبھی دوسری غلطی نہ کریں گے تو صرف اس ایک فیصلہ سے وہ فساد کے امکان کو ہمیشہ کے لیے ختم کر سکتے ہیں۔

پہلی غلطی کے بعد دوسری غلطی کرنا فساد کو پھیلنے کا موقع دینا ہے۔ اس کے برعکس جب پہلی غلطی کے بعد دوسری غلطی نہ کی جائے تو فساد اپنے پہلے ہی مرحلہ میں ختم ہو کر رہ جائے گا۔ پہلی غلطی کے بعد دوسری غلطی کرنا گویا آگ پر پٹرول ڈالنا ہے، اور پہلی غلطی کے بعد دوسری غلطی نہ کرنا گویا آگ پر پانی ڈالنا۔

مسلمان ہر سال بے شمار تعداد میں سیرۃ النبیؐ کے جلسے کرتے ہیں۔ ان جلسوں میں پرفخر طور پر کہا جاتا ہے کہ "سلام اس پر کہ جس نے گالیاں کھا کر دعائیں دیں"، مسلم شعراء جوش و خروش کے ساتھ اس قسم کی نظمیں پڑھتے ہیں:

راہ میں جس نے کانٹے بچھائے گالی دی پتھر برسائے   اس پر چھڑکی پیار کی شبنم صلی اللہ علیہ وسلم

اب وقت آگیا ہے کہ مسلمان اپنے پیغمبر کی جس صفت کو بطور فخر پیش کرتے رہے ہیں، اس کو اپنی زندگیوں میں بطور نمونہ اختیار کر لیں۔ اس کے بعد وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سچے امتی بھی بن جائیں گے اور اسی کے ساتھ تعصب اور ظلم اور فساد کا مسئلہ بھی ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گا جس طرح وہ رسول اور اصحابِ رسول کے لیے اسی طریقہ کو اختیار کرنے کی بنا پر ختم ہو گیا تھا۔

داعیانہ اخلاق

صبر و اعراض کی اہمیت صرف اس لحاظ سے نہیں ہے کہ وہ فرقہ وارانہ فساد کے مسئلہ کا حل ہے۔ اس

سے بڑھ کر یہ کہ اپنی داعیانہ حیثیت کی بنا پر مسلمانوں کو لازماً ایسا ہی کرنا چاہیے۔ مسلمان خدا کی طرف سے خدا کے دین کا داعی ہے۔ ہندو اور دوسری تمام قومیں اس کے لیے مدعو کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اور جو لوگ مدعو کی حیثیت رکھتے ہوں، ان کے بارہ میں خدا کا حکم ہے کہ ان کی طرف سے پیش آنے والی ناخوش گواریوں کو یک طرفہ طور پر برداشت کیا جائے۔ تاکہ داعی اور مدعو کے درمیان تناؤ کی فضا پیدا نہ ہونے پائے۔ کیونکہ تناؤ کی فضا میں کوئی دعوتی کام نہیں کیا جا سکتا۔

مسلمانوں کی داعیانہ حیثیت ان کے اوپر فرض کے درجہ میں ضروری قرار دیتی ہے کہ وہ برادران وطن سے حریف اور رقیب کا برتاؤ نہ کریں۔ بلکہ وہ ان کے ہمدرد اور خیر خواہ بنیں۔ مسلمانوں کے اوپر لازم ہے کہ وہ برادران وطن کی ایذا رسانی پر آخری حد تک صبر کریں۔ وہ ان کی ایذا رسانی کے باوجود ان کے حق میں دعائیں کریں۔ وہ دل سے ان کی اصلاح اور نجات کے حریص بن جائیں۔

آخرت میں امت محمدی کو جو سب سے بڑا اعزاز ملنے والا ہے وہ شہداء علی الناس کا اعزاز ہے۔ مگر یہ اعزاز صرف انھیں لوگوں کو ملے گا جنھوں نے دنیا میں خدا کے دین کی شہادت دی ہو۔ اور اس شہادت (گواہی) کی راہ میں یک طرفہ صبر و اعراض کی وہ قربانی دی ہو جس کا اوپر ذکر ہوا۔

آخری بات

اب موجودہ حالات میں مسلمانوں کے سامنے دو صورتیں ہیں۔ ایک، نام نہاد رہنماؤں کا طریقہ جو ان کو ردعمل کے راستہ پر چلنے کا سبق دے رہا ہے۔ دوسرا، خدا و رسول کا طریقہ جو انھیں پکار رہا ہے کہ ردعمل سے بچو اور صبر و اعراض کا طریقہ اختیار کرو۔ رہنماؤں کا طریقہ ذلت اور بربادی کی طرف لے جاتا ہے، اور خدا و رسول کا طریقہ عزت اور کامیابی کی طرف۔ اب مسلمانوں کو یہ فیصلہ کرنا ہے کہ وہ دونوں میں سے کس طریقہ کو اپنے لیے پسند کر رہے ہیں۔

تازہ واقعات امید افزا طور پر بتاتے ہیں کہ مسلمانوں میں نیا شعور جاگا ہے۔ اب تک مسلمانوں میں یہ روایت جاری تھی کہ جب بھی ہندوؤں کا کوئی جلوس مسجد کے سامنے سے گزرے یا ہندوؤں کی ایک جماعت کوئی مخالفانہ نعرہ لگا دے تو مسلمان فوراً اس کو اپنے لیے قومی وقار کا مسئلہ بنا لیتے تھے اور ایسے لوگوں سے لڑنے بھڑنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ اس کے نتیجہ میں بار بار فرقہ وارانہ فساد پیش آتا تھا۔ اب اس کے برعکس منظر سامنے آ رہا ہے۔ جگہ جگہ مسلمان ایسا کر رہے ہیں کہ وہ ایسے واقعات کو ناقابل لحاظ سمجھ کر نظر انداز کر رہے ہیں۔ اس

طرح فساد کا ٹائم بم اپنے آپ ناکارہ ہو کر غیر موثر ہو جاتا ہے۔

یہ ایک نئے مستقبل کی علامت ہے۔ انشاء اللہ بہت جلد وہ وقت آنے والا ہے جب کہ صبر واعراض کی نئی روایت مسلمانوں میں قائم ہو جائے جس طرح ماضی میں ردعمل کی روایت ان کے درمیان قائم ہو گئی تھی۔ لوگ ناپسندیدہ باتوں کو اسی طرح نظر انداز کرنے لگیں جس طرح اس سے پہلے وہ ان سے الجھ جایا کرتے تھے۔ مستقبل کے افق پر صبح کا اجالا ظاہر ہو چکا ہے۔ وہ دن دور نہیں جب ایک روشن سورج ان کے اوپر اپنی پوری تابانی کے ساتھ چمکنے لگے۔

امن اور ترقی کی طرف

۱۹ نومبر سے لے کر ۱۰ دسمبر ۱۹۹۰ تک میں ایک بیرونی سفر پر تھا۔ اس دوران میرا قیام امریکہ اور جاپان میں رہا۔ امریکہ میں ایسے مسلمان بڑی تعداد میں ہیں جو ہندستان، پاکستان وغیرہ ملکوں سے تعلق رکھتے ہیں، اور اب امریکہ کے شہری بن کر وہاں پُر عافیت زندگی گزار رہے ہیں۔

سفر کے آخری دنوں میں امریکی مسلمانوں کی ایک خصوصی میٹنگ ہوئی۔ اس میں میں بھی شریک تھا۔ اس میٹنگ میں ہندستانی مسلمانوں کے موجودہ حالات پر تشویش کا اظہار کیا گیا۔ اس کا انداز تقریباً وہی تھا جو عام طور پر ہند و پاک کے مسلم لیڈروں کے یہاں پایا جاتا ہے۔ ہر ایک نے اس معاملہ میں مسلمانوں کی مظلومیت پر غم کا اظہار کیا، اور ہندوؤں کو ظالم بتا کر ان کے خلاف پر جوش احتجاجی تقریر کی۔ حتی کہ کچھ لوگوں نے یہ تجویز پیش کی کہ ہندستانی مسلمانوں کو جہاد کے ذریعہ اپنے مسائل کو حل کرنا چاہئے۔

میں نے کہا کہ یہ طریقہ بظاہر درست نظر آسکتا ہے، مگر وہ مسئلہ کا حل نہیں۔ اس طریقہ کا مطلب مسئلہ کو خالص اصولی اور قانونی اعتبار سے دیکھنا ہے۔ عام طور پر لوگ اظہار خیال کے وقت اسی طریقہ کو اختیار کرتے ہیں۔ آپ لوگوں کا انداز بھی اسی قسم کا ہے۔ مگر مسئلہ کے حل کے اعتبار سے یہ طریقہ بالکل کار آمد نہیں۔ اپنی ذات پر آپ اصولی معیار کا استعمال کر سکتے ہیں۔ مگر جب معاملہ دوسروں کا ہو تو عملی نقطۂ نظر اختیار کرنا ہی نتیجہ خیز ثابت ہوتا ہے۔

میں نے کہا کہ اصولی جائزہ میں زیادہ سے زیادہ جو چیز آپ کے حصہ میں آتی ہے، وہ فریق ثانی کے خلاف لفظی مذمت یا لفظی احتجاج ہے۔ جہاں تک اصل صورت حال کا تعلق ہے، وہ بدستور اپنی جگہ باقی رہتی ہے۔ اس طریقہ کا اول و آخر حاصل صرف اپنے دل کی بھڑاس نکالنا ہے نہ کہ فی الواقع اختلافی مسئلہ کو ختم کرنا۔

دوسرا طریقہ وہ ہے جس کو عملی نقطۂ نظر کہا جا سکتا ہے۔ یعنی نظری انصاف کے پہلو کو زیر بحث لائے بغیر یہ دیکھنا کہ مسئلہ کا واقعی حل کیا ہے۔ جو ناپسندیدہ صورت حال موجود ہے، اس کا عملی خاتمہ کس طرح کیا جا سکتا ہے۔ یہی دوسرا طریقہ یا تدبیر ہے جس کو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیبیہ معاہدہ (۶۲۸) کے ضمن میں اختیار فرمایا۔ اس کو ہم ایک لفظ میں، حدیبیہ پرنسپل (Hudaibiya principle)

کہہ سکتے ہیں۔ ہندستانی مسلمانوں کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ انھوں نے اب تک اس عملی حل کو اختیار نہیں کیا۔

قدیم مثل ہے کہ تالی ہمیشہ دو ہاتھ سے بجتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر دو ہاتھوں میں سے ایک ہاتھ کو ہٹالیا جائے تو تالی کا بجنا اپنے آپ بند ہو جائے گا۔ اسی عملی اصول کا تاریخی نام حدیبیہ پرنسپل ہے۔ اس پرنسپل میں معاملہ کا ایک فریق اپنے آپ کو اس پر راضی کرتا ہے کہ وہ غیر مشروط طور پر فریق ثانی کے ساتھ ایڈجسٹمنٹ کرے گا، وہ یک طرفہ طور پر اپنا "ہاتھ" ٹکراؤ کے مقام سے ہٹا کر تالی بجنے کے عمل کو موقوف کر دے گا، تاکہ وہ معتدل فضا قائم ہو جس میں تعمیر و ترقی کا کام پرامن طور پر انجام دیا جاسکے۔

میں نے امریکی مسلمانوں سے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ آپ لوگ اس معاملہ میں ڈبل اسٹینڈرڈ نظر آتے ہیں۔ آپ لوگوں کا اپنا حال تو یہ ہے کہ آپ آخری حد تک امریکہ کے نظام سے ایڈجسٹ کر کے یہاں اپنے مستقبل کو بنانے میں مشغول ہیں۔ مگر ہندستانی مسلمانوں سے یہ امید رکھتے ہیں کہ وہ اپنے ملک کے نظام سے لڑ کر وہاں اپنے لئے زندگی کی تعمیر کریں۔

میں نے کہا کہ حدیث میں آیا ہے کہ اپنے بھائی کے لئے بھی وہی پسند کرو جو تم اپنے لئے پسند کرتے ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کے مطابق، آپ کو ہندستانی مسلمانوں سے یہ کہنا چاہئے کہ امریکہ میں ہمارے لئے بہت سی ناموافق باتیں تھیں۔ مگر ہم نے ان سے لڑے بغیر اپنے لئے راستہ نکالا۔ اس کے نتیجہ میں یہاں ہم کو ایک کامیاب زندگی حاصل ہوگئی۔ تم لوگ بھی ہندستان میں اسی تجربہ کو دہراؤ۔ تم لوگ بھی اسی طرح وہاں کے نظام سے لڑے بغیر حکیمانہ تدبیر سے اپنی زندگی کی تعمیر کرو۔ مگر آپ لوگوں کا حال، اس کے برعکس یہ ہے کہ آپ اپنے لئے ایڈجسٹمنٹ کا طریقہ پسند کر رہے ہیں اور ہندستانی مسلمانوں کے لئے ٹکراؤ کا طریقہ۔

انطباق کی دو صورتیں

حقیقت یہ ہے کہ زندگی کا راز ایڈجسٹمنٹ میں ہے نہ کہ ٹکراؤ میں۔ اختلافی معاملات، اکثر حالات میں یک طرفہ (unilateral) طریقہ پر حل ہوتے ہیں نہ کہ دوطرفہ (bilateral) طریقہ پر۔ اس یک طرفہ اصول (unilateralism) کے استعمال کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ اکثریتی فریق اپنا "ہاتھ" ہٹانے پر راضی ہو جائے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ اقلیتی فریق اس کی ذمہ داری قبول کرے۔ اگر وہ ایسا کرے تو وہ اپنے "ہاتھ" کو سامنے سے ہٹا کر معاملہ کا خاتمہ کر دے گا۔

امریکہ اور جاپان میں جو کچھ میں نے دیکھا، اور دونوں ملکوں کے بارہ میں جو کچھ پڑھا، اس کے مطابق، میری رائے ہے کہ امریکہ کی تاریخ میں اقلیتی فریق کے ایڈجسٹمنٹ کی مثال پائی جاتی ہے۔ اور جاپان اکثریتی فریق کے ایڈجسٹمنٹ کی ایک کامیاب مثال ہے۔

اقلیتی فریق کا ایڈجسٹمنٹ

امریکہ کے اقلیتی فریق سے مراد وہ لوگ ہیں جن کو عام طور پر مہاجر (immigrants) کہا جاتا ہے۔ یعنی وہ لوگ جو مختلف ملکوں سے امریکہ آئے اور پھر یہاں کے شہری بن کر یہاں رہنے لگے۔ اس سفر کے دوران اس طبقہ کے بہت سے لوگوں سے میری ملاقات ہوئی۔ ان میں مختلف ملکوں کے لوگ بھی تھے اور مختلف مذہبوں کے لوگ بھی۔

ان مہاجرین کے لئے امریکہ میں مختلف مسائل تھے۔ مگر ان مسائل میں انھوں نے یک طرفہ طور پر امریکی نظام سے ہم آہنگی کا طریقہ اختیار کیا۔ مثال کے طور پر ایک ہندو جب ہندستان میں تھا تو وہ "بھارت" کو اپنا دیوتا سمجھتا تھا۔ اس کی تمام وفاداریاں بھارت کی سرزمین سے وابستہ تھیں۔ وہ فخر کے ساتھ وطنی تقدس کا وہ ترانہ گاتا تھا جس کو بندے ماترم کہا جاتا ہے۔ مگر امریکہ میں جب اس نے وہاں کی شہریت لینا چاہا تو اس کو معلوم ہوا کہ اس کا بھارتی عقیدہ امریکی نظریہ سے ٹکرا رہا ہے۔ اس کو امریکی شہریت صرف اس وقت مل سکتی ہے جب کہ وہ بھارت سے اپنی وفاداری کو مکمل طور پر اور مطلق طور پر ختم کر دے۔ وہ اپنی تمام وفاداریاں صرف امریکہ (U.S.A.) کے ساتھ وابستہ کرے۔ یہاں اس نے امریکی نظام سے یہ مطالبہ نہیں کیا کہ وہ اپنے اصول کو بدلے۔ اس کے بجائے اس نے خود اپنے عقیدہ پر نظر ثانی کی۔ امریکی دستور کے مطابق اس نے امریکہ کی غیر مشروط وفاداری کا حلف (Oath of Allegiance) لیا اور اس طرح وہ امریکہ کا شہری بن گیا۔

اسی طرح مسلمان کے عقیدہ کے مطابق، ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان سے جنگ کرنا حرام ہے۔ مسلمان کا یہ عقیدہ امریکہ کے قانون شہریت سے ٹکراتا ہے۔ کیوں کہ امریکہ کے دستور کے مطابق، ہر امریکی شہری پر لازم ہے کہ جب بھی کسی دوسرے ملک سے امریکہ کی جنگ پیش آئے تو کسی تحفظ یا استثناء کے بغیر وہ امریکہ کی طرف سے اس غیر ملک کے خلاف جنگ کرے۔

امریکہ کے زمانۂ قیام میں میری ملاقات ایک مسلمان فوجی سے ہوئی۔ اس نے کہا کہ مجھے خلیج عرب

میں جانے والی امریکی فوج میں بھیجا جا رہا ہے۔ امریکہ اگر عراق کے خلاف جنگ چھیڑتا ہے تو مجھے ایک مسلم فوج کے خلاف لڑنا ہوگا جو کہ اسلام میں حرام ہے۔ ایسی حالت میں مجھے کیا کرنا چاہئے۔

امریکہ میں اس وقت تقریباً پانچ ملین مہاجر مسلمان آباد ہیں۔ ان مسلمانوں نے وفاداری کا مقررہ حلف نامہ دے کر امریکہ کی شہریت کو اختیار کیا ہے۔ انھوں نے امریکہ سے یہ مانگ نہیں کی کہ وہ اپنے قانون کو بدل کر اس میں یہ استثنائی دفعہ شامل کرے کہ مسلمان مہاجر اس وقت جنگ میں شرکت کے پابند نہ ہوں گے جب کہ امریکہ کسی مسلم ملک یا مسلم قوم سے برسرِ جنگ ہو جائے۔ تمام امریکی مسلمانوں نے بلابحث امریکی نظام کو قبول کرتے ہوئے اس کی وفاداری کا حلف لیا، اور خود امریکہ کی شرط پر نہ کہ اپنی شرط پر، امریکہ کے شہری بن گئے ـــــ امریکہ کے مہاجرین نے امریکہ میں جو کامیابی حاصل کی ہے، اس کو انھوں نے ایڈجسٹمنٹ کے ذریعہ حاصل کیا ہے نہ کہ ٹکراؤ کے ذریعہ۔

اب ایک اور مثال لیجئے۔ امریکہ میں یہ قانون ہے کہ ایک شخص اگر اپنے بعد جائداد چھوڑ کر مرے تو اس کی جائداد کا ۴۰ فی صد حصہ گورنمنٹ کے خزانہ میں چلا جائے گا۔ اس کے بعد بقیہ ترکہ کا بیشتر حصہ متوفی کی رفیقہ حیات (spouse) کو ملے گا۔ اور نسبتاً بہت تھوڑا حصہ متوفی کی اولاد کے حصہ میں جائے گا۔

امریکہ کا یہ قانونِ وراثت واضح طور پر ہندوؤں، مسلمانوں اور اسی طرح دوسری ایشیائی قوموں کے اپنے مذہب یا کم از کم ان کی ذاتی پسند سے ٹکراتا ہے۔ مگر یہاں کبھی مہاجر لوگوں نے امریکہ سے یہ مانگ نہیں کی کہ وہ اپنے قانون وراثت میں ترمیم کرے اور اس معاملہ میں اس قانونی اصول کو رائج کرے جس کو ہندستان میں "پرسنل لا" کہا جاتا ہے، تاکہ مہاجر لوگوں کو یہ قانونی حق مل جائے کہ ان کی جائداد ان کے اپنے مذہب یا اپنے خاندانی رواج کے مطابق تقسیم کی جاسکے۔

Oath of Allegiance

I hereby declare, on oath, that I absolutely and entirely renounce and abjure all allegiance and fidelity to any foreign prince, potentate, state or sovereignty, of whom or which I have heretofore been a subject or citizen; that I will support and defend the Constitution and Laws of the United States of America against all enemies, foreign and domestic; that I will bear true faith and allegiance to the same; that I will bear arms on behalf of the United States when required by the Law; that I will perform noncombatant service in the armed forces of the United States when required by the Law; that I will perform work of national importance under civilian direction when required by the Law; and that I take this obligation freely without any mental reservation or purpose of evasion: So help me God.

یہاں کے زمانۂ قیام میں میں امریکی مسلمانوں کی ایک میٹنگ میں شریک ہوا۔ اس میٹنگ کا خاص موضوع وراثت کی تقسیم کے اسی مسئلہ پر غور کرنا تھا۔ وہاں کسی بھی شخص نے یہ تجویز پیش نہیں کی کہ امریکہ کا یہ قانون مداخلت فی الدین ہے۔ اس لئے اس پر مسلمانوں کی طرف سے سخت احتجاجی بیان شائع کیا جائے اور ملک کے تمام حصوں میں اس کے خلاف جلسے اور جلوس کے مظاہرے کئے جائیں، تاکہ حکومت پر دباؤ پڑے اور وہ موجودہ قانون وراثت میں ترمیم پر مجبور ہو جائے۔ میں نے دیکھا کہ ہر آدمی اس قسم کے بیانوں اور مظاہروں کو خارج از بحث قرار دیتے ہوئے صرف یہ بات کر رہا ہے کہ موجودہ قانون کے ہوتے ہوئے ہم اپنے مسئلہ کو کس طرح حل کر سکتے ہیں ——— بیرونی ملکوں میں مقیم حضرات ہر جگہ ایڈجسٹمنٹ کی سیاست چلا رہے ہیں نہ کہ وہ سیاست جس کو ہندستان کے سطحی لیڈر دباؤ کی سیاست کا نام دئے ہوئے ہیں۔

امریکہ میں مجھے معلوم ہوا کہ وہاں کے ہندوؤں اور مسلمانوں نے اس مسئلہ سے نمٹنے کے لئے جو کچھ کیا وہ صرف یہ تھا کہ انھوں نے امریکہ کے ماہرین قانون سے مل کر ان سے مشورہ طلب کیا کہ امریکی قانون سے ٹکرائے بغیر وہ کس طرح اس کے دائرہ میں اپنا مسئلہ حل کر سکتے ہیں۔

امریکی وکیلوں نے انھیں بتایا کہ امریکہ کے قانونی نظام میں وصیت نامہ (will) کی بے حد اہمیت ہے۔ اگر کوئی شخص اپنی موت سے پہلے اپنا باقاعدہ وصیت نامہ تحریر کر دے تو امریکہ کے موجودہ قانون کے مطابق، اس کو کسی تبدیلی کے بغیر مکمل طور پر نافذ کیا جائے گا۔ اس لئے آپ لوگ یہ اہتمام کریں کہ ہر آدمی اپنی موت سے پہلے اپنا وصیت نامہ لکھ کر اس کی رجسٹری کرا دے۔ وصیت نامہ میں وہ اپنے مذہب یا اپنے خاندانی رواج کے مطابق اپنی جائداد کے بٹوارہ کی اسکیم درج کر دے۔ اگر اس نے ایسا کیا تو اس کے مرنے کے بعد اس کی اسکیم کو عین اس کی وصیت کے مطابق جاری کیا جائے گا۔

تمام ہندوؤں، تمام مسلمانوں اور تمام دوسرے لوگوں نے امریکی وکیلوں کے اس مشورہ کو بلا بحث مان لیا۔ اس کے مطابق اب وہ امریکہ کے قانونی نظام سے موافقت کر کے اپنی جائداد اور اپنے ترکہ کے مسئلہ کو حل کر رہے ہیں۔ امریکہ کے مہاجر حضرات کا جس جس معاملہ میں بھی امریکہ کے نظام یا وہاں کے قانون سے ٹکراؤ پیش آیا، اس کو انھوں نے اسی طرح ایڈجسٹمنٹ کر کے حل کیا ہے۔ انھوں نے ہمیشہ اس سے پرہیز کیا کہ ایسا کوئی مسئلہ ان کے اور امریکیوں کے درمیان ٹکراؤ کا اشو بن جائے۔

بیرونی ملکوں کے جو لوگ امریکہ میں جا کر آباد ہو گئے ہیں، ان میں سے کئی لوگوں سے میں نے پوچھا کہ

آپ نے اپنے ملک کو چھوڑ کر کیوں امریکہ کو اپنا وطن بنالیا۔ ان سب کا متفقہ جواب یہ تھا کہ یہاں ہم کو پرامن زندگی (peaceful life) حاصل ہے۔ مگر ان حضرات کا یہ بیان اس وقت تک نامکمل ہے جب تک اس میں یہ شامل نہ کیا جائے کہ امریکہ کی یہ پرامن زندگی انھیں وہاں کے نظام سے موافقت کرنے کی قیمت پر ملی ہے نہ کہ وہاں کے مروجہ نظام سے ٹکراؤ کرنے کی بنا پر۔

امریکہ کے مہاجر وہاں اقلیتی فریق کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کے مقابلہ میں امریکی نظام کی حیثیت گویا اکثریتی فریق کی ہے۔ مذکورہ مثال بتاتی ہے کہ وہاں کے اقلیتی فریق نے اپنے اکثریتی مدمقابل سے کس طرح ایڈجسٹ کیا۔ انھوں نے اس معاملہ کے نظری یا اصولی پہلوؤں پر کوئی بحث نہیں چھیڑی۔ بلکہ اپنے مسئلہ کے حل کے لئے وہ عملی طریقہ اختیار کر لیا جس کو ہم نے حدیبیہ پرنسپل کا نام دیا ہے۔

اکثریتی فریق کا ایڈجسٹمنٹ

اب دوسری نوعیت کی مثال لیجئے۔ یعنی وہ مثال جب کہ اکثریتی فریق نے حالات کے تقاضے کا احترام کرتے ہوئے اپنے اقلیتی فریق کے ساتھ ایڈجسٹمنٹ کا طریقہ اختیار کیا۔ اس کی ایک واضح مثال جاپان کی موجودہ تاریخ میں پائی جاتی ہے۔

امریکہ سے جاپان کا سفر بحرالکاہل کے اوپر طے ہوتا ہے۔ یہ تقریباً دس گھنٹہ کی طویل پرواز ہے۔ چنانچہ مسافروں کی اکتاہٹ کو دور کرنے کے لئے جہاز میں دوران سفر فلم شو دکھایا جاتا ہے۔ میں جب لاس اینجلز سے جاپان ائیرلائنز کے ذریعہ ٹوکیو جا رہا تھا تو راستہ میں جاپان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اسکرین پر دکھایا گیا۔ ایک منظر میں میں نے دیکھا کہ امریکہ کا قومی جھنڈا جاپان کی سرزمین پر لہرا رہا ہے۔

یہ ایسا ہی تھا جیسے برٹش حکومت کا سرکاری جھنڈا ممبئی کے اوپر لہرا رہا ہو۔ ایسا واقعہ ہندستان میں یقینی طور پر ناقابل برداشت سمجھا جائے گا۔ مگر جاپانی قوم پچھلے ۵۴ سال سے اس کو برداشت کر رہی ہے۔ اور اس "برداشت" نے جاپان کو زبردست فائدہ پہنچایا ہے۔

جیسا کہ معلوم ہے، دوسری عالمی جنگ کے بعد ۱۹۴۵ میں امریکی فوجیں جاپان کی سرزمین پر اتر گئیں۔ انھوں نے سیاسی اور فوجی اعتبار سے جاپان کے اوپر اپنی بالادستی قائم کر دی۔ اس کے بعد امریکی جنرل میکارتھر نے جاپان کا نیا دستور تیار کیا، اس میں یہ لکھ دیا گیا کہ جاپان کبھی بھی فوجی طاقت بننے کی کوشش نہیں کرے گا۔ جاپان کے تعلیمی نظام کو مکمل طور پر امریکہ کے تعلیمی نمونہ پر ڈھال دیا گیا۔ جاپان کے

جزیرہ اوکی ناوا کو امریکہ کا فوجی اڈہ بنا کر وہاں امریکہ کا قومی جھنڈا لہرا دیا گیا۔ وغیرہ وغیرہ

اس معاملہ میں جاپان اکثریتی فریق کی حیثیت رکھتا تھا اور امریکہ کی حیثیت اس کے مقابلہ میں اقلیتی فریق کی تھی۔ اب ایک صورت یہ تھی کہ جاپان اپنے اوپر امریکہ کی بالادستی کو قبول نہ کرے۔ وہ اس کے خلاف مذمت اور احتجاج کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع کر دے، وہ امریکہ کے خلاف گوریلا جنگ چھیڑ دے وغیرہ۔ مگر جاپانیوں نے اس قسم کی کوئی کارروائی نہیں کی۔ یہ معاملہ اگرچہ ان کی قومی غیرت کے سراسر خلاف تھا۔ مگر انھوں نے نظری پہلوؤں کو نظر انداز کرتے ہوئے خالص عملی نقطۂ نظر کو اپنا لیا۔ انھوں نے یہ کیا کہ یک طرفہ طور پر امریکہ کے ساتھ ایڈجسٹمنٹ کر کے ممکن دائرہ میں اپنی زندگی کی تعمیر شروع کر دی۔

۱۹۴۵ میں جب یہ قومی مصیبت پیش آئی تو جاپان کے سابق شہنشاہ ہیروہیٹو نے ریڈیو پر ایک تاریخی تقریر کی۔ ۱۴ اگست ۱۹۴۵ کی اس تقریر میں جاپان کے قومی لیڈر نے اپنی قوم کو یہ پیغام دیا کہ وہ جذباتی مظاہروں (outbursts of emotions) سے قطعی پرہیز کریں۔ وہ اپنی تمام طاقتوں کو مستقبل کی تعمیر (construction of future) کے محاذ پر لگا دیں۔ وہ اپنے آپ کو غیر ملکی نفرت (antiforeign sentiment) سے بچائیں۔ جاپان کی تعمیر نو (reconstruction) کے سوا وہ کسی اور چیز میں کوئی دلچسپی نہ لیں۔

جاپان کے لیڈر نے اپنی قوم کو اس قسم کی ہدایت دیتے ہوئے کہا کہ ہم نے یہ عزم کیا ہے کہ آنے والی نسلوں کو ایک عظیم امن مہیا کرنے کے لئے ایک ایسی چیز کو برداشت کریں جو ناقابل برداشت ہے، اور اس کو سہیں جو سہی نہیں جا سکتی :

We have resolved to pave the way for a grand peace for all the generations to come by enduring the unendurable and suffering what is unsufferable.

Ian Nish, *The Story of Japan*, p. 192

اس اصول کو اختیار کرنا جاپان کے لئے اپنے آپ کو امریکہ کے ماتحت بنانے کے ہم معنی تھا۔ چنانچہ ابتدائی دور میں جاپان نے ایک آزاد ملک کی حیثیت سے اپنا مقام کھو دیا۔ پنڈت جواہر لال نہرو ۱۹۴۷ میں ہندستان کے پہلے وزیر اعظم بنے تو انھوں نے اپنی خارجہ پالیسی میں جاپان کو کوئی مقام نہیں دیا۔

اپنے پورے دورِ حکومت میں وہ جاپان کو نظر انداز کرتے رہے۔ کیوں کہ ان کے نزدیک، جاپان ایک وابستہ ملک (aligned nation) بنا ہوا تھا، اور نہرو کے اپنے ذہن کے مطابق کسی ملک کی عظمت اس میں تھی کہ وہ ناوابستہ قوم (non-aligned nation) کی حیثیت رکھتا ہو۔

مگر آج ساری دنیا جانتی ہے کہ جاپان کی اس یک طرفہ پالیسی نے جاپان کو غیر معمولی فائدہ پہنچایا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جاپان کو وسیع پیمانے پر ایک وقفۂ تعمیر مل گیا۔ اس نے اس وقفہ کو استعمال کرکے اتنی زیادہ اقتصادی ترقی کی کہ جاپان کے اوپر امریکہ کی سیاسی اور فوجی بالادستی عملاً بے معنی ہو کر رہ گئی۔ آج جاپان خود امریکہ کی دیوپیکر کمپنیوں کو بڑی بڑی قیمت دے کر خرید رہا ہے۔ امریکہ اور جاپان کے درمیان ہر روز ایک درجن فلائٹ آتی ہے اور ہر روز ایک درجن فلائٹ جاتی ہے۔ جاپان نے ساری دنیا میں نمبر ایک اقتصادی طاقت کی حیثیت حاصل کرلی ہے۔ ۱۹۴۵ میں امریکہ نے جاپان پر سیاسی غلبہ حاصل کیا تھا، آج خود امریکہ زیادہ بڑے پیمانے پر جاپان کے اقتصادی غلبہ کے نیچے دبا ہوا ہے۔ جاپان ایک چھوٹا اور بے وسیلہ ملک ہے، اس کے مقابلہ میں ہندستان بہت بڑا اور باوسیلہ ملک ہے۔ مگر جاپان کے مقابلہ میں آج ہندستان کی کوئی حیثیت نہیں۔

یہ اقلیتی فریق کے مقابلہ میں اکثریتی فریق کے ایڈجسٹمنٹ کی مثال ہے۔ اس معاملہ میں امریکہ گویا اقلیتی فریق کی حیثیت رکھتا تھا۔ اور اس کے مقابلہ میں جاپان کی حیثیت اکثریتی فریق کی تھی۔ جاپان نے نظری پہلوؤں کو نظر انداز کرتے ہوئے عملی پہلو کو اختیار کرلیا اور اپنے اقلیتی حریف سے موافقت کرتے ہوئے ممکن دائرہ میں تعمیر و استحکام کا عمل جاری کر دیا۔ یہ عملی طریقہ اتنا کار آمد تھا کہ جب اس کی تکمیل ہوئی تو جاپان نے عالمی نقشہ پر پہلے سے بھی زیادہ بڑی حیثیت حاصل کرلی۔

ہندستان کی مثال

ہندستان میں بھی ظاہری فرق کے ساتھ یہی صورت حال جاری ہے۔ یہاں کا مسئلہ بنیادی طور پر ہندو اور مسلمان کا مسئلہ ہے۔ اس معاملہ میں ہندو فریق کی حیثیت اکثریتی فریق کی ہے۔ اور مسلمان اس کے مقابلہ میں اقلیتی فریق کی حیثیت رکھتا ہے۔

اکثریت اور اقلیت کا جھگڑا پچھلے ۴۵ سال سے مسلسل جاری ہے۔ عین اسی مدت میں جب کہ امریکہ کے مہاجر طبقہ نے اپنے اکثریتی فریق سے موافقت کرکے غیر معمولی ترقی حاصل کر لی۔ اور اسی طرح

جاپان نے اپنے اقلیتی فریق کے ساتھ موافقت کرکے عالمی سطح پر اپنے لئے نمایاں مقام حاصل کرلیا، اسی مدت میں ہندستان کے دونوں فرقوں میں صرف دنگے اور فساد جاری رہے اور آج تک جاری ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ نہ ہندو فرقہ کوئی حقیقی ترقی کا درجہ حاصل کرسکا اور نہ مسلم فرقہ۔ دونوں کے دونوں بربادی کے گڑھے کے کنارہ کھڑے ہوئے ہیں۔

امریکہ کے زمانۂ قیام میں میں روزانہ وہاں کے اخبارات پڑھتا تھا۔ مگر امریکہ کے اخبارات ہندستان کی خبروں سے خالی تھے۔ اس مدت میں میں ہندستان کے حالات سے اس طرح بے خبر رہا گویا کہ ہندستان جیسے کسی ملک کا کرۂ ارض پر کوئی وجود ہی نہیں۔ ہندستان جغرافی اعتبار سے بہت بڑا ملک ہے۔ اس کے پاس ہر قسم کے بہترین وسائل موجود ہیں۔ اس کو آزادانہ حیثیت میں تقریباً نصف صدی تک عمل کا موقع ملا۔ مگر اس کے باوجود حالت یہ ہے کہ عالمی نقشہ میں ہندستان کو کوئی بھی اہمیت حاصل نہیں۔

اس کا واحد سبب یہ ہے کہ ہندستان میں ان دونوں میں سے کوئی واقعہ پیش نہ آسکا، حتیٰ کہ کسی ملکی لیڈر نے رہنمائی کے درجہ میں بھی وہ بات نہ کہی جس کی شاندار مثال امریکہ اور جاپان میں موجود تھی۔ ہندستان کو یا ہندستان کے لیڈروں کو نہ امریکہ میں کوئی نمونہ ملا اور نہ جاپان میں۔ انھیں کرنے کا کام صرف یہ نظر آیا کہ وہ بے فائدہ طور پر آپس میں لڑتے رہیں۔ یہاں تک کہ دنیا کی بین اقوامی برادری میں ایک پچھڑا ہوا گروہ بن کر رہ جائیں۔

مسئلہ کا حل

حقیقت یہ ہے کہ ہندستان کے مسئلہ کا حل صرف ایک ہے، اور وہ وہی ہے جس کو ہم نے حدیبیہ پرنسپل کہا ہے۔ یعنی دو فریقوں میں سے کسی ایک فریق کا اس پر راضی ہونا کہ وہ یک طرفہ طور پر تمام جھگڑوں کو ختم کردے گا۔

اس معاملہ میں ہمارے لئے دو قسم کے نمونے پائے جاتے ہیں۔ ایک وہ جس کی مثال امریکہ میں ملتی ہے۔ اور دوسرا وہ جس کی مثال جاپان پیش کررہا ہے۔ امریکہ کی مثال میں ہندستان کے اقلیتی فرقہ (مسلمان) کے لئے ایک جدید نمونہ ہے۔ اور جاپان کی مثال ہندستان کے اکثریتی فرقہ (ہندو) کے لئے جدید نمونہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ ہندستان کے لئے لازم ہے کہ وہ ان دو میں سے کسی ایک نمونہ کو اختیار کرے۔ اگر ایسا نہیں ہوا تو

اس ملک کے جھگڑے ابدی طور پر باقی رہیں گے، یہاں تک کہ ہندستان کمزور ہوتے ہوتے دنیا کے نقشہ میں ایک ناقابل لحاظ ملک بن کر رہ جائے گا۔

اکثریتی فریق (ہندو) اگر حقیقت پسندی کا طریقہ اختیار کرے تو اس کو یہ کرنا چاہئے کہ وہ مسلمانوں کے خلاف اپنی تمام صحیح یا غلط شکایتوں کو یک طرفہ طور پر بھلا دے۔ وہ اینٹی مسلم طرز فکر کو چھوڑ کر حقیقی معنوں میں پرو بھارت طرز فکر اختیار کرے۔ وہ مسلمانوں کے سلسلہ میں ماضی کی تمام شکایتوں کو فراموشی کے خانہ میں ڈال دے اور اپنی تمام توجہ اور اپنی تمام طاقت ملک کی ترقی کی راہ پر لگا دے۔ ہندو اگر ایسا کرے تو وہ وہی کرے گا جو جاپان نے "اکثریت" کے باوجود اپنی "اقلیت" کے مقابلہ میں کیا۔ اگر ہندو ایسا کرنے پر راضی ہو جائے تو تاریخ اس سے بھی زیادہ بڑے پیمانہ پر اس کے حق میں اپنے آپ کو دہرائے گی جس کی شاندار مثال جاپان کے تجربہ میں نظر آتی ہے۔

دوسری ممکن صورت یہ ہے کہ اس "حدیبیہ پرنسپل" کو یہاں کا اقلیتی فریق (مسلمان) اختیار کرے۔ مسلمانوں کو صحیح یا غلط اپنے اکثریتی فریق سے بہت سی شکایتیں ہیں۔ اگر مسلمان اپنے آپ کو اس تاریخی فیصلہ پر راضی کریں تو انھیں وقتی طور پر یہ کرنا ہوگا کہ وہ ہندو کے مقابلہ میں اپنی ہر شکایت کو، خواہ وہ بظاہر جائز ہو یا ناجائز، صبر و اعراض کے خانہ میں ڈال دیں۔ ہندوؤں کی طرف سے اشتعال انگیزی کی جائے تو یک طرفہ طور پر اس کو برداشت کریں۔ ہندو فساد پر آمادہ ہو جائے تب بھی وہ مقابلہ آرائی کا انداز اختیار نہ کریں۔ ہندو انھیں محرومی کا تجربہ کرائے تو اس کو بھی وہ اپنے ذہن سے نکال دیں۔ مسلمان اپنے آپ کو ردعمل کی نفسیات سے اوپر اٹھا لیں، وہ مکمل طور پر اور یک طرفہ طور پر مثبت نفسیات میں جینے لگیں۔

موجودہ حالات میں صبر و اعراض کی یہ پالیسی مسلمانوں کے لئے وقفۂ تعمیر حاصل کرنے کی تدبیر ہے۔ مسلمان اپنے مستقبل کی تعمیر کے لئے اس صورت حال کو برداشت کریں۔ وہ صبر و اعراض کی پالیسی اختیار کر کے صرف یہ کریں کہ ممکن دائرہ میں اپنی تعمیر و ترقی کی جد و جہد جاری کر دیں۔ تمام ناموافق باتوں کے باوجود اس ملک میں ان کے لئے یہ موقع کھلا ہوا ہے کہ جس چیز کو دوسرے لوگ کم محنت کر کے پا رہے ہیں، اس کو وہ زیادہ محنت کر کے اپنے لئے حاصل کر لیں۔ اور مسلمانوں کو اسی امکان کو استعمال کرنا چاہئے۔

مسلمانوں کے لئے اب بھی تعلیم، تجارت، زراعت، سماجی خدمت، وغیرہ شعبوں میں کام کرنے کے مواقع پوری طرح کھلے ہوئے ہیں۔ وہ ناموافق باتوں سے اعراض کرتے ہوئے ان تعمیری میدانوں میں سرگرم عمل ہو جائیں۔ یہ اگرچہ ان کے لئے ناقابل برداشت کو برداشت کرنے کے ہم معنی ہوگا۔ مگر اس دنیا میں کوئی بڑی کامیابی ہمیشہ ان لوگوں کو ملتی ہے جو اس اعلیٰ حوصلہ مندی کا ثبوت دیں۔ مسلمان اگر ایسا کریں تو یقینی طور پر یہ پیشین گوئی کی جا سکتی ہے کہ ۲۵ سال کے اندر اس ملک کی پوری تاریخ بدل جائے گی۔

۱۰ دسمبر ۱۹۹۰ کو میں جاپان ایئر لائنز کے جس جہاز کے ذریعہ سفر کرکے دہلی پہنچا، اس میں تقریباً تین سو مسافر تھے۔ ان میں بیشتر وہ لوگ تھے جن کو مہاجر (immigrants) کہا جاتا ہے۔ ان میں سے ہر ایک خوشی اور خوش حالی کی تصویر بنا ہوا تھا۔ ایک شخص نے کہا: اگر ہم انڈیا میں ہوتے تو یہاں لڑائی جھگڑوں سے فرصت نہ ملتی۔ یہ خوش قسمتی کی بات تھی کہ حالات نے ہم کو امریکہ پہنچا دیا۔ وہاں ہم نے اتنی ترقی حاصل کرلی۔

مگر جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا، یہ امریکہ کی بات نہیں بلکہ طریق کار کی بات ہے۔ لوگ امریکہ میں جو طریق کار اختیار کئے ہوئے ہیں، مسلمان اگر اس طریق کار کو اپنا لیں تو خود اسی ملک میں وہ ساری ترقیاں حاصل کر سکتے ہیں۔ اس کے بعد مسلمان اس ملک میں بھی عزت اور کامیابی کے وہ تمام مواقع پالیں گے جو اسی طریق کار کو اختیار کرنے کے نتیجہ میں امریکہ کے مہاجر لوگوں نے وہاں اپنے لئے حاصل کیا ہے۔

مزید یہ کہ یہ مسلمانوں کے لئے ملک کی ایک اعلیٰ خدمت کے ہم معنی ہے۔ مسلمان اگر اس طرز عمل کو اختیار کریں تو بالواسطہ طور پر وہ اس ملک کی عمومی ترقی کا ذریعہ بن جائیں گے۔ وہ ملکی ترقی کے اس دروازے کو کھول دیں گے جو باہمی جھگڑوں کے نتیجہ میں پچھلی نصف صدی سے عملاً بند پڑا ہوا ہے۔

قرآن میں زندگی کا ایک اہم اصول ان لفظوں میں بتایا گیا ہے کہ جو چیز لوگوں کو نفع دیتی ہے وہ زمین میں قیام حاصل کرتی ہے (الرعد ۱۷) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نفع بخشی کی صفت ایسی تسخیری صفت ہے کہ جو لوگ اپنے اندر یہ صفت پیدا کرلیں وہ لازماً مضبوط اور مستحکم زندگی حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اب اگر مسلمان مذکورہ اصول پر عمل کریں تو اس کے بعد بہت جلد ایسا ہوگا کہ وہ اس ملک میں ایک نفع بخش گروہ کی حیثیت حاصل کرلیں گے۔ اور یہ قرآن کی گواہی ہے کہ جو لوگ کسی ملک میں نفع بخش

گروہ بن جائیں وہ اس ملک میں مستحکم مقام کا درجہ بھی ضرور حاصل کر لیتے ہیں۔

دعوتی فائدہ

جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے، بات یہیں ختم نہیں ہوتی بلکہ وہ اس سے بہت آگے جاتی ہے۔ مسلمانوں کا اس ملک میں "حدیبیہ پرنسپل" کو اختیار کرنا ان کے لئے امریکی مہاجرین کی طرح صرف مادی فائدہ کا سبب نہیں بنے گا بلکہ اس سے بھی زیادہ بڑی بات یہ ہوگی کہ یہاں مسلمانوں کے دین کے لئے فتوحات کا وہ دروازہ کھل جائے گا جو دور اول میں حدیبیہ پرنسپل کو اختیار کرنے کے نتیجہ میں ان کے اسلاف کے لئے کھلا تھا۔

مسلمان کی تمام حیثیتوں میں سب سے بڑی حیثیت یہ ہے کہ وہ ایک صاحبِ نظریہ قوم ہیں۔ وہ واحد ملت ہیں جن کے پاس محفوظ دین ہے۔ انھیں اجارہ داری کے درجہ میں یہ خصوصیت حاصل ہے کہ وہ دنیا کو خدا کا صحیح تصور دے سکتے ہیں۔ مسلم ملت کی یہ حیثیت، امکانی طور پر، اُس کو ساری دنیا کے اوپر نظری امام بنا رہی ہے۔ ان کے دین کی یہ امکانی خصوصیت اگر واقعہ بن جائے تو اس کا فطری نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ ساری دنیا کے اوپر فکری قیادت کا درجہ حاصل کر لیں گے۔

اسلام ایک محفوظ مذہب ہے۔ وہ ایک قائم شدہ دین کی حیثیت رکھتا ہے۔ تاریخ اور علوم انسانی کی تمام گواہیاں اس کی تصدیق کر رہی ہیں۔ اسلام کی ان خصوصیات نے اسلام کے اندر تسخیری صلاحیت پیدا کر دی ہے۔ آج وہ اس طاقت کا حامل ہے کہ اپنے آپ لوگوں کے درمیان پھیلے، اپنے آپ لوگوں کے دلوں میں داخل ہو جائے۔

آج صرف ایک چیز ہے جو اسلام کے تسخیری سیلاب کو پھیلنے سے روکے ہوئے ہے، یہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان نزاع اور ٹکراؤ کی موجودہ فضا ہے۔ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان اشتعال کی فضا نے اس معتدل ماحول کو ختم کر رکھا ہے جس میں غیر مسلم حضرات مسلمانوں کے مذہب (اسلام) کو کھلے دل کے ساتھ دیکھیں اور اس کو خود اپنی فطرت کی آواز پاکر اس کی طرف دوڑ پڑیں۔

اب اشاعت اسلام کا دروازہ کھولنے کی ذمہ داری تمام تر مسلمانوں پر آگئی ہے۔ یہ خود مسلمانوں کا فریضہ ہے کہ وہ داعی اور مدعو کے درمیان کش مکش کا خاتمہ کر کے اسلام کے لئے نئی تاریخ کا آغاز کریں۔

مسلمان اگر صبر و اعراض کا یک طرفہ طریقہ اختیار کر کے باہمی نفرت کی فضا کو ختم کر دیں تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ اسلام اپنے آپ پھیلنے لگے گا۔ یہاں تک کہ وہ وقت آئے گا جب کہ دنیا یہ منظر دیکھے گی کہ حدیبیہ پرنسپل کو اختیار کرنے کے نتیجہ میں دہی واقعہ دوبارہ تاریخ میں پیش آگیا ہے جو دور اول میں اس اصول کو اختیار کرنے کے نتیجہ میں پیش آیا تھا۔

تاریخ اپنے آپ کو دہرانے کے لئے تیار ہے، بشرطیکہ مسلمان اس حوصلہ مندی کا ثبوت دے سکیں کہ وہ دوبارہ اس فاتحانہ تدبیر کو دہرانے کے لئے تیار ہیں جو ان کے پیش رؤوں نے چودہ سو سال پہلے دہرایا اور بظاہر شکست کے بعد وہ چیز حاصل کر لی جس کو قرآن میں فتح مبین کہا گیا ہے۔

حدیبیہ پرنسپل کو اختیار کرنا کوئی سادہ سی بات نہیں، موجودہ حالات میں یہ مسلمانوں کے لئے ہم خرما وہم ثواب کے ہم معنی ہے —— اس کے ذریعہ ایک طرف وہ اپنی دنیاوی زندگی کی تعمیر کے مواقع پالیں گے۔ وہ اس قابل ہو جائیں گے کہ ملک کے وسائل کو بھر پور طور پر اپنے حق میں استعمال کر کے اپنے آپ کو خوش حال اور ترقی یافتہ بنا سکیں۔

دوسری طرف یہ تدبیر ملک میں اشاعت اسلام کے بند دروازے کو کھول دے گی۔ اس کے بعد اسلام اپنے آپ اس ملک میں پھیلنے لگے گا جس طرح موجودہ قومی جھگڑوں سے پہلے وہ مسلسل یہاں پھیل رہا تھا۔

قرآن میں "حدیبیہ پرنسپل" کا یہ فائدہ بتایا گیا ہے کہ اس کے ذریعہ سے فتح مبین بھی ملتی ہے اور اللہ کی مغفرت بھی حاصل ہوتی ہے (الفتح ۱-۲) یہ اسلامی اصول آج دوبارہ مسلمانوں کو پکار رہا ہے اور انھیں بشارت دے رہا ہے کہ اگر تم نے اس کو صحیح طور پر اختیار کر لیا تو وہ تمہاری دنیا کی کامیابی کا بھی ضامن ہے اور اسی کے ساتھ آخرت کی کامیابی کا ضامن بھی۔

باب چهارم

امّت مسلمہ

امّت مسلمہ کی ایک ڈیوٹی ہے جو خدا کی طرف سے مقرر کی گئی ہے۔ دوسری چیز اس کے وہ مسائل ہیں جو دنیا کے حالات کی نسبت سے اس کے لئے پیدا ہوتے ہیں۔ ڈیوٹی کو پورا کرنے کی ذمہ داری امت کی ہے۔ اور مسائل کو حل کرنے کا کام خدا نے خود اپنے ذمہ لے لیا ہے۔ فرائض اور مسائل کی یہ تقسیم قرآن کی اس آیت سے واضح طور پر معلوم ہوتی ہے :

یاایھا الرسول بلغ ما انزل الیک من ربك وان لم تفعل فما بلغت رسالته والله یعصمك من الناس (المائدہ ۶۷)

اے رسول، جو کچھ تمہارے اوپر تمہارے رب کی طرف سے اترا ہے اس کو پہنچا دو۔ اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو تم نے اللہ کے پیغام کو نہیں پہنچایا۔ اور اللہ تم کو لوگوں سے بچائے گا۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اس آیت کے براہ راست مخاطب ہیں اور آپ کی امت اس آیت کی بالواسطہ مخاطب ہے۔ اس آیت کے مطابق، دعوت الی اللہ کی ذمہ داری اہل اسلام پر ہے، اور عصمت من الناس کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ پر۔

اللہ تعالیٰ کی یہ مستقل سنت ہے کہ وہ حامل کتاب قوم کی خصوصی نصرت فرماتا ہے۔ یہ نصرت اس وقت تک جاری رہتی ہے جب تک کہ اس قوم کی حامل کتاب ہونے کی حیثیت باقی ہو۔ اسی سنت الٰہی کے تحت پچھلے زمانوں میں بنی اسرائیل (یہود) کی غیر معمولی مدد کی گئی۔ یہود کے دینی بگاڑ کے باوجود ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا یہ معاملہ مختلف صورتوں میں جاری رہا۔ یہاں تک کہ انھیں حامل کتاب کی حیثیت سے معزول کر دیا گیا۔

اب قیامت تک کے لئے حامل کتاب ہونے کی حیثیت امت مسلمہ کو حاصل ہے۔ اس لئے امت کے بگاڑ کے باوجود اس کی عمومی نصرت کا سلسلہ برابر جاری رہے گا۔ جہاں تک آخرت کا تعلق ہے، وہاں ہر آدمی اپنے کئے کے مطابق اپنی جزا پائے گا۔ مگر دنیا میں اللہ تعالیٰ اس امت کو ہر حال میں بچاتا رہے گا۔ مسلمانوں کا داخلی زوال یا بیرونی مداخلت، کوئی بھی چیز اس میں رکاوٹ نہیں بن سکتی۔

اس مخصوص خدائی معاملہ کا تعلق امت مسلمہ کی افضلیت سے نہیں ہے، بلکہ دین کی حفاظت سے ہے۔ چونکہ نبوت ختم ہو چکی ہے، اس لئے اب اس دین کو آخر وقت تک محفوظ رہنا ہے۔ اور جب دین کو محفوظ

رہنا ہے تو اس امت کو بھی لازماً محفوظ رہنا ہے جو موجودہ اسباب کی دنیا میں اس دین کی حامل بنائی گئی ہے۔ جس طرح مکتوب قرآن کے لئے کاغذ کی ضرورت ہے، اسی طرح محفوظ دین کے لئے ایک امت درکار ہوتی ہے جو اس کو اٹھائے اور نسل در نسل اس کو لوگوں تک منتقل کرتی رہے۔ موجودہ زمانہ میں امت مسلمہ کے لئے یہ نصرت بہت بڑے پیمانہ پر ظاہر ہو چکی ہے۔

نصرت کا ظہور

انیسویں صدی ختم ہوئی تو مسلم دنیا اپنے زوال کے آخری نقطہ پر پہنچ چکی تھی۔ مگر بیسویں صدی آئی تو مسلمانوں کی اپنی کسی کوشش کے بغیر براہ راست خدائی مداخلت کے تحت دنیا کے حالات وسیع پیمانے پر بدلنا شروع ہو گئے۔

اس تبدیلی کا پہلا مظاہرہ سیاسی اعتبار سے ہوا۔ موجودہ زمانہ کا ایک مسئلہ وہ تھا جس کو نوآبادیات (Colonialism) کہا جاتا ہے۔ یہ مسئلہ ابتداءً پندرھویں صدی عیسوی میں شروع ہوا۔ اسپینی، پرتگالی، ڈچ، فرانسیسی اور برطانوی قوموں نے بڑی بڑی نوآبادیاتی سلطنتیں بنائیں۔ ایشیا اور افریقہ کے تمام مسلم ممالک براہ راست یا بالواسطہ طور پر ان کے قبضہ میں چلے گئے۔

مگر زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ نوآبادیاتی طاقتیں مختلف اسباب سے زوال کا شکار ہو گئیں۔ پہلی عالمی جنگ (۱۸ - ۱۹۱۴) میں جزئی طور پر اور دوسری عالمی جنگ (۴۵ - ۱۹۳۹) میں کلی طور پر ان کی طاقت ٹوٹ گئی۔ وہ اس قابل نہ رہیں کہ ایشیا اور افریقہ میں اپنے زیر قبضہ ملکوں پر اپنا سیاسی اقتدار باقی رکھ سکیں چنانچہ ایک کے بعد ایک ملک آزاد ہوتے چلے گئے۔ بیسویں صدی کے عمل کے دوران بیشتر نوآبادتی علاقے سیاسی آزادی حاصل کر چکے ہیں:

> In the course of the 20th century, most colonial areas have gained formal political independence. (III/17)

اب دنیا بھر میں پچاس سے زیادہ مسلم ملک ہیں جو سیاسی اعتبار سے آزاد ملک کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ امکانی طور پر وہ اس پوزیشن میں ہیں کہ آزادانہ طور پر جو فیصلہ لینا چاہیں لے سکیں۔ سیاسی محکومی کا مسئلہ اب ان کے لئے باقی نہیں رہا۔

۲۔ دوسرا مسئلہ اقتصادی اعتبار سے تھا۔ موجودہ زمانہ میں اقتصادی قوت زیادہ تر انڈسٹری کے

ساتھ وابستہ ہوگئی ہے۔ مسلمان مختلف اسباب کے تحت انڈسٹری میں داخل نہ ہو سکے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ جدید دنیا میں ایک مفلس قوم بن کر رہ گئے۔

یہاں بھی خدا کی مداخلت نے مسلمانوں کے مسئلہ کو حل کر دیا۔ میری مراد اس واقعہ سے ہے جس کو ارضیات کے ماہرین جغرافی اتفاق (Accident of geography) کہتے ہیں۔ یعنی دنیا کے پٹرول کے ذخیرہ کا تقریباً نصف حصہ مسلم ملکوں (مشرق اوسط) کی زمین کے نیچے ہونا۔ ایک طرف صنعتی دور میں پٹرول کی بے حد اہمیت پیدا ہوئی۔ دوسری طرف پٹرول کا بہت بڑا ذخیرہ مسلم ملکوں کی زمین کے نیچے رکھ دیا گیا۔ بیسویں صدی کے نصف تک مسلم دنیا اقتصادی اعتبار سے بالکل بے حیثیت بنی ہوئی تھی، اسی صدی کا نصف ثانی شروع ہوا تو مسلم دنیا کے پاس اتنی دولت آچکی تھی جو اسراف کی حد تک ان کی تمام ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے کافی ہو۔

اس واقعہ نے آج مسلم دنیا کو عالمی اقتصادی سرگرمیوں کے نقشہ میں نہایت اہم مقام دے دیا ہے۔ امریکی میگزین نیوزویک (۱۸ فروری ۱۹۷۴) نے اپنے خصوصی مضمون میں لکھا تھا کہ ساتویں صدی عیسوی میں جب کہ اسلامی فوجیں عرب جزیرہ نما پر چھا گئیں تاکہ وہ محمد کے پیغام کو پھیلائیں۔ اس کے بعد عربوں نے اپنی تاریخ میں پہلی بار اس قسم کی کامیابی حاصل کی ہے۔ کسی زمانہ میں اگر تمام سڑکیں روم کو جاتی تھیں تو آج تمام سڑکیں ریاض کو جا رہی ہیں۔ جہاں ہر روز مغربی قوموں کے نمائندے اتر رہے ہیں تاکہ وہ جدید دنیا کے قارون (سعودی کنگ) سے ملاقات کر سکیں۔ پہاڑ آخر کار محمد کی طرف آرہا ہے:

The mountain, at last, is coming to Muhammad.

۳۔ تیسری اہم ترین چیز دعوتی مواقع کا کھلنا ہے۔ یہاں بھی مسلمانوں کی کوشش کے بغیر اللہ تعالیٰ نے براہ راست اپنی مداخلت کے تحت دعوت کے زبردست نئے مواقع کھول دئے ہیں ــــــ جدید مواصلاتی ذرائع، آزادی کے انقلاب کے ذریعہ بے روک ٹوک مذہبی تبلیغ کی اجازت۔ سائنسی دریافتوں کے نتیجہ میں اسلام کی باتوں کی علمی تصدیق۔ مذاہب کے تنقیدی مطالعہ کے ذریعہ اسلام کے سوا دوسرے تمام مذاہب کا غیر تاریخی ثابت ہونا۔ مادی تہذیب کی ناکامی کی بنا پر لوگوں کا از سر نو دین خدا کی طرف رجوع۔ وغیرہ

تاہم ان تمام جدید مواقع کے باوجود ایک شدید رکاوٹ ابھی تک باقی تھی۔ وہ ہے مارکسی اشتراکیت کے جبری نظام کی بنا پر دنیا کے ایک بڑے حصہ میں اسلام کے لئے اشاعت وعمل کے مواقع کا مسدود ہو جانا۔ یہ

ایک ایسا معاملہ تھا جس میں مسلمان مکمل طور پر بے بس ثابت ہو رہے تھے ۔ مگر یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ پیشین گوئی ظاہر ہوئی جو حدیث کی کتابوں میں اس طرح نقل کی گئی ہے :

عن ابی بکرۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم انہ قال : ان اللہ تبارك وتعالیٰ سیؤید هٰذا الدین باقوام لاخلاق لهم (مسند احمد)

حضرت ابو بکرہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ اس دین کی مدد ایسے لوگوں سے کرے گا جن کا دین میں کوئی حصہ نہ ہوگا۔

سوویت روس کے حکمراں میخائیل گورباچیف کا ظہور غالباً اسی خبر رسالت کی تصدیق ہے۔ گورباچیف نے تمام قیاسات کے خلاف اشتراکی سلطنت میں ایسی تبدیلیاں پیدا کیں کہ اشتراکی دنیا تاش کے پتوں کی طرح بکھرنے لگی۔ ٹائم میگزین (۱۲ مارچ ۱۹۹۰) کے الفاظ میں سوویت یونین سوویت ڈس یونین (Soviet Disunion) کی عملی تصویر بن گیا۔

ٹائم کے مذکورہ شمارہ میں ایک باتصویر رپورٹ شائع ہوئی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ سوویت روس کے تقریباً ۵۵ ملین مسلمان وہاں آنے والی نئی مذہبی رواداری کا پھل پا رہے ہیں :

Some 55 million Soviet Muslims enjoy the fruits of the new religious tolerance (p. 26).

رپورٹ میں تفصیل کے ساتھ دکھایا گیا ہے کہ اشتراکی دنیا میں نئے انقلاب کے بعد کس طرح مارکس کے خلافِ مذہب نظریات غیر معتبر ثابت ہو گئے ہیں۔ اور خود سوویت یونین میں اسلام کی اشاعت کے نئے مواقع پیدا ہو گئے ہیں۔ اس رپورٹ کا عنوان بامعنی طور پر ، ٹائم نے ان الفاظ میں قائم کیا ہے —— کارل مارکس محمد کے لئے جگہ خالی کرتا ہے :

Karl Marx makes room for Muhammad

روس جیسے مخالفِ مذہب ملک میں یہ جو موافقِ مذہب انقلاب آیا ہے ، اس نے حیرت انگیز طور پر اسلام اور مسلمانوں کے لئے نئے دروازے کھول دئے ہیں۔ اس تبدیلی کی بہت سی علامتوں میں سے ایک علامت یہ ہے کہ روس کی ہوائی کمپنی ایروفلاٹ اس پر راضی ہوئی کہ وہ اپنے ۲۰ مال بردار جہازوں کے ذریعہ قرآن کے دس لاکھ نسخے سعودی عرب سے روس کے علاقوں میں پہنچائے گی۔ اس سلسلہ میں ایروفلاٹ کا پہلا جہاز ۱۷ اپریل ۱۹۹۰ کو جدہ ائیر پورٹ پر اترا ۔ یہ دس لاکھ نسخے سعودی حکومت نے روسی مسلمانوں کو بطور

تحفہ دئے ہیں۔ یہ ایک انتہائی نئی صورت حال ہے۔ کیوں کہ اس سے پہلے روسی علاقہ میں قرآن کا داخلہ مطلق طور پر ممنوع تھا۔

یہ انقلابات جو پیش آئے، ان کا ایک پہلو یقیناً یہ تھا کہ اس سے امت مسلمہ کو تقویت حاصل ہو۔ وہ دوسری قوموں کی دستبرد سے محفوظ رہ کر ایک مستحکم اور خود کفیل قوم کی حیثیت سے اپنی جگہ بنائے، وہ دنیا میں اپنے سیاسی، اقتصادی اور فکری وجود کو قائم رکھ سکے۔

مگر یہ استحکام برائے استحکام نہ تھا۔ وہ خود ایک اعلیٰ مقصد کے لئے تھا۔ امت مسلمہ کے لئے قیام و استحکام کا یہ خدائی انتظام اس لئے تھا کہ وہ عزم اور یکسوئی کے ساتھ اپنے آپ کو اس مقصد کی راہ میں لگائے جو خدا کی طرف سے اس کے لئے مقرر کیا گیا ہے۔ یعنی دعوت و شہادت۔ یہ گویا واللہ یعصمك من الناس کے وعدۂ الٰہی کی تکمیل تھی۔ تاکہ پیغمبر عربی کی امت بلغ ما اُنزل الیك من ربك کی ذمہ داری کو بخوبی طور پر ادا کرے۔

ذمہ داری کی ادائگی میں ناکامی

اس میں کوئی شک نہیں کہ بیسویں صدی میں اللہ تعالیٰ نے اس امت کی اعلیٰ ترین صورت میں مدد کی ہے۔ مگر یہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے "ففٹی ففٹی" کا معاملہ ہے۔ جس طرح بارش برسانا اللہ تعالیٰ کا کام ہے، مگر اس بارش کو استعمال کرکے فصل اگانا کسان کی ذمہ داری ہے۔ یہی معاملہ دین کا بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہر قسم کے ضروری مواقع افراط کے ساتھ نازل کئے جاتے ہیں۔ مگر ان مواقع کو استعمال کرکے دین کا احیاء کرنا پھر بھی اہل اسلام کی ذمہ داری ہے۔ اگر اہل اسلام اپنی ذمہ داری کو ادا نہ کریں تو مواقع کی فراوانی کے باوجود دین کے لئے ان کا مفید بننا ممکن نہ ہوسکے گا۔

بدقسمتی سے موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی طرف سے یہی صورت پیش آئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنا "پچاس فیصد" حصہ مزید اضافہ کے ساتھ ادا کردیا۔ مگر مسلمان اپنا "پچاس فی صد" حصہ ادا کرنے میں سراسر ناکام رہے۔ یہی وجہ ہے کہ فراوانی کی حد تک مواقع کے حصول کے باوجود اسلام کی نئی تاریخ بنانے کا کام ابھی تک واقعہ نہ بن سکا۔

۱۔ موجودہ صدی میں مسلمانوں کو جو سیاسی اقتدار ملا، اس کو انھوں نے صرف باہمی جنگ کو تیز تر کرنے میں استعمال کیا ہے۔ مسلمانوں کا سیاسی طبقہ اب تک زیادہ تر یہ کرتا رہا ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح

دوسرے طبقوں کو محروم کر کے خود پورے سیاسی اقتدار پر قابض ہو جائے۔ اقتدار کی اس باہمی جنگ میں مسلمانوں کی بہترین صلاحیتیں اس طرح ختم کر دی گئیں جیسے ان کی کوئی قیمت ہی نہ تھی۔

اس معاملہ میں اسلام پسند طبقہ نے جو کردار ادا کیا ہے، وہ بھی اس سے کچھ زیادہ مختلف نہیں۔ اس طبقہ نے یہ کیا کہ مسلم ملکوں میں آزادی آتے ہی وہ حکمراں گروہ کے خلاف اپوزیشن پارٹی کا کردار ادا کرنے کے لئے کھڑا ہو گیا" اسلامی قانون نافذ کرو" کے نام پر اس نے اپنے ملک کے مسلم حکمرانوں سے سیاسی جنگ چھیڑ دی۔ اس طرح اسلام اور حکمراں غیر ضروری طور پر ایک دوسرے کے حریف بن گئے۔

اسلام پسند طبقہ اگر اس کے برعکس یہ کرتا کہ وہ تدریجی اور بتدریج انداز اختیار کرتا، اور سیاسی ٹکراؤ سے پوری طرح اپنے آپ کو بچاتا تو مسلم حکمرانوں کی طرف سے اس کو زبردست تعاون ملتا۔ جیسا کہ مصر میں جمال عبد الناصر نے اپنے زمانہ حکومت (۷۰ ـ ۱۹۵۲) میں الاخوان المسلمون کو مصر کی وزارت تعلیم کی پیش کش کی۔ پاکستان میں محمد ایوب خاں نے اپنے زمانہ حکومت (۶۹ ـ ۱۹۵۸) میں جماعت اسلامی کو یہ پیش کش کی کہ اعلیٰ سطح کی ایک اسلامی یونیورسٹی بنا کر ان کے حوالے کر دی جائے اور وہ اس کے ذریعہ پاکستان کی نئی نسلوں کو اسلامی نہج پر تیار کریں۔ مگر مصر اور پاکستان دونوں جگہوں کے اسلام پسندوں نے اس پیش کش کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

اس طرح مسلم ملکوں کی سیاسی آزادی سیکولر لیڈروں اور اسی کے ساتھ اسلامی لیڈروں کی باہمی سیاسی آویزش کی نذر ہو گئی۔ ان مواقع کا کوئی فائدہ اب تک اسلام کو حاصل نہ ہو سکا۔ ایک تاریخ بنتے بنتے رہ گئی۔

اس معاملہ میں اسلام پسند رہنما دراصل اپنی اس غلطی کا شکار ہوئے جو انھوں نے دین کی سیاسی تعبیر کی صورت میں کی تھی۔ اس طبقہ کے مفکرین نے اسلام کی تصویر اس طرح بنائی کہ وہ دنیا میں تعمیر نظام کے ہم معنی بن گیا۔ جس طرح ڈیموکریسی یا سوشلزم تعمیر نظام کے ہم معنی ہے۔ اس بنا پر ان کا نشانہ عملی طور پر سیاست و حکومت بن گیا۔ ان کو کرنے کا اصل کام یہ نظر آیا کہ وہ موجودہ سیاسی نظام کو توڑیں تاکہ اس کی جگہ دوسرا سیاسی نظام قائم کر سکیں۔ اپنی اس تعبیر دین کی بنا پر وہ فوراً اپنی حکومتوں سے ٹکرا گئے۔

اس کے برعکس اگر انھوں نے دین کی تفسیر آخرت میں حصول نجات کی صورت میں کی ہوتی تو ان کا نشانہ دعوت ہوتا۔ وہ سب سے بڑا کام اس کو سمجھتے کہ اہل عالم کو آخرت کی حقیقت سے باخبر کر دیں۔ وہ انذار آخرت کو اپنا نشانہ بناتے نہ کہ قیام حکومت کو۔

۲ ۔ حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ وقت آنے والا ہے کہ فرات سونے کا خزانہ ظاہر کرے۔ پس جو شخص اس وقت موجود ہو وہ اس میں سے کچھ نہ لے (عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: یوشکُ الفراتُ ان یحسرَ عن کنز من ذھب فمن حضر فلا یاخذ منہ شیئا، متفق علیہ)

اس حدیث میں دریائے فرات کی تمثیل غالباً پٹرول کی تعبیر ہے جس کو پگھلا ہوا سونا (Liquid gold) کہا جاتا ہے۔ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ پٹرول کا سیال خزانہ جب مسلم دنیا میں ظاہر ہو تو اس کو شخصی عیش یا ذاتی مقاصد میں لگانا درست نہیں۔ اس کا اصل استعمال یہ ہے کہ اس کو دعوت الی اللہ اور ملت کے احیاء جیسے کاموں میں خرچ کیا جائے۔

مگر اب تک کے واقعات بتاتے ہیں کہ اس خزانہ کا بہت ہی کم حصہ حقیقی دینی مقصد میں استعمال ہو سکا ہے۔ اس کا ایک بڑا حصہ ذاتی حوصلوں کی تسکین میں خرچ ہو رہا ہے، اور دوسرا بڑا حصہ بے فائدہ جنگوں میں ضائع ہو رہا ہے۔ مثلاً عراق۔ ایران جنگ جو آٹھ سال (۲۲ ستمبر ۱۹۸۰ تا ۲۰ اگست ۱۹۸۸) مسلسل جاری رہی۔ اس جنگ میں دونوں ملکوں کا ایک ہزار بلین (1,000 billion) ڈالر سے زیادہ برباد ہوا۔ یہ وہ نقصان ہے جو براہ راست ہوا۔ بالواسطہ نقصان کی مقدار بھی کسی طرح اس سے کم نہیں۔

پٹرول کے خدائی خزانہ کا سب سے بڑا استعمال یہ تھا کہ اس کو دعوت الی اللہ کے مقاصد میں خرچ کیا جائے اور اسلام کے پیغام کو ہر خیمہ اور ہر مکان تک پہنچا دیا جائے۔ مگر یہی وہ کام ہے جو اب تک انجام نہ پا سکا۔ ہمارے رہنما مختلف ناموں سے اونچی اونچی عمارتیں کھڑی کرنے میں مصروف ہیں یا جلسوں اور کانفرنسوں کے ہنگامے جاری کرنے میں۔ دعوت الی اللہ کے کام کو وہ اس طرح چھوڑے ہوئے ہیں جیسے کہ وہ اس کو جانتے ہی نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ موجودہ زمانہ میں بہت سے لوگ اپنے آبائی دین کو چھوڑ کر اسلام میں داخل ہوئے ہیں مگر ایسا انھوں نے خود اپنی فطرت کی آواز کی بنا پر کیا ہے نہ کہ ہمارے دینی رہنماؤں کی تبلیغ و دعوت کے نتیجہ میں۔

۳ ۔ موجودہ زمانہ میں جو دعوتی امکانات پیدا ہوئے ہیں، وہ ابھی تک غیر استعمال شدہ حالت میں پڑے ہوئے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دعوت کا یہ کام غیر مسلم قوموں میں انجام دینا ہے، اور موجودہ زمانہ کے مسلمانوں میں مختلف اسباب سے ان قوموں کے خلاف اتنی زیادہ شکایتیں پیدا ہو گئی ہیں کہ ان کے اندر

دعوتی کام کی رغبت پیدا نہیں ہوتی۔ دعوت کے کام کے لئے نصح (خیر خواہی) کا جذبہ درکار ہے۔ مگر موجودہ زمانہ میں یہ جذبہ مسلمانوں کے اندر موجود نہیں۔ غیر مسلم قومیں ان کے لئے نفرت کا موضوع بنی ہوئی ہیں۔ پھر وہ ان پر دعوت کا کام کس طرح کر سکتے ہیں. جو سراسر شفقت اور خیر خواہی کے جذبہ کے تحت انجام دیا جانے والا کام ہے۔

یہ دنیا مقابلہ اور مسابقت کی دنیا ہے۔ مزید یہ کہ انسان کے اندر حرص اور ظلم اور اقتدار پسندی جیسی کمزوریاں پائی جاتی ہیں۔ اس بنا پر اس دنیا میں ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ لوگوں کے درمیان ایک دوسرے کے خلاف شکایت کے اسباب پیدا ہو جاتے ہیں۔ اسی لئے داعی پر لازم ٹھہرایا گیا ہے کہ مدعو کی قابل شکایت باتوں پر وہ یک طرفہ طور پر صبر کرے۔ اگر داعی ایسا نہ کرے تو وہ کبھی اپنے مدعو گروہ پر دعوت کا کام انجام نہیں دے سکتا۔

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ وجعلنا منہم ائمۃ یہدون بامرنا لمّا صبروا (السجدۃ ۲۴) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امام ہدایت بننے کے لئے صبر کی شرط کو پورا کرنا پڑتا ہے۔ جو لوگ صبر کی لازمی شرط کو پورا نہ کریں، وہ امام ہدایت بننے کی توفیق پانے سے بھی محروم رہیں گے۔

یہ اس دور کا سب سے بڑا المیہ ہے کہ عین اس وقت جب کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اقتدار دیا۔ اس نے ان کے لئے اقتصادی ذرائع فراہم کئے۔ اس نے دعوت کے نئے امکانات کھول کر دعوت کے عمل کو آخری حد تک آسان بنا دیا، عین اس وقت مسلمان اپنی مدعو قوموں کی بعض زیادتیوں سے ردعمل کا شکار ہو کر ان کے خلاف نفرت و عداوت کی نفسیات میں مبتلا ہو گئے۔ دعوت کا عمل انتہائی خیر خواہی کا عمل ہے، اور جب داعی اپنے مدعو کے لئے خیر خواہی کھو دے تو اس کے بعد وہ اس کے اوپر دعوت کا عمل انجام نہیں دے سکتا۔ یہی حادثہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں میں بہت بڑے پیمانہ پر پیش آیا ہے۔

مدعو سے نفرت کرنا ایسا ہی ہے جیسے ڈاکٹر اپنے مریض سے نفرت کرنے لگے۔ یا تاجر اپنے گاہکوں سے بیزار ہو جائے۔ ایسا ڈاکٹر اور ایسا تاجر کبھی اپنے کام کو اس طرح انجام نہیں دے سکتا جیسا کہ اسے انجام دینا چاہئے۔ اسی طرح جو داعی اپنے مدعو کے بارہ میں نفرت اور بیزاری میں مبتلا ہو جائے وہ کبھی مدعو کے اوپر اپنی داعیانہ ذمہ داری کو ادا نہیں کر سکتا۔

اسی لئے داعی کو اپنے مدعو کی زیادتیوں پر صبر کا حکم دیا گیا ہے۔ بالفاظ دیگر، شکایتوں اور زیادتیوں

کے باوجود داعی کو اپنے مدعو کا ناصح اور خیر خواہ بنے رہنا ہے۔ تاکہ وہ دعوت کی ذمہ داریوں کو حسن وخوبی کے ساتھ انجام دے سکے۔

کرنے کا کام

۱۔ آج کرنے کا پہلا کام یہ ہے کہ مسلمانوں، خاص طور پر مسلم نوجوانوں کے اندر دعوتی شعور پیدا کیا جائے۔ مسلم دنیا میں موجودہ زمانہ میں دعوت کا لفظ اس طرح استعمال کیا جا رہا ہے جیسے کہ وہ مسلمانوں کی قومی جدوجہد کا مذہبی عنوان ہے۔ مگر یہ صحیح نہیں۔ دعوت سے مراد یہ ہے کہ اسلام کا مثبت پیغام دوسری قوموں تک پہنچایا جائے۔ یہی امت محمدی ہونے کی حیثیت سے مسلمانوں کی اصل ذمہ داری ہے۔ دعوت کی بنیاد پر جب تک مسلمانوں کے اندر ذہنی انقلاب نہ لایا جائے کوئی حقیقی دعوتی کام نہیں کیا جاسکتا۔

۲۔ موجودہ زمانہ میں مسلمان لکھنے والوں نے ہر زبان میں بے شمار کتابیں چھاپی ہیں۔ مگر اسلام کا جدید کتب خانہ اسلام پر سائنٹفک لٹریچر سے تقریباً خالی ہے۔ موجودہ پریس کے دور میں دعوتی کام کرنے لئے وقت کے معیار کے مطابق اسلامی لٹریچر انتہائی ضروری ہے۔ یہ لٹریچر اپنے مضمون اور اپنی زبان دونوں اعتبار سے انتہائی طاقت ور ہونا چاہئے، ورنہ وہ دعوتی کام میں زیادہ مفید نہیں ہو سکتا۔

۳۔ قرآن اور منتخب احادیث کے ترجمے ہر زبان میں تیار کرکے شائع کئے جائیں۔ اسی طرح سیرت پر سادہ اور تاریخی انداز میں کتاب تیار کرکے ہر زبان میں چھاپی جائے۔ یہ کام اعلیٰ علمی معیار پر ہونا چاہئے۔ اعلیٰ معیار سے کم تر معیار کی کوئی چیز موجودہ زمانہ میں فکری تاثیر پیدا کرنے والی نہیں بن سکتی۔

۴۔ آجکل ہر مسلم ملک میں اسلام پسند طبقہ ایک سیاسی مہم جاری کئے ہوئے ہے۔ یہ اپنے ملک کے حکمراں افراد سے خفیہ یا علانیہ انداز میں ٹکراؤ ہے۔ اس ٹکراؤ کو اسلامی قانون کے نفاذ کے نام پر جاری کیا گیا ہے۔ مگر یہ نام نہاد اسلامی سیاست دعوت کا عمل جاری کرنے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ اس سیاسی بدعت کو مکمل طور پر ختم کر دیا جانا چاہئے۔ ورنہ مسلم ممالک کے قیمتی وسائل ضائع ہوتے رہیں گے۔ وہ دعوت کے کام میں استعمال نہیں ہو سکتے۔

۵۔ دوسری چیز جس کو فوراً ختم ہونا چاہئے وہ غیر مسلم اقوام کے خلاف احتجاج اور مطالبات کی سیاست ہے۔ یہ سیاست بھی ساری دنیا میں کسی نہ کسی صورت میں موجود ہے۔ یہ غیر مسلم اقوام مسلمانوں کے لئے مدعو کے درجہ میں ہیں۔ مادی مسائل کے عنوان پر ان کے خلاف ایسی مہم چلانا جس سے دونوں گروہوں

میں نزاع کا ماحول پیدا ہوتا ہو، سراسر اسلام کے خلاف ہے۔ اس سے دعوت کی فضا ختم ہوتی ہے، اور دعوت کی فضا اتنی اہم چیز ہے کہ اس کو ہر قیمت پر باقی رکھنا انتہائی ضروری ہے۔ خواہ اس کو قائم کرنے کی خاطر مسلمانوں کو یک طرفہ طور پر نقصان اٹھانا پڑے۔

٦۔ دعوتی کام کے لئے کوئی لگا بندھا پروگرام بنانے کی ضرورت نہیں۔ لوگوں کے اندر دعوتی کام کی تڑپ پیدا کر دیجئے، اس کے بعد لوگ خود ہی اپنے حالات کے مطابق اپنا دعوتی پروگرام بنالیں گے۔

آخری بات

اوپر جو کچھ کہا گیا، اس سے چند باتیں بالکل واضح ہو جاتی ہیں۔ یہ کہ امت مسلمہ کا اصل مشن لوگوں تک آخرت کے پیغام کو پہنچانا ہے۔ جہاں تک اس کے دنیوی مسائل کا تعلق ہے، ان کو براہ راست توجہ کا مرکز بنانا درست نہیں۔ ان کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ اگر تم نے اصل مشن کو انجام دیا تو ایسے حالات پیدا کئے جائیں گے کہ تمہارے مسائل براہ راست کوشش کے بغیر حل ہوتے چلے جائیں۔

دوسری بات یہ کہ موجودہ زمانہ میں ایسے حالات پیدا ہوئے ہیں جنھوں نے دعوت کے عمل کو بہت زیادہ آسان بنا دیا ہے۔ تاہم ان دعوتی امکانات کو بروئے کار لانے کے لئے انسانوں کی ضرورت ہے۔ سارے امکانات کے باوجود یہ ضرورت باقی رہتی ہے کہ کچھ اہل افراد اٹھیں اور ضروری جدوجہد کرکے ان امکانات کو واقعہ بنا دیں۔

اسلام کے پاس نظریہ ہے، مگر اسلام کے پاس آج مردان کار نہیں۔ یہی موجودہ زمانہ میں اسلام کا اصل مسئلہ ہے۔ آج ساری دنیا میں مسلمانوں کی تعداد تقریباً ایک ارب ہے۔ مگر یہ تقلیدی انسانوں کی بھیڑ ہے، وہ باشعور انسانوں کا گروہ نہیں۔ آج سب سے پہلی ضرورت یہ ہے کہ مسلمانوں کو شعوری معنوں میں مسلمان بنایا جائے۔ ان کا ایمان ان کے لئے فکری انقلاب کے ہم معنی بن جائے۔ جس دن ایسا ہوگا اسی دن اسلام کی وہ نئی تاریخ بننا شروع ہو جائے گی جس کا آج زمین و آسمان کو سب سے زیادہ انتظار ہے۔

دعوتِ حق

۱۹۱۱ میں اٹلی کی فوجیں سمندر پار کرکے طرابلس (لیبیا) میں داخل ہوگئیں۔ یہاں ان کا قبضہ ۱۹۴۳ تک باقی رہا۔ یہ خبر جب عالم اسلام میں پھیلی تو لوگوں نے جذباتی تقریریں کیں۔ شاعروں نے اشعار کہے۔ ادیبوں نے پرشور مضامین لکھے۔ وغیرہ

مولانا حمید الدین فراہی (۱۹۳۰ - ۱۸۶۳) ہندستان کے ایک خاموش عالم دین تھے۔ مگر طرابلس میں اطالوی فوجوں کے داخلہ کی خبر سن کر وہ بھی بے چین ہو گئے اور انھوں نے ایک عربی نظم کی صورت میں اپنے جذبات کا اظہار کیا۔ اس کا ایک شعر یہ تھا:

کیف القرار وقد نکس　　أعلامنا بطرابلس

(کیسے مجھ کو چین آئے، جب کہ ہمارے جھنڈے طرابلس میں جھک گئے)

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلمان کس چیز کے لئے تڑپے۔ وہ اس لئے تڑپے کہ موجودہ زمانہ میں ان کا سیاسی جھنڈا گر گیا۔ ان کی قومی عظمت کا مینار ڈھ گیا۔ دنیوی اعتبار سے انھوں نے اپنے لئے سربلندی کا مقام کھو دیا۔

یہ نفسیات سراسر خلاف قرآن اور خلاف سنت ہے۔ قرآن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تصویر یہ دی گئی ہے کہ آپ کو سب سے زیادہ لوگوں کی ہدایت کا غم تھا، حتی کہ اس غم میں آپ اپنے کو ہلاک کئے دے رہے تھے (لعلك باخع نفسك ألّا يكونوا مومنين، الشعراء ۳)

مولانا حمید الدین فراہی قرآن کے مفسر تھے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ انھیں اپنی اس غیر قرآنی نفسیات کا اندازہ نہ ہو سکا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن کی بے شمار تفسیریں لکھی گئیں مگر اس کی کوئی دعوتی تفسیر نہیں لکھی گئی۔ قرآن سراسر کتاب دعوت ہے۔ مگر یہی بات قرآن کے تمام مفسروں نے حذف کر رکھی ہے:

ہماں ورق کہ سیہ گشتہ مدعا ایں جاست

سورۃ الشعراء کی مذکورہ آیت (لعلك باخع نفسك ألّا يكونوا مومنين) کی بابت عام مفسرین یہ کہتے ہیں کہ یہ تسلی کی آیت ہے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مخاطبین ایمان نہیں

لا رہے تھے تو آپ کو غم ہوا کہ کہیں یہ میری کوتاہی نہ ہو۔ اس لئے آپ کو تسلی دی گئی کہ آپ کو زیادہ گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ محمد علی الصابونی نے صفوة التفاسیر میں مفسرین کی رائے کا خلاصہ ان لفظوں میں نقل کیا ہے :

فیہ تسلیة للرسول علیہ السلام حتی لا یحزن ولا یتأثر علیٰ عدم ایمانھم)
سید قطب نے لکھا ہے کہ : ذالك الیٰ تسلیة الرسول صلے اللہ علیہ وسلم وتعزیتہ عن تکذیب المشرکین لہ والقرآن)

حالانکہ اس آیت میں دراصل داعی حق کی تصویر ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ داعی اپنے مخاطبین کی ہدایت اور نجات کے لئے کتنا زیادہ بے چین ہوتا ہے۔ یہی اس کی سب سے بڑی تڑپ ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ بظاہر ایسا معلوم ہونے لگتا ہے کہ اس غم میں وہ اپنے آپ کو ہلاک کر ڈالے گا۔

یہ مثال بتاتی ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی اصل کوتاہی کیا ہے۔ وہ کوتاہی یہ ہے کہ وہ لوگوں کے ہاتھوں اپنا قومی جھنڈا اگرائے جانے پر تڑپے، مگر وہ لوگوں کے جہنم میں گرنے پر بے چین نہ ہوسکے۔ لیبیا پر جس قوم نے حملہ کیا، وہ مسلمانوں کے نزدیک ایک "کافر" قوم تھی۔ اپنی ضلالت کے نتیجہ میں وہ جہنم میں جانے والی تھی۔ مگر یہ واقعہ مسلمانوں کو بے چین نہ کر سکا کہ وہ اٹھیں اور ان کو آگ کے راستہ سے ہٹا کر جنت کے راستہ پر ڈالنے کی کوشش کریں۔ مسلمان صرف اس وقت بے چین ہوئے جب کہ یہ گمراہ قوم خود ان کے قومی اور سیاسی وجود کے لئے خطرہ بن گئی۔

پیغمبر اسلام کا نمونہ

قرآن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تبلیغ رسالت کا حکم ان الفاظ میں دیا گیا تھا : قم فانذر (اٹھ اور لوگوں کو ڈرا دے) انذار کا لفظ بتاتا ہے کہ آپ کی دعوت کا خاص نشانہ کیا تھا۔ آپ کی دعوت کا خاص نشانہ یہ تھا کہ لوگوں کو زندگی کی اس حقیقت سے باخبر کیا جائے کہ موت کے بعد انھیں اللہ کے سامنے حساب کتاب کے لئے کھڑا ہونا ہے۔ اور اس کے بعد یا ابدی جنت ہے یا ابدی جہنم۔

مکہ میں جب دعوت عام کا حکم ہوا تو آپ نے لوگوں کو بلا کر صفا پہاڑی کے پاس جمع کیا۔ جب لوگ اکھٹا ہو گئے تو آپ نے ان کے سامنے ایک مختصر تقریر کی۔ اس تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ اے لوگو، میں تم کو ایک آنے والے سخت عذاب سے ڈراتا ہوں (فانی نذیر لکم بین یدی عذاب شدید)

لوگ زندگی کے اندیشوں میں جی رہے تھے، آپ نے انھیں یہ پیغام دیا کہ تمہارے لئے زیادہ ضروری یہ ہے کہ تم موت کے اندیشہ میں جیو۔ تم دنیا سے زیادہ آخرت کی فکر کرو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مکہ سے ہجرت کرکے مدینہ پہنچے تو وہاں آپ کی حیثیت سردار اور حاکم (آمر اور مطاع) کی تھی۔ مگر وہاں بھی آپ نے یہی بات کہی۔ ابن ہشام نے ہجرت کے واقعات کے تحت ایک عنوان ان لفظوں میں قائم کیا ہے: اول خطبة خطبها رسول الله صلى الله عليه وسلم۔ مدینہ کے اس پہلے خطاب میں بھی آپ نے شروع سے آخر تک صرف آخرت کی بات کہی۔ اس خطاب کا متن جو ابن ہشام نے روایت کیا ہے اس کو مکمل طور پر اصل کتاب میں دیکھا جاسکتا ہے۔ اس کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مدینہ میں آپ نے لوگوں کے سامنے جس حقیقت کا اعلان کیا، وہ بھی یہی آخرت کا مسئلہ تھا۔ اس کا خلاصہ آپ کے ان الفاظ میں ہے کہ ـــــ اے لوگو، اپنے آپ کو آگ سے بچاؤ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے آخری عمومی خطبہ وہ ہے جس کو خطبۂ حجۃ الوداع کہا جاتا ہے۔ اس وقت پورا عرب اسلام کے ماتحت آچکا تھا۔ مگر اس وقت بھی آپ نے اپنے خطاب کا جو انداز اختیار فرمایا، وہ تمام تر آخرت والا انداز تھا۔ خطبہ کے آخر میں آپ نے لوگوں کے سامنے یہ الفاظ دہرائے: الا هل بلغت (کیا میں نے پہنچا دیا)، اس وقت آپ نے یہ نہیں کہا کہ ـــــ هل اقمت الحكومة، هل نفذت الشريعة۔ یہ واقعہ یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ اسلام کی دعوت میں اول سے آخر تک ساری اہمیت مسئلہ آخرت کی ہے۔ بقیہ تمام چیزیں ذیلی یا اضافی حیثیت رکھتی ہیں۔

سنگین مسئلہ

ایک اندھا آدمی چل رہا ہے۔ وہ چلتے چلتے ایک کنویں کے کنارے پہنچ گیا۔ اِس کا اندیشہ ہے کہ اگر وہ بڑھتا رہا تو اگلے لمحہ وہ کنویں کے اندر گر جائے گا۔ اس وقت اس خطرہ سے آگاہ کرنے کے لئے کیا کہا جائے گا۔ علم بلاغت کہتا ہے کہ اس وقت صرف کنواں کنواں (البئر البئر) کہا جائے گا۔

یہ نابینا اگر ننگے پاؤں ہو تو اس وقت اس کی خیر خواہی یہ نہ ہوگی کہ کوئی شخص اس کے لئے نیا جوتا خریدنے کے لئے بازار کی طرف دوڑے۔ یا اگر اس کے جسم کے کپڑے پھٹے ہوئے ہوں تو کپڑا لے کر درزی کے یہاں جائے اور ایک جوڑا کپڑا تیار کرنے کا آرڈر دے۔ وہ نابینا اگر بھوکا پیاسا ہو تو اس وقت اس کے کھانے پینے کا انتظام بھی نہیں کیا جائے گا۔ حتی کہ ایسا بھی نہیں کیا جائے گا کہ اخوت اور شرافت کا مظاہرہ

کرتے ہوئے اس سے یوں ہم کلام ہوا جائے: اے جناب نابینا صاحب، آپ سے مؤدبانہ گزارش ہے کہ آپ جس راستہ پر جارہے ہیں، اس راستہ پر آپ تشریف نہ لے جائیں، کیوں کہ اس میں آپ کے آگے ایک گہرا کنواں ہے۔

اس نابینا کے معاملہ میں ہر آنکھ والا آدمی بلاغت کے مذکورہ اصول کو برتے گا۔ وہ صرف کنواں کنواں پکارے گا۔ اس کے سوا ہر بات کو وہ نظر انداز کر دے گا۔ کوئی آدمی ہرگز اس کے خلاف نہیں کر سکتا۔ مگر ایک اور شدید تر معاملہ میں ہر آدمی اس اصول کی خلاف ورزی کر رہا ہے، اور وہ دعوت حق کا معاملہ ہے۔

موجودہ دنیا میں جو بھی آیا ہے، اس کو لازماً مرنا ہے۔ کوئی شخص اپنے آپ کو موت سے بچا نہیں سکتا۔ مزید یہ کہ موت کا کوئی وقت مقرر نہیں۔ کیوں کہ ہم دیکھتے ہیں کہ یہاں بچے بھی مرتے ہیں اور جوان بھی اور بوڑھے بھی۔ اسی طرح کوئی بیمار ہو کر مرتا ہے کوئی اچانک تندرستی کی حالت میں مر جاتا ہے۔ موت کا وقت مکمل طور پر لامعلوم ہے۔ ہر آدمی کے لئے ہر وقت اندیشہ ہے کہ اس کی موت آجائے اور موجودہ دنیا سے اس کا رشتہ ٹوٹ جائے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر آدمی ہر لمحہ موت کے کنارے کھڑا ہوا ہے۔ ہر آدمی ہر آن مذکورہ نابینا سے لاکھوں اور کروروں گنا سے بھی زیادہ سنگین خطرے سے دو چار ہے۔ کیوں کہ اندھے کی غفلت اس کو صرف ایک کنوئیں میں گرا سکتی ہے، جب کہ موت سے غفلت آدمی کو جہنم میں گرا دے گی۔ جو تمام مصیبتوں سے زیادہ بڑی مصیبت ہے۔

اب جو لوگ موت کے معاملہ میں "آنکھ والے" ہیں۔ یعنی وہ جانتے ہیں کہ موت زندگی کا خاتمہ نہیں، موت اگلی دنیا میں داخلہ کا دروازہ ہے جہاں ہر آدمی کا عمل دیکھا جائے گا اور اس کے مطابق اس کو جنت یا جہنم میں داخل کیا جائے گا۔ ایسے باخبر لوگ بے خبروں کے معاملہ میں کیا کریں گے۔ کیا ان کے سامنے وہ فلاح دنیا یا نظام کامل کی تجویز پیش کریں گے۔ نہیں۔ وہ چلّا اٹھیں گے: "موت، موت"۔ وہ کہیں گے کہ اے لوگو، اپنے آپ کو آگ سے بچاؤ، خواہ کھجور کے ایک ٹکڑے ہی کے ذریعہ کیوں نہ ہو (اتقوا النار ولو بشق تمرة)

مگر موجودہ زمانہ میں جو لوگ اسلام کے نام پر تحریکیں چلا رہے ہیں، ان کو ہم دیکھتے ہیں کہ کوئی شخص آزادی کا نعرہ لگا رہا ہے اور کوئی شخص اقامت نظام کا۔ کوئی ظلم کو مٹانے کے لئے مجاہدین کی فوج بنا رہا ہے اور کوئی عالمی سطح پر حکومت الٰہیہ قائم کرنے کا۔

مگر اس قسم کی تمام تحریکیں "بلاغت دعوت" کے خلاف ہیں۔ جس انسان کا معاملہ یہ ہو کہ وہ کامل بربادی (موت) کے کنارہ کھڑا ہوا ہے۔ اس کے حق میں واحد سب سے بڑی خیر خواہی یہ ہے کہ اس کو موت کے بعد آنے والے سنگین خطرہ سے آگاہ کیا جائے۔ جس طرح کنویں کے کنارہ کھڑے ہوئے نابینا سے صرف ایک بات کہی جائے گی۔ اس کے سوا کوئی اور دوسری بات کہنا بلاغت کلام کے خلاف ہوگا۔

اسی طرح جس تحریک کے رہنما موت کے مسئلہ سے باخبر ہوں، ان کے لئے یقیناً سب سے بڑی بات یہی ہوگی۔ وہ ہر دوسری چیز کو نظر انداز کرکے انسان کو اس خطرہ سے آگاہ کریں گے تاکہ مرنے سے پہلے آدمی اس حقیقت کو جان لے، وہ دارالجزاء میں داخل ہونے سے پہلے اس کی تیاری کر لے۔

سرونسٹن چرچل نے ۱۹۵۴ میں جنگ کے خلاف چیتاونی دیتے ہوئے کہا تھا کہ آج ساری دنیا جہنم کے کنارے گھوم رہی ہے:

The world is roaming around the brim of hell.

چرچل کے سامنے تیسری عالمی جنگ کا خطرہ تھا۔ انھوں نے اپنے انتباہ میں "جہنم" کا لفظ مجازی طور پر استعمال کیا تھا۔ مگر ایک باخبر مومن اور داعی کے لئے یہ مجاز نہیں ہے، بلکہ حقیقت ہے۔ یہ ایک واقعہ ہے کہ پوری دنیا بھڑکتی ہوئی جہنم کے کنارے کھڑی ہے۔ ہر آن یہ خطرہ ہے کہ کب وہ اس کے اندر گر پڑے۔ تیسری عالمی جنگ کا خطرہ ٹل سکتا ہے، مگر جہنم کا خطرہ اتنا یقینی ہے کہ اس سے اللہ کے متقی بندوں کے سوا کوئی بھی مامون و محفوظ نہیں۔

تیسری عالمی جنگ کے خطرات سے جو لوگ آگاہ ہیں، وہ اس کو ٹالنے کے لئے رات دن سرگرم عمل ہیں۔ ایسی حالت میں جو لوگ جہنم کے شدید تر خطرات سے آگاہ ہیں، ان کو سیکڑوں گنا زیادہ بڑھ کر سرگرم عمل ہونا چاہئے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ اتنا بڑا مسئلہ ہے کہ آدمی کو اگر اس کا احساس ہو جائے تو اس کا دن کا سکون اور رات کی نیند اڑ جائے۔ اس کی نفسیات کے اندر ایک ایسا بھونچال آجائے کہ وہ چاہنے لگے کہ کاش میرا ہر بال ایک زبان ہوتا اور میں اپنی ساری قوت کو استعمال کرکے ساری دنیا کو آنے والے خطرہ سے آگاہ کر دیتا۔

دعوت الی اللہ

قرآن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو داعی الی اللہ (الاحزاب ۴۶) کہا گیا ہے۔ اسی دعوت

الی اللہ کو متبعین رسول کا طریقہ بھی بتایا گیا ہے (یوسف ۱۰۸) یہ دعوت الی اللہ پہلے بھی اہل ایمان کی ذمہ داری تھی، اور اب موجودہ مسلمانوں کی ذمہ داری بھی یہی ہے۔

دعوت الی اللہ حقیقۃً دعوت الی عبادۃ اللہ ہے۔ چنانچہ تمام پیغمبروں نے اپنے مخاطبین سے یہی کہا کہ تم لوگ ایک اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا کسی اور کی عبادت نہ کرو (۱۴/۴۱) عبادت اِس کا نام ہے کہ کسی ہستی کو اپنے سے بڑا اور مقدس مان کر اس کے آگے جھکنے والا معاملہ کیا جائے (اصل العبودیۃ الخضوع والتذلل، لسان العرب)

قرآن میں ہے کہ اللہ نے انسانوں کو اسی لئے پیدا کیا ہے کہ وہ اس کی عبادت کریں (وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عبادت کی صفت خود انسان کی تخلیق میں شامل ہے۔ وہ خود انسان کی فطرت میں پیوست ہے۔ تاہم عبادت کے سلسلہ میں انسان کا معاملہ وہی ہے جو پیاس کا معاملہ ہے۔ انسان کو پیاس لگتی ہے، وہ پانی پی کر اپنی پیاس بجھاتا ہے۔ اس میں پیاس لگنا ایک فطری معاملہ ہے اور پینا انسان کے اپنے اختیار کا معاملہ۔ پیاس انسان کی فطرت میں اندرونی طور پر شامل ہے۔ پیاس ہر انسان کو ضرور لگتی ہے۔ کوئی آدمی اس کیفیت کو اپنے اندر سے ختم نہیں کرسکتا۔ مگر یہ آدمی کے اپنے اختیار کی بات ہے کہ وہ اپنی پیاس بجھانے کے لئے پانی پئے یا شراب۔ پیاس فطرت کا تقاضا ہے اور پانی یا شراب آدمی کا اپنا اختیار۔

اسی طرح عبادت کا تقاضا ایک فطری تقاضا ہے۔ آدمی اس پر قادر نہیں کہ وہ اس تقاضے کو اپنے اندر سے ختم کردے۔ مگر یہ اس کے اپنے ارادہ اور اختیار کی بات ہے کہ وہ اللہ کی عبادت کرے یا اللہ کے سوا کسی اور کی۔ آدمی جب اللہ کی عبادت کرتا ہے تو وہ اپنی فطرت کے تقاضے کو صحیح صورت میں ادا کرتا ہے۔ اس کے برعکس آدمی جب اللہ کے سوا کسی اور کی عبادت کرتا ہے تو وہ اپنی فطرت کے تقاضے کو غلط طور پر پورا کرتا ہے۔

سب سے بڑا ظلم

قرآن میں حضرت لقمان کی زبان سے یہ تعلیم دی گئی ہے کہ تم شرک نہ کرو، کیوں کہ شرک سب سے بڑا ظلم ہے (لا تشرک باللہ ان الشرک لظلم عظیم، لقمان)

ظلم کے معنی ہیں ـــــ کسی چیز کو اس کی اصل جگہ کے بجائے کہیں اور رکھنا (الظلم: وضع الشیٔ فی

غیر موضعہ ، لسان العرب) جب آدمی ایک اللہ کو مانتا ہے تو وہ اپنی فطرت کے جذبۂ عبودیت کو اس کی جگہ پر رکھتا ہے ۔ اور جب وہ اللہ کے سوا کسی اور چیز کو مانتا ہے تو وہ اپنی فطرت میں چھپے ہوئے جذبۂ عبودیت کو اس کی اصل جگہ کے علاوہ کہیں اور رکھتا ہے ۔ اس اعتبار سے توحید وضع الشئ فی موضعہ ہے اور شرک وضع الشئ فی غیر موضعہ)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی دعوت کا اصل نشانہ یا اس کا اصل نکتہ کیا ہے ۔ ایک لفظ میں وہ یہ ہے کہ انسانیت وضع الشئ فی غیر موضعہ کی غلطی میں مبتلا ہے ۔ اب ہم کو تبلیغ و تلقین کے ذریعہ اسے وضع الشئ فی موضعہ کے مقام پر لے آنا ہے ۔

انسان کے بارہ میں یہ بات کہ وہ ایک " عبادت گزار " مخلوق ہے ، صرف مذہبی عقیدہ کی ایک بات نہیں ۔ خود علم الانسان (Anthropology) سے بھی یہی بات خالص علمی انداز میں ثابت ہوئی ہے ۔ انسان کے اندر پرستش اور مذہبیت کا جذبہ اتنا زیادہ رچا بسا ہوا ہے کہ علماء وقت یہ کہنے پر مجبور ہوئے ہیں کہ انسان ایک پرستار حیوان ہے ، انسان ایک مذہبی حیوان ہے :

Man is a worshipper animal.
Man is a religious animal.

انسان کی فطرت میں یہ بات آخری حد تک پیوست ہے کہ وہ کسی کو اپنا بڑا بنائے ۔ وہ اپنی ساری توجہ اس کے گرد مرتکز کر دے ۔ اس کی پوری شخصیت اس " بڑے " کے گرد گھومنے لگے ۔ اس کو پاکر وہ خوش ہو ، اس کو کھو کر وہ غمگین ہو جائے ۔ وہ اپنے معاملات میں اس پر اعتماد کرے ۔ وہ اسی کی یادوں اور تذکروں میں جینے لگے ۔

یہی کسی کو معبود بنانا ہے ۔ اور اس معنی میں آدمی کو صرف ایک اللہ کو اپنا معبود بنانا چاہئے ۔ اللہ کو معبود بنانا اپنے فطری جذبۂ عبودیت کو صحیح استعمال کرنا ہے ، اور اللہ کے سوا کسی اور معبود بنانا اپنے فطری جذبۂ عبودیت کو غلط جگہ استعمال کرنا ۔

اس اعتبار سے دیکھئے تو دنیا میں کوئی ایک شخص بھی نہیں جو عبادت گزاری سے خالی ہو ۔ کچھ لوگ مظاہر فطرت کا بت بنا کر ان کو پوجتے ہیں (ابراہیم ۳۵) کچھ لوگ اپنی محترم شخصیتوں کو معبود کا مقام دے دیتے ہیں (التوبہ ۳۱) کوئی آدمی خود اپنی ذات کو الٰہ اور رب کا درجہ دے دیتا ہے (الفرقان ۴۳) حتی کہ حدیث کے

مطابق ، ایک مرد اور ایک عورت باہمی تعلق سے ایک بچہ پیدا کرتے ہیں اور پھر اس بچہ ہی کو وہ درجہ دیدیتے ہیں جو رب کا درجہ ہونا چاہئے (ان تلد الامۃ ربتھا) اسی طرح ہر ایک کسی نہ کسی چیز کو اپنی زندگی میں بڑائی کا وہ مقام دئے ہوئے ہے جس کو معبود بنانا کہا گیا ہے۔

جولائی ۱۹۹۰ کے آخر میں میں نے سوویت روس کا سفر کیا تھا۔ وہاں میں ۲ اگست تک رہا۔ سوویت روس وہ ملک ہے جہاں ۱۹۱۷ میں کمیونسٹ انقلاب آیا۔ اس کے بعد وہاں خدا کے عقیدہ کا خاتمہ کر دیا گیا۔ تعلیمی نظام، اشاعتی ذرائع ، سماجی سرگرمیاں ، سب کی سب غیر خدائی بنیاد پر قائم کر دی گئیں۔

اس کا نتیجہ یہ ہونا چاہئے تھا کہ وہاں سے "خدا" کا مکمل خاتمہ ہو جاتا۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ عملی طور پر جو چیز پیش آئی وہ صرف یہ تھی کہ سوویت روس نے آسمانی خدا کو چھوڑ کر زمینی شخصیت کو اپنا خدا بنالیا۔ یہ زمینی شخصیت ان کا لیڈر لینن تھا۔ ماسکو میں لوگوں نے مجھے بتایا کہ یہاں اسٹالن ، خروشچوف ، برزنیف ، گورباچوف ، ہر ایک پر تنقید کی جاسکتی ہے۔ لوگ علی الاعلان ان پر یا دوسرے روسی لیڈروں پر تنقید کرتے ہیں۔ مگر یہاں لینن کی شخصیت ہر تنقید سے بلند سمجھی جاتی ہے۔ یہاں کا ہر آدمی لینن کو بالاتر ہستی کی طرح مقدس سمجھتا ہے۔

سوویت یونین میں لینن کو عظمت و تقدیس کا وہی درجہ دے دیا گیا ہے جو رب ذوالجلال کا ہونا چاہئے۔ لینن کا جسم مومیائی کر کے شیشہ کے کیس میں رکھا ہوا ہے اور مخصوص اوقات میں اہتمام کے ساتھ لوگوں کو اس کا مشاہدہ کرایا جاتا ہے۔ لینن کی زندگی سے تعلق رکھنے والی ایک ایک چیز کو خصوصی اہمیت کے ساتھ محفوظ رکھا گیا ہے۔

ماسکو میں کریملن کو دیکھتے ہوئے جب میں اس مقام پر پہنچا جہاں لینن کا مقبرہ (Mausoleum) ہے تو میں نے دیکھا کہ وہاں چاروں طرف تعظیم و تقدیس کا غیر معمولی ماحول قائم کیا گیا ہے۔ اسی میں سے ایک یہ ہے کہ مقبرہ کے وسیع گیٹ کے دونوں طرف آمنے سامنے دو مسلح فوجی جوان اس طرح کھڑے ہوئے تھے جیسے ادب و احترام کے غیر معمولی تاثر نے ان کو بے حس و حرکت بنادیا ہو۔

ابتداءً میں نے سمجھا کہ یہ شاید انسانی مورتیاں ہیں۔ مگر مجھے بتایا گیا کہ یہ دو زندہ فوجی ہیں ، وہ کامل احترام کے مظاہرہ کے طور پر پوری طرح غیر متحرک حالت میں کھڑے رہتے ہیں۔ یہ گویا ایک قسم کی فوجی نماز ہے جو لینن کے سامنے مستقل طور پر ادا کی جارہی ہے۔

چونکہ کوئی زندہ انسان زیادہ دیر تک اس طرح غیر متحرک حالت میں کھڑا نہیں رہ سکتا، اس لئے

ہرایک گھنٹہ پر ان کی ڈیوٹی بدلتی ہے۔ ایک گھنٹہ پورا ہوتے ہی دوسرے فوجی خاص انداز سے آتے ہیں۔ اب پہلے دو چلے جاتے ہیں اور دوسرے دو ان کی جگہ پر دوبارہ بے حس و حرکت کھڑے ہو جاتے ہیں۔ یہ سلسلہ رات اور دن جاری رہتا ہے اور اسی طرح سالہا سال سے جاری ہے۔

لینن کے مقبرہ کے پاس اس قسم کے تقدیسی مناظر کو دیکھ کر میں نے کہا کہ یہ غلط ہے کہ کیمونسٹ سماج نے خدا کو چھوڑ دیا۔ زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ کیمونسٹ سماج نے خالق کو چھوڑ کر ایک مخلوق کو اپنا معبود بنا لیا۔ ماسکو میں میں نے کئی لوگوں سے پوچھا کہ کیا آپ خدا میں عقیدہ رکھتے ہیں۔ ہر ایک نے کہا کہ نہیں۔ اس کے باوجود ہر ایک لینن کی عظمت کے احساس میں دبا ہوا تھا۔ کیمونسٹ سوسائٹی کا آدمی خدا کو رد کر سکتا تھا، مگر وہ اپنی فطرت کو رد نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ اس نے ایک خدا کو تو چھوڑا مگر وہ اپنے آپ کو دوسرے خدا کے آگے جھکانے سے باز نہ رکھ سکا۔

یہی وہ سب سے بڑی غلطی ہے جس میں ہر انسان مبتلا ہے۔ اب داعی کا کام یہ ہے کہ وہ انسان کو بتائے کہ تم وضع الشی فی غیر موضعہ کی غلطی کر رہے ہو۔ تم نے اپنے جذبۂ تقدیس اور احساس عبودیت کا مرکز غیر اللہ کو بنا رکھا ہے۔ تم کو چاہئے کہ تم ان جذبات کا مرکز ایک اللہ کو بناؤ۔ یہ تمہارے لئے وضع الشئ فی موضعہ کے ہم معنی ہوگا اور وہ تمہارے لئے ابدی کامیابی کا ضامن ہو جائے گا۔

صحیح استعمال، غلط استعمال

موجودہ دنیا میں انسان حالتِ امتحان میں ہے۔ یہ امتحان کس چیز میں ہے۔ وہ استعمالِ فطرت کے معاملہ میں ہے۔ انسان کے اندر پیدائشی طور پر کچھ مانگیں یا کچھ تقاضے رکھے گئے ہیں۔ اب اللہ یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ ہم ان مانگوں اور ان تقاضوں کو صحیح رخ پر استعمال کرتے ہیں یا غلط رخ پر۔ مدت امتحان پوری ہونے کے بعد آدمی جب اگلی دنیا میں داخل ہوگا تو اسی صحیح یا غلط استعمال پر اس کے ابدی مستقبل کا فیصلہ کیا جائے گا۔

انسان کے اندر فطری طور پر یہ طلب موجود ہے کہ وہ کسی کو اپنا بڑا مانے اور اس کے آگے غیر مشروط طور پر اپنے آپ کو جھکا دے۔ اس طلب کا صحیح استعمال یہ ہے کہ وہ ایک اللہ کو بڑا مانے اور صرف اسی کے سامنے جھکے۔ اس طلب کا غلط استعمال یہ ہے کہ وہ اللہ کے سوا دوسری چیزوں کو بڑائی کا درجہ دے اور ان کے سامنے جھکنے لگے۔

انسان کے اندر فطری طور پر پانی، خوراک اور جنسی تعلق وغیرہ کی طلب موجود ہے۔ ان میں سے ہر طلب کو پورا کرنے کا ایک صحیح انداز ہے اور ایک غلط انداز۔ آدمی کو یہ کرنا ہے کہ وہ ان فطری مانگوں کو پورا کرنے کے لئے صرف صحیح انداز پر قائم رہے۔ وہ اپنی فطری مانگوں کو پورا کرنے کے لئے غلط انداز اختیار نہ کرے۔

انسان کی ایک لازمی ضرورت کسب معاش ہے۔ اس کو اپنی ضروریاتِ دنیا کے لئے کمانا ہے۔ اس کسب کے کچھ طریقے حلال ہیں اور کچھ طریقے حرام۔ انسان سے یہ مطلوب ہے کہ وہ صرف حلال طریقوں سے کمائے، وہ حرام طریقوں سے کمانے کی کوشش نہ کرے۔

انسان جب دنیا میں زندگی گزارنا چاہتا ہے تو بار بار دوسروں سے اس کا سابقہ پڑتا ہے۔ ان سابقوں میں ایک صدق اور انصاف اور امانت کا طریقہ ہے، اور دوسرا جھوٹ اور بے انصافی اور خیانت کا طریقہ۔ یہاں آدمی کو چاہئے کہ وہ صدق اور امانت والا اخلاق اختیار کرے، وہ جھوٹ اور بے انصافی اور خیانت والے اخلاق سے پرہیز کرے۔

انسان کے اندر فطری طور پر کچھ جذبات موجود ہیں۔ مثلاً غصہ، انانیت، خود پسندی اور ذاتی بڑائی یہاں آدمی کا امتحان یہ ہے کہ وہ اپنے ان جذبات کو ایک حد کے اندر رکھے، انھیں مقرر کی ہوئی حد سے باہر جانے نہ دے۔

اسی طرح زندگی کے ہر معاملہ میں ایک طریقہ معیار کے مطابق ہے اور دوسرا طریقہ معیار کے خلاف۔ اللہ تعالیٰ نے ان معیاروں کو وحی کے ذریعہ بتا دیا ہے۔ اب ہمیں یہ کرنا ہے کہ خود اپنے آپ کو اس معیار پر ڈھالیں، اور دوسروں کو بھی اسی معیار کے مطابق زندگی گزارنے کی تلقین کریں ـــــ اسی تلقین کا نام دعوت ہے۔

مسلمانوں کا مقام

مسلمان ختم نبوت کے بعد مقام نبوت پر ہیں۔ ان کی لازمی ذمہ داری تھی کہ وہ غیر مسلم اقوام کے اوپر اپنی دعوتی ذمہ داریوں کو ادا کریں۔ مگر وہ اس ذمہ داری کی ادائیگی میں مکمل طور پر ناکام رہے۔ یہ کوئی اتفاقی کوتاہی نہیں۔ اس کا سبب مسلمانوں کا وہ بگڑا ہوا تصور اسلام ہے جو آج تمام دنیا کے مسلمانوں کے ذہنوں پر چھایا ہوا ہے۔

اس کی وضاحت کے لئے میں ایک مثال دوں گا۔ دہلی کے ایک کانفرنس ہال میں ایک مسلم رہنما کی تقریر

ہوئی۔ تقریر کا موضوع تھا ـــــــ "دورجدید میں دعوت اسلام" ایک گھنٹہ کی تقریر کے بعد سوال وجواب کا سلسلہ شروع ہوا۔ ایک شخص نے سوال کیا کہ ہندستان جیسے ملک میں دعوت اسلامی کا کام کرنے کا طریقہ کیا ہونا چاہئے۔ انھوں نے جواب دیتے ہوئے کہا: ہندستان میں مسلمان کمزور اقلیت کی صورت میں ہیں۔ یہ ایک بڑا مسئلہ ہے کیوں کہ اسلام میں طاقت ور حیثیت (position of strength) کا ماڈل تو موجود ہے، مگر اسلام میں بے طاقت حیثیت (position of modesty) کا ماڈل موجود نہیں۔

یہ جواب بتاتا ہے کہ مقرر کے سامنے اسلام کی صرف سیاسی تاریخ ہے۔ اس کے سامنے اسلام کی دعوتی تاریخ نہیں۔ ان کی نظر بعد کو بننے والی اسلامی تاریخ میں اٹکی ہوئی ہے وہ اس سے آگے مکی تاریخ کو نہ دیکھ سکے۔ جو نہ صرف ان کے الفاظ میں (position of modesty) کا بہترین ماڈل ہے بلکہ وہی اصل بنیاد ہے جس کے اوپر اسلام کی بعد کی تاریخ بنی۔

یہ واقعہ بتاتا ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی وہ فکری غلطی کیا ہے جس نے انھیں دعوت کے کام سے بے رغبت بنا رکھا ہے۔ یہ سب کے سب لوگ اسلام کے تاریخی مظاہر میں اٹکے ہوئے ہیں، وہ اسلام کی فکری اور اعتقادی قوت کو دریافت نہ کرسکے۔

موجودہ زمانہ کے مسلم رہنما اسلام کی سیاسی تاریخ سے متاثر ہو کر اٹھے۔ وہ اسلام کے بتائے ہوئے مسئلہ آخرت سے متاثر ہو کر نہیں اٹھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے سارے جذبات اس رخ پر چل پڑے کہ وہ اسلام کو سیاسی حیثیت سے غالب کرسکیں۔ ان کے جذبات اس رخ پر متحرک نہیں ہوئے کہ وہ اقوام عالم کو اس سب سے زیادہ سنگین مسئلہ سے آگاہ کریں جس کو قرآن میں "النبأ العظیم" کہا گیا ہے۔

یہ لوگ اپنے مخصوص مزاج کے تحت، اسلام کو سیاسی غلبہ کی تحریک سمجھتے ہیں۔ اور یہی ان کی بنیادی غلطی ہے۔ اسلام لوگوں کو حقیقت آخرت سے آگاہ کرنے کی دعوت ہے اور یہی اس کا اصل پہلو ہے۔ بقیہ تمام چیزیں اس کے مقابلہ میں ذیلی یا اضافی حیثیت رکھتی ہیں۔

دو قسم کی تحریکیں

تحریکیں دو قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک مبنی بر شخصیت (personality-based) تحریک۔ اور دوسری مبنی بر نظام (system-based) تحریک۔ اول الذکر کا نشانہ فرد کی شخصیت اور کردار کو بدلنا ہوتا ہے۔ ثانی الذکر کا نشانہ نظام یا سماجی ڈھانچہ کو توڑ کر دوسرا انتظامی ڈھانچہ بنانا۔ اسلام اول الذکر قسم کی تحریک

ہے۔ اس کے مقابلہ میں مثال کے طور پر، کمیونزم کی تحریک ڈھانچہ کو بدلنے کی تحریک۔

اسلام کی پوری تحریک انسانی شخصیت کو نشانہ بنا کر چلائی جاتی ہے۔ کیوں کہ دنیا اور آخرت دونوں کی تمام کامیابیوں کا انحصار اسی انسانی شخصیت کو بدلنے یا نہ بدلنے پر ہوتا ہے۔ قرآن کی آیت (ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتی یغیروا ما بانفسہم) میں اس معاملہ کے دنیوی پہلو کا ذکر ہے۔ یعنی اس دنیا میں کسی انسانی گروہ کی افرادی حالت (ما بانفس) کی تبدیلی کی بنیاد پر اس گروہ کی اجتماعی حالت (ما بقوم) کی تبدیلی کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔

آخرت میں بھی کسی شخص کی ذاتی حالت کی بنیاد پر اس کے انجام کا فیصلہ ہوگا۔ چنانچہ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ آخرت میں وہ شخص کامیاب ہوگا جس نے اپنے نفس کو پاک کیا، اور وہ شخص ناکام ہو کر رہ جائے گا جس نے اپنے نفس کو گندا کیا (قد افلح من زکّٰھا وقد خاب من دسّٰھا)

اسلامی سیاست کے لئے اٹھنے والے یہ لوگ اپنے آپ کو داعی کہتے ہیں۔ اور اپنے کام کو دعوت کا عنوان دیتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ان کا موجودہ کام دعوت کا قاتل ہے نہ کہ اصل دعوتی کام۔

جو لوگ سیاسی اقتدار کے لئے اٹھیں وہ فوراً فریق ثانی کے لئے حریف بن جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سیاسی تحریک ہمیشہ جھگڑا اور ٹکراؤ پیدا کرنے کا سبب بنتی ہے۔ اور جھگڑا اور ٹکراؤ کی فضا جہاں پیدا ہو جائے وہاں دعوت کا کام انجام نہیں دیا جا سکتا۔

یہی واقعہ موجودہ زمانے میں بہت بڑے پیمانے پر پیش آیا۔ اسلام کو سیاسی قوت بنانے کی کوشش نے یہ صورت حال پیدا کر دی ہے کہ دوسری قومیں اسلام کو "خطرہ" کے روپ میں دیکھنے لگی ہیں۔ مزید یہ کہ اسلام پسندوں کا یہ نظریہ کہ وہ زور اور قوت کے ذریعہ اسلام کو ساری دنیا میں نافذ کریں گے، اس نے اہل عالم کی نظر میں اسلام کو تخریب کاری کے ایک نظریہ کی حیثیت دے دی ہے۔

یورپ کے ایک سفر میں ایک مسلمان نے مجھے بتایا کہ اس کی ملاقات یونیورسٹی کے ایک پروفیسر سے ہوئی۔ دونوں کے درمیان جو گفتگو ہوئی اس کا ایک حصہ یہ تھا:

Are you a Muslim?
Yes.
Then you are a terrorist.

پروفیسر کا یہ ریمارک نہ مزاح ہے اور نہ انتہا پسندی۔ وہ موجودہ صورت حال کا ایک سادہ سا اظہار

ہے۔ موجودہ زمانہ کے اسلام پسندوں نے اپنے سیاسی خیالات اور انقلابی طریق کار کے ذریعہ جس اسلام کا مظاہرہ کیا ہے اس کے بعد یہی ممکن ہے کہ لوگ اسلام کو تخریب کاری اور دہشتنا کی کا ایک نظریہ سمجھیں۔ اس کے سوا کوئی اور چیز ممکن نہیں۔

اسلام کی تصویر

لندن کے انگریزی ہفت روزہ آبزرور (Observer) میں برطانوی صحافی مسٹر ہیملٹن (Adrian Hamilton) کا ایک مضمون چھپا ہے۔ اس میں انھوں نے لکھا ہے کہ مغربی دنیا میں آجکل کچھ دانشور یہ کہہ رہے ہیں کہ اب ہمارے لئے سب سے بڑا خطرہ اسلام ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ترک دوبارہ وائنا کے دروازہ پر ہیں۔ کمیونزم ہوسکتا ہے کہ مرگیا ہو۔ مگر آج ہمیں سب سے زیادہ جس چیز سے ڈرنے کی ضرورت ہے وہ دوبارہ ابھرتا ہوا اسلام ہے۔ سوویت یونین ایک غیر مذہبی حکومت کی حیثیت سے ایسا کرسکتی ہے کہ وہ جنگ کی خواہش نہ کرے۔ مگر بنیاد پرست مسلمانوں کو موت کا ڈر نہیں، اس لئے اگر وہ بم کو پالیں تو وہ اس قسم کی معقولیت کا مظاہرہ نہیں کریں گے:

> The Turks are at the gates of Vienna once more. Communism may be dead, but what we really need to fear is a resurgent Islam. The Soviet Union, as a non-theocratic state, could be relied on not to wish for war. Elsewhere, the fundamentalists have no fear of death and will therefore show no such rationale when they get the bomb.

مسٹر ہیملٹن نے اگرچہ اس کو مغربی دانشوروں کا جھوٹا ہوا کہہ کر رد کردیا ہے۔ تاہم خود ہمارے لئے یہ ایک بے حد قابل توجہ بات ہے۔

اسلام کو اللہ تعالیٰ نے اہل عالم کے لئے رحمت بنا کر بھیجا تھا۔ مگر موجودہ مسلمانوں کی بے معنی لڑائیوں نے اسلام کو اہل عالم کی نظر میں دین بربادی بنا دیا ہے۔ دنیا یہ سمجھتی ہے کہ مسلمان گویا دیوانوں کا ایک گروہ ہے جو اپنے احمقانہ عقیدہ کے تحت سمجھتا ہے کہ لڑ کر مرجاؤ تو تم جنت میں جاؤ گے۔ اس لئے اگر اس کو کہیں سے ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم مل جائیں تو وہ ان کو لوگوں کے اوپر پھینک دے گا۔ خواہ اس کے نتیجے میں وہ خود بھی برباد ہو اور ساری دنیا میں بربادی پھیلانے کا ذریعہ بنے۔

مغربی دانشوروں کا یہ ریمارک سراسر درست ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں کچھ نام نہاد مفکرین نے اپنے خودساختہ نظریات کے تحت بہت سے مسلم نوجوانوں کے اندر یہی مجنونانہ ذہن پیدا کردیا ہے۔ اسلام

دین رحمت ہے مگر انقلابی اسلام کے ان علمبرداروں نے اس کو دین تخریب بنا دیا ہے۔ کیسے عجیب ہیں وہ لوگ جو اسلام کی تخریب میں مصروف ہیں اور سمجھتے ہیں کہ وہ اسلام کی تعمیر کے لئے جہاد کبیر کا کارنامہ انجام دے رہے ہیں۔

موجودہ زمانہ میں یہ واقعہ بہت بڑے پیمانہ پر پیش آیا ہے۔ موجودہ مسلمانوں نے ساری دنیا میں ہر قسم کی سرگرمیاں دکھائیں مگر وہ اس اصل کام میں مشغول نہ ہو سکے جس کو قرآن میں انذار آخرت کہا گیا ہے۔ یعنی اس حقیقت سے لوگوں کو آگاہ کرنا کہ موت کے بعد ہر آدمی کو خدا کی میزان میں کھڑا ہونا ہے، اس کے بعد اس کے لئے یا تو ابدی جنت ہے یا ابدی جہنم۔

مسلمانوں کی اس عظیم کوتاہی کا سبب کیا ہے۔ اس کا سبب موجودہ مسلمانوں کی زوال یافتہ نفسیات ہے۔ آدمی جس چیز سے خود ڈرے، اسی چیز سے وہ دوسروں کو بھی ڈرانے کے لئے متحرک ہوگا۔ موجودہ زمانہ کے مسلمان خود آخرت سے بے خوف ہو گئے تھے، ایسی حالت میں وہ دوسروں کو آخرت کا خوف دلانے کے لئے کیوں کر اٹھتے۔

قرآن کے مطابق، امتوں پر جب لمبی مدت گزر جاتی ہے تو ان کے اندر قساوت (الحدید ۱۶) پیدا ہو جاتی ہے۔ قساوت خشیت یا خشوع کا ضد ہے۔ ابو الدرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ امت پر ایک وقت آئے گا جب اس سے علم اٹھا لیا جائے گا۔ جبیر تابعی عبادۃ بن الصامت سے ملے اور کہا کہ آپ کے بھائی ابو الدرداء کہتے ہیں کہ علم اٹھا لیا جائے گا۔ عبادۃ بن الصامت رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ابو الدرداء نے سچ کہا۔ اور اگر تم چاہو تو میں تم کو بتاؤں کہ وہ کون سا علم ہے جو سب سے پہلے اٹھا لیا جائے گا۔ اس کے بعد انھوں نے کہا کہ سب سے پہلے جو علم اٹھایا جائے گا وہ خشوع ہے۔ ہو سکتا ہے کہ تم کسی جامع مسجد میں داخل ہو اور وہاں تم ایک بھی خاشع انسان نہ دیکھ سکو (جامع الاصول ۳۶/۸)

منتخب امت

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: اے ایمان والو، رکوع اور سجدہ کرو۔ اور اپنے رب کی عبادت کرو۔ اور بھلائی کے کام کرو تاکہ تم کامیاب ہو۔ اور اللہ کی راہ میں کوشش کرو جیسا کہ کوشش کرنے کا حق ہے۔ اس نے تم کو چنا ہے۔ اور اس نے دین کے معاملہ میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی۔ تمہارے باپ ابراہیم کا دین۔ اسی نے تمہارا نام مسلم رکھا، اس سے پہلے اور اس قرآن میں بھی، تاکہ رسول تمہارے اوپر گواہ ہو اور تم لوگوں کے اوپر گواہ بنو۔ پس نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو، اور اللہ کو مضبوط پکڑو۔

وہی تمہارا مالک ہے۔ پس کیسا اچھا مالک ہے اور کیسا اچھا مددگار (الحج ۷۷۔ ۷۸)

قرآن کے ان الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان "امت مجتبیٰ" ہیں۔ ان کا یہ "اجتباء" کارِ شہادت (یا کارِ دعوت) کے لئے ہوا ہے۔ اسی شہادت علی الناس، کے کام میں انھیں "حق جہاد" ادا کرنا ہے۔ پھر یہ کوئی جنگ وقتال کا کام نہیں، یہ تمام تر روحانیت اور ربانیت کے زور پر انجام دیا جانے والا کام ہے۔ اور کسی داعی میں یہ اعلیٰ روحانی اوصاف عبادت اور اعتصام باللہ کے ذریعہ حاصل ہوتے ہیں۔

شہادت علی الناس ہی اہل اسلام کی اصل خدائی ڈیوٹی ہے۔ اسی کام کی انجام دہی کے اوپر ان کے مستقبل کا انحصار ہے۔ اگر وہ اس کام کو انجام دیں تو یہ کام ان کی فلاح کا ضامن ہوگا۔ اللہ تعالیٰ اس کے بعد ان کا ناصر اور مولیٰ بن جائے گا۔ اور اگر وہ اس کام کو انجام نہ دیں تو اس کے بعد اندیشہ ہے کہ ان کے ساتھ لاناصر لھم ولا مولیٰ لھم کا معاملہ کیا جائے۔

"دین میں کوئی تنگی نہیں" سے یہاں مراد "عمل شہادت" ہے۔ تمہارے لئے اس کام میں کوئی تنگی نہیں رکھی، اس کا مطلب یہ ہے کہ ظہور اسلام کے بعد اللہ تعالیٰ نے عالمی حالات میں ایسی تبدیلیاں پیدا کر دی ہیں کہ اب دعوت کا کام "یسر" کے حالات میں انجام دیا جائے گا، جب کہ اس سے پہلے وہ "عسر" کے حالات میں انجام دیا جاتا تھا۔

اس "یسر" کے بے شمار پہلو ہیں۔ اس کا ایک پہلو وسائلِ اعلام سے متعلق ہے۔ جدید وسائل اعلام نے اس بات کو ممکن بنا دیا ہے کہ اسلام کی دعوت کو سارے عالم میں پہنچایا جاسکے۔ اس سے پہلے بادشاہ کے سوا کسی کو اظہار خیال کی آزادی حاصل نہ ہوتی تھی۔ آج ہر آدمی کو اظہار خیال کی مکمل آزادی ہے۔ اس انقلاب نے آج مذہب کی تبلیغ کو ایک ایسا کام بنا دیا ہے جس کو ہر آدمی بہ آسانی انجام دے سکے۔

جدید تحقیقات نے ایک طرف تمام دوسرے مذہبی نظریات کو ناقابل اعتبار ثابت کر دیا، دوسری طرف اسلام ہر اعتبار سے ایک ثابت شدہ دین بن کر ابھر آیا۔ وغیرہ

موجودہ زمانے میں اس طرح کی بے شمار تبدیلیاں ہوئی ہیں جن کو ایک لفظ میں "عمل تیسیر" کہا جاسکتا ہے۔ خدا کا کام تیسیر ہے اور بندے کا کام تبلیغ۔ خدا نے اپنے حصہ کا "نصف اول" کام پوری طرح انجام دے دیا اب اہل اسلام کو اپنے حصہ کا "نصف ثانی" کام انجام دینا ہے۔ اگر وہ اس کام کی بجا آوری کے لئے اٹھیں تو یقیناً ان کے حق میں قرآن کے یہ الفاظ پورے ہوں گے: ولینصرن اللہ من ینصرہ ان اللہ قوی عزیز۔

انصارِ اسلام

آج اسلام کو دوبارہ ایک گروہِ انصار کی ضرورت ہے۔ دورِ اول میں "انصار" نے اسلام کے اظہار میں بنیادی کردار ادا کیا تھا، آج بھی اسلام کا اظہار اسی وقت ممکن ہے جب کہ انصار کا ایک گروہ اس کی حمایت پر کھڑا ہو جائے۔

انصار کون لوگ تھے۔ یہ وہ نادر انسان تھے جنھوں نے صداقت کو اس کے مجرد روپ میں دیکھا اور اس کے آگے جھک گئے۔ ہجرت سے پہلے مدینہ میں جب اسلام کی دعوت داخل ہوئی تو وہ صرف ایک لفظی صداقت کی حیثیت رکھتی تھی۔ اس وقت اسلام کے پاس در و دیوار کی صورت میں اُس قسم کا کوئی ایک "مرکز" بھی نہ تھا جیسے مرکز آج ساری دنیا میں لاکھوں کی تعداد میں اسلام کے نام پر قائم ہیں۔ اس کے باوجود انھوں نے اسلام کی معنوی عظمت کو پہچانا اور اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دیا۔

اس نادر صفت کا شرعی نام ایمان ہے اور نفسیات کی زبان میں اس کو اعتراف کہا جاتا ہے۔ جن لوگوں کے اندر یہ اعلیٰ صفت ہو، انھیں سے اعلیٰ کردار کا ظہور ہوتا ہے اور وہی لوگ اس دنیا میں کوئی تاریخ ساز عمل انجام دیتے ہیں۔

آج اسلام کو اسی قسم کے انصار کا ایک گروہ درکار ہے۔ اسلام آج دوبارہ اجنبی ہو گیا ہے۔ اگرچہ اسلام کے نام پر عظمت کے بے شمار مینار کھڑے ہوئے ہیں۔ مگر حقیقی اسلام دوبارہ ظاہری عظمتوں سے خالی ہے۔ اس کو آج اس کی معنوی سطح پر ہی پہچانا جا سکتا ہے۔

یہ ایک انتہائی نازک امتحان ہے جس کو قرآن میں "قبل الفتح ایمان" کہا گیا ہے۔ جو لوگ اس نازک امتحان میں پورے اتریں، وہی دورِ جدید میں "انصار اسلام" کا کردار ادا کریں گے، وہی دوبارہ اسلام کی وہ تاریخ بنائیں گے جس کا آج زمین و آسمان کو سب سے زیادہ انتظار ہے۔

اسلام کا سیلاب

چھٹی صدی عیسوی کے آخر میں جب اسلام کا ظہور ہوا، اس وقت دنیا کی سب سے بڑی سلطنت عیسائیوں کی سلطنت تھی۔ اس سلطنت کے دو بڑے حصے تھے۔ ایک مغربی حصہ اور دوسرا مشرقی حصہ۔ مغربی حصہ (یورپ) کو رومن امپائر کہا جاتا تھا اور اس کا پایہ تخت روم (اٹلی) تھا۔ مشرقی حصہ (ایشیا اور افریقہ) کو بازنطینی امپائر کہا جاتا تھا اور اس کا پایہ تخت قسطنطنیہ (ترکی) تھا۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری زمانہ میں شام کی سرحد پر رومیوں سے مسلمانوں کا فوجی ٹکراؤ شروع ہوا۔ اس ٹکراؤ میں مسلمان کامیاب رہے۔ ایک صدی کے اندر اندر انھوں نے مسیحی سلطنت کے مشرقی حصہ کو تقریباً پورا کا پورا فتح کر لیا جس میں ان کے مقدس مذہبی مقامات (شام اور فلسطین) بھی شامل تھے۔

اس کے بعد مسلمانوں نے ایک طرف سسلی اور اسپین کی جانب سے پیش قدمی شروع کی اور بڑھتے بڑھتے فرانس کے اندر داخل ہو گئے۔ دوسری طرف وہ ترکی کی جانب سے مشرقی یورپ میں داخل ہوئے۔ اور آگے بڑھتے ہوئے ویانا (آسٹریا)، تک جا پہنچے۔ اس طرح انھوں نے مسیحی (رومی) سلطنت کے مشرقی بازو پر تقریباً پورا کا پورا قبضہ کر لیا۔ اور اسی کے ساتھ اس کے مغربی بازو کے بھی ایک حصہ کو کاٹ لیا۔

مشہور صلیبی لڑائیاں مغربی عیسائیوں کی طرف سے ان کی اسی شکست کا ردعمل تھیں۔ عیسائی دنیا ایک غیر قوم کے ہاتھ سے اپنی اس ذلت اور شکست کو برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ چنانچہ یورپ کی مسیحی سلطنتوں نے متحد ہو کر مسلم دنیا پر حملہ کر دیا۔

یہ صلیبی لڑائیاں (Crusades) وقفہ وقفہ سے تقریباً دو سو سال (۱۰۹۵-۱۲۷۱ء) تک جاری رہیں۔ اس درمیان میں عیسائیوں کو وقتی اور جزئی کامیابی حاصل ہوئی۔ مگر سلطان صلاح الدین ایوبی کی قیادت میں بالآخر مسلمانوں نے فتح پائی۔ اور مسیحیوں کو ان کی سابقہ دنیا سے باہر نکال دیا گیا۔ پیرس سائیکلو پیڈیا (Pears Cyclopaedia) نے اس سلسلے میں بہت بامعنی تبصرہ کیا ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں:

> Millions of lives and an enormous amount of treasure were sacrificed in these enterprises, and when all was done Jeruselem remained in the possession of the 'infidels'.

لاکھوں جانیں اور بے شمار دولت ان مہموں میں قربان کردی گئی۔ اور جب سب کچھ ہوچکا تو یروشلم بدستور "بددینوں" کے قبضہ میں پڑا ہوا تھا۔

یہ واقعہ جو آٹھ سو سال پہلے عیسائیوں کے ساتھ پیش آیا تھا، ٹھیک یہی واقعہ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے ساتھ پیش آیا ہے۔ موجودہ زمانہ میں دوبارہ مسلمانوں کی "دو سو سالہ" قربانیوں کے باوجود "یروشلم" انھیں لوگوں کے قبضہ میں ہے جن کو مسلمان سب سے زیادہ غیر مستحق سمجھتے ہیں۔

مسیحی قومیں صلیبی جنگوں میں تو کامیاب نہیں ہوئی تھیں۔ مگر موجودہ زمانہ کی استعماری جنگ میں انھوں نے پوری کامیابی حاصل کی ہے۔ پچھلی صدیوں میں انھوں نے مسلمانوں کی تمام سلطنتوں کو مغلوب کرلیا اور پھر ساری دنیا میں ان کے اوپر براہ راست یا بالواسطہ طور پر سیاسی اور تہذیبی غلبہ قائم کرلیا۔ اس کے جواب میں مسلمانوں نے پورے عالم اسلام میں مغربی قوموں کے خلاف لڑائی چھیڑ دی۔ تاہم دو سو سال (تیرھویں اور چودھویں صدی ہجری) کی لڑائیوں اور مقابلوں کے بعد بھی صورت حال یہ ہے کہ مسیحی اقوام کا غلبہ بدستور قائم ہے۔ "یروشلم" اب بھی دشمنان اسلام کے قبضہ میں ہے۔

بے پناہ کوششوں کے باوجود اس ناکامی کی وجہ دعوت الی اللہ کے کام کو چھوڑنا ہے جو امت مسلمہ کا اصل منصبی فریضہ ہے۔ یہی وہ فریضہ ہے جس کی ادائیگی پر مسلمان نصرت خداوندی کے مستحق ہوتے ہیں۔ مسلمان جب تک دعوت الی اللہ کے کام کے لئے نہ کھڑے ہوں گے ان کی تمام کوششیں حبط اعمال کا شکار ہوتی رہیں گی۔ ان کا وہی حال ہوگا جو بائبل میں بنی اسرائیل کے لئے بیان کیا گیا تھا:

زرعتم کثیراً ودخلتم قلیلاً۔ تاکلون ولیس الی الشبع۔ تشربون ولا تروون۔ تکتسون ولا تدفأون۔ والآخذ اجرۃً یاخذ اجرۃً لکیس منقوب (حجی، الاصحاح الاول)

تم اپنی روش پر غور کرو۔ تم نے بہت سا بویا، پر تھوڑا کاٹا۔ تم کھاتے ہو، پر آسودہ نہیں ہوتے۔ تم پیتے ہو، پر پیاس نہیں بجھتی۔ تم کپڑے پہنتے ہو، پر گرم نہیں ہوتے۔ اور مزدور اپنی مزدوری سوراخ دار تھیلی میں جمع کرتا ہے۔ رب الافواج یوں فرماتا ہے کہ تم اپنی روش پر غور کرو (حجی، باب اول)

یہ مسلم رہنماؤں کی کوتاہ نظری تھی کہ وہ کھوئے ہوئے کے غم میں پڑے رہے۔ اور ملے ہوئے

مواقع کو استعمال کرنے کے لیے نہ خود اٹھے اور نہ قوم کو اس کے لیے بیدار کیا۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بار بار ایسی نشانیاں ظاہر ہو رہی تھیں جو یہ بتا رہی تھیں کہ کرنے کا اصل کام کیا ہے۔

امریکہ میں ایک ٹی وی تنظیم ہے جس کا نام اے بی سی ہے۔ وہ ہر روز شام کو "ورلڈ نیوز ٹونائٹ" کے عنوان کے تحت اس دن کی اہم عالمی خبریں نشر کرتی ہے۔ ۱۶ فروری ۱۹۸۹ کو اس نے ٹیلی وژن دیکھنے والوں کو جو خبریں بتائیں، ان میں سے ایک اہم خبر یہ تھی کہ ریسرچ کرنے والوں کی ایک ٹیم نے رپورٹ دی ہے کہ اسلام دنیا کا سب سے زیادہ تیز رفتار مذہب ہے۔ ان کے جائزہ کے مطابق ۲۰۲۵ تک دنیا کی آبادی میں ہر چار آدمی میں سے ایک آدمی مسلمان ہوگا۔ پچھلے سال عیسائی تنظیموں کی دو رپورٹوں میں بھی یہی بات کہی گئی تھی کہ اسلام کرۂ ارض پر سب سے زیادہ تیزی کے ساتھ پھیلنے والا مذہب ہے۔

امریکہ (پلین فیلڈ) سے ایک انگریزی ماہنامہ شائع ہوتا ہے جس کا نام اسلامک ہورائزن (Islamic Horizons) ہے۔ اس نے اپنے شمارہ مارچ ۔ اپریل ۱۹۸۹ میں اس رپورٹ کا خلاصہ شائع کیا ہے۔ وہ اس کے الفاظ میں یہ ہے:

> ABC's "World News Tonight" reported in its February 16, 1989 newscast that a new reliable study showed that Islam is the fastest growing religion in the world. According to researchers, one out of every four people in the world will be Muslim by the year 2025, about one generation from now. At least two reports from Christian organisations last year marked Islam as not only the fastest blooming religion on the planet but in the United States, as well (p.21).

نیویارک میں دسمبر ۱۹۸۸ میں "مسلم ورلڈ ڈے" کے نام سے ایک اجتماع ہوا۔ اس اجتماع کی کارروائیاں نیویارک کے پنٹا ہوٹل (Penta Hotel) میں انجام پائیں۔ اس موقع پر امریکہ کی کئی مشہور شخصیتیں بھی شریک ہوئیں۔ ان میں سے ایک امریکہ کے ممتاز بیرسٹر ولیم کنسٹلر (William Kunstler) بھی تھے۔

ولیم کنسٹلر کی تقریر نیویارک کے انگریزی ہفت روزہ دی مینارٹ (The Minaret) میں شائع ہوئی ہے۔ اس میں موصوف نے اسلام کی غیر معمولی خوبیوں کا اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ کچھ دنوں بعد اسلام دنیا کا سب سے بڑا مذہب ہوگا۔ کل وہ دنیا کی آبادی کا چالیس فی صد حصہ ہو جائے گا اور اگلے پچاس برسوں میں وہ دنیا کی آبادی کا ساٹھ فی صد حصہ ہوگا:

Someday it will be the major religion of the world. Two-fifth tomorrow and three-fifth in the next 50 years.

۱۰ استمبر ۱۹۸۹ کو ڈاکٹر محمد طاہر صاحب (حیدر آباد) سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے لائبریری سائنس میں ماسٹر ڈگری لی ہے۔ اور انگریزی زبان میں چھپنے والی کتابوں اور مقالات پر ریسرچ کیا ہے۔ ان کے ریسرچ کا عنوان تھا:

English language material on Islamic studies.

انھوں نے ۱۹۱۰ سے لے کر اب تک انگریزی کی اسلامی مطبوعات کا جائزہ لیا۔ اس سلسلہ میں انھوں نے ۸۰ ہزار چھپی ہوئی چیزوں (references) کے اعداد و شمار جمع کئے۔ انھوں نے پایا کہ اسلام پر انگریزی کتابیں اور مقالے موجودہ زمانہ میں اتنے زیادہ چھپے ہیں کہ ان کو ایک عظیم انفجار (tremendous explosion) سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ اس زمانہ میں انگریزی اسلامی کتابوں کے اضافہ کی شرح یہ رہی ہے:

۱۹۸۰ ـــــ ۱۹۵۱	۱۹۵۰ ـــــ ۱۹۱۰
۷۵ فی صد	۲۵ فی صد

گویا بیسویں صدی کے نصف اول میں اضافہ ۲۵ فی صد تھا، جب کہ اس صدی کے نصف ثانی میں یہ اضافہ ۷۵ فیصد تک پہنچ گیا۔ یہ واقعہ بے حد سبق آموز ہے۔

اسلام کی اس تیز رفتار ترقی کا راز کیا ہے۔ اس کا راز یہ ہے کہ اسلام خدا کا آخری دین ہے۔ اس کو اللہ تعالیٰ نے اس طرح کامل اور مستحکم کر دیا ہے کہ کوئی اس کو کسی قسم کا نقصان نہ پہنچا سکے۔ وہ بڑھتا ہی رہے، یہاں تک کہ وہ وقت آجائے جس کی پیشین گوئی حدیث میں ان الفاظ میں کی گئی ہے کہ زمین کی سطح پر کوئی پکا یا کچا گھر نہیں بچے گا جس میں اسلام کا کلمہ داخل نہ ہو گیا ہو (لا یبقی علی ظهر الارض بیت مدر ولا وبر الا ادخله الله کلمة الاسلام)

انیسویں صدی کے نصف آخر اور بیسویں صدی کے نصف اول میں مسلمانوں کے تمام معروف لیڈر انگریزوں اور فرانسیسیوں سے لفظی یا عملی لڑائی لڑنے میں مشغول تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اس مغربی استعمار کو اگر ختم نہ کیا گیا تو وہ اسلام کو مٹا ڈالے گا۔ اس لئے سب سے پہلا کام اس سے لڑ کر مسلم دنیا پر اس

کے غلبہ کو ختم کرنا ہے۔ مسلم رہنماؤں کی لڑائی کا تو یک طرفہ جانی و مالی نقصان کے سوا کوئی اور نتیجہ نہیں نکلا۔ البتہ دوسری عالمی جنگ نے ان مغربی قوموں کو اتنا کمزور کر دیا کہ وہ ایشیا اور افریقہ سے اپنی فوجوں کو واپس بلالیں۔

اب مسلم ممالک مغرب کے سیاسی غلبہ سے آزاد ہو گئے۔ اس کے بعد ان ملکوں میں مقامی حکومتیں قائم ہو گئیں۔ ان حکومتوں کے تمام ذمہ دارانہ مناصب پر وہ مسلمان قابض تھے جنھوں نے مغربی ملکوں میں تعلیم پائی تھی اور مغربی کلچر کو اپنا رکھا تھا۔ اب دوبارہ مسلم رہنما خود اپنے حکمرانوں سے لڑ گئے۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ "مغرب زدہ" مسلمان ہمارے لئے سابق مغربی حکمراں سے بھی زیادہ برے ہیں۔ ضروری ہے کہ سب سے پہلے ان کو اقتدار کی کرسیوں سے ہٹایا جائے۔ ورنہ یہ لوگ اسلام کا خاتمہ کر دیں گے اور آئندہ اسلام کے لئے کام کرنے کے مواقع باقی نہیں رہیں گے۔ یہ ناکام جنگ تادم تحریر کسی نہ کسی شکل میں جاری ہے۔ مگر کسی بھی ملک میں وہ تبدیلئ اقتدار کے مرحلہ تک نہیں پہنچی۔

اسلامی رہنماؤں کی اس سیاسی ناکامی کے باوجود اسلام کا نظریاتی قافلہ مسلسل آگے بڑھ رہا ہے بلکہ وہ ہمیشہ سے زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ پیش قدمی کر رہا ہے۔

واقعات بتاتے ہیں کہ بیسویں صدی کے نصف ثانی میں ہمیشہ سے زیادہ اسلامی لٹریچر شائع ہوا ہے۔ ہمیشہ سے زیادہ اسلامی ادارے ساری دنیا میں قائم ہوئے ہیں۔ ہمیشہ سے زیادہ تعداد میں لوگ اسلام قبول کر کے اسلام کے حلقہ میں شامل ہو رہے ہیں۔ وغیرہ

اس قسم کے بے شمار واقعات بتاتے ہیں کہ سیاسی حالات خواہ کچھ ہوں، اسلام کا سفر مسلسل جاری رہتا ہے۔ اسلام کو اللہ تعالیٰ نے ایسی طاقت دے دی ہے جو کسی بھی خارجی سبب سے ختم ہونے والی نہیں۔ مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ خارجی حالات کی مساعدت یا نامساعدت سے بے پروا ہو کر اسلامی دعوت کے میدان میں سرگرم رہیں، وہ سیاسی دفاع کے بجائے ہمیشہ نظریاتی اقدام کے میدان میں اپنا جہاد جاری رکھیں۔

میسور کے سلطان ٹیپو انگریزوں سے لڑتے ہوئے ۱۷۹۹ء میں شہید ہو گئے۔ اقبال کے نزدیک یہ اتنا بڑا سانحہ تھا کہ انھوں نے لکھا کہ ٹیپو ہماری ترکش کا آخری تیر تھا جو اب ہمارے پاس نہیں رہا:

ترکش مارا خدنگ آخرین

بیسویں صدی کے آغاز میں ترکی کی عثمانی خلافت ٹوٹنے لگی تو تمام مسلمان گھبرا اٹھے۔ اس زمانہ کے مسلمانوں کے جذبات کی ترجمانی شبلی نعمانی کے اس شعر میں ملتی ہے:

زوال دولتِ عثماں زوالِ شرع وملت ہے   عزیزو فکر فرزند و عیال وخانماں کب تک

مگر یہ مسلمانوں کے لکھنے اور بولنے والوں کی کوتاہی تھی۔ انھوں نے اپنی کوتاہ فکری کی بنا پر اسلام کی طاقت کا کمتر اندازہ کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام کو کسی سلطان یا کسی سلطنت کی ضرورت نہیں۔ وہ خود اپنی طاقت سے زندہ رہتا ہے اور ترقی کرتا ہے۔ کسی کی موت یا کسی حکومت کا زوال اس کا راستہ روکنے والا نہیں۔

راہ نجات

۱۷ مارچ ۱۹۹۰ کو میں دہلی سے ایک بیرونی سفر پر روانہ ہوا۔ اردن ایئرلائنز پر سفر کرتے ہوئے اس کا انفلائٹ میگزین الاجنحۃ (مارچ ۱۹۹۰) پڑھنے کو ملا۔ اس کے صفحہ ۵۸ پر ایک عرب خاتون یما نبیل کا مضمون چھپا ہوا تھا۔

مذکورہ عرب خاتون اسپین (غرناطہ) گئیں۔ وہاں انھوں نے عرب دور کے آثار دیکھے۔ ان پُر عظمت آثار کو دیکھ کر وہ رو پڑیں۔ یہاں انھوں نے تاریخ النصر العربی کو بھی دیکھا اور تاریخ الذل العربی کو بھی۔ انھوں نے کہا کہ کبھی عرب کی عظمت یہاں تھی، اور یہیں سے پانچ سو سال پہلے عرب کی ذلت شروع ہوئی۔ وہ اپنے دل سے پوچھتی رہیں کہ عرب کی یہ رات کب تک باقی رہے گی (الیٰ متی سیستمر ھٰذا اللیل العربی)

سفر سے واپس آیا تو ڈاک میں دہلی کا سہ روزہ دعوت (۲۸ مارچ ۱۹۹۰) موجود تھا۔ اس کے پہلے صفحہ کے مضمون کی سرخی ان الفاظ میں چھپی ہوئی تھی: اسلامی دنیا آخر اتنی بے سہارا، بے وقعت اور بے وزن کیوں بن کر رہ گئی ہے۔

اس قسم کے مضامین آج مسلم دنیا کے کسی بھی پرچہ اور کسی بھی میگزین میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ اسی صورت حال سے متاثر ہو کر مشہور عرب ہفتہ وار الدعوۃ نے اپنے شمارہ ۱۲ ذی القعدہ ۱۴۰۵ھ (۲۹ جولائی ۱۹۸۵) میں ایک مضمون شائع کیا تھا۔ اس میں موجودہ حالات کا ذکر تھا۔ اس مضمون کا عنوان ان لفظوں میں قائم کیا گیا تھا: الیس للدین رب یحمیہ (کیا اس دین کا کوئی رب نہیں جو اس کی مدد کرے)

یہ ایک حقیقت ہے کہ آج کی دنیا میں مسلمان سب سے زیادہ پست اور حقیر اور مغلوب قوم بن گئے ہیں۔ ان کا یہ حال صرف ان ملکوں میں نہیں ہے جہاں وہ اقلیت کی حیثیت سے آباد ہیں۔ ان کا یہی حال ان ملکوں میں بھی ہو رہا ہے جہاں وہ اکثریت کی حیثیت رکھتے ہیں اور جہاں بظاہر ان کی آزاد حکومتیں قائم ہیں۔

یہاں بنیادی سوال یہ ہے کہ ان کی کس کمی کی بنا پر ان کا یہ حال ہو رہا ہے۔ گہرائی کے ساتھ دیکھئے تو آج مسلمانوں کے یہاں کسی چیز کی کمی نہیں۔ بظاہر ان کے پاس دین اور دنیا دونوں، ہمیشہ سے زیادہ

مقدار میں موجود ہیں ۔

آج دنیا میں مسلمانوں کے ۵۶ بااختیار ممالک ہیں۔ مسلمانوں کی تعداد ساری دنیا میں ایک ارب ہے۔ یہ تعداد ماضی کے کسی بھی دور کے مقابلہ میں سب سے زیادہ ہے۔ مسلمانوں کے درمیان آج ہمیشہ سے زیادہ مسجدیں اور مدرسے ہیں ۔ ۱۹۲۵ میں حج کا فریضہ ادا کرنے والوں کی تعداد ایک لاکھ سے بھی کم (90,622) تھی ۔ ۱۹۹۰ میں جن مسلمانوں نے حج ادا کیا ، ان کی تعداد پندرہ لاکھ (1,500,000) ہے۔ جب کہ اس سال ایرانی مسلمان حج کے لئے نہیں آئے تھے ۔

قرآن اور حدیث اور دوسری اسلامی کتابیں آج اتنی زیادہ مقدار میں ہیں کہ ماضی میں اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ خدا اور رسول کے نام پر آج جتنے جلسے اور سمینار اور کانفرنس ہو رہی ہیں ان کی تعداد ساری انسانی تاریخ میں ہونے والے تمام جلسوں کی مجموعی تعداد سے بھی زیادہ ہے۔ آج مسلمان ایسے اسلامی اجتماعات منعقد کر رہے ہیں جن میں ۲۵ لاکھ یا اس سے بھی زیادہ آدمی بیک وقت جمع ہوتے ہیں ، جب کہ رسول اللہ کے آخری اجتماع (حجۃ الوداع) میں جمع ہونے والے مسلمانوں کی کل تعداد بمشکل سوا لاکھ تھی۔ آج اسلامی نظام قائم کرنے کے نام پر اتنے ہنگامے جاری ہیں کہ اگر تمام انبیاء کی مجموعی آوازیں اکھٹا کی جائیں تو ان کی آوازیں اس کے مقابلہ میں دب کر رہ جائیں گی ۔ آج مسلمانوں نے اتنے بڑے بڑے اکابر پیدا کر رکھے ہیں جن میں سے کوئی "عہد آفریں شخصیت" کا حامل ہے اور کسی کے متعلق اس کے معتقدین یہ اعلان کر رہے ہیں کہ :

ہمارے حضرت والا کے فیض سے یارو　　تمام عالم اسلام جگمگا یا ہے

یہ تمام چیزیں مسلمانوں کے پاس وافر مقدار میں موجود ہیں۔ اس کے باوجود وہ ساری دنیا میں پست اور حقیر ہو رہے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ ان سب کے علاوہ کوئی اور چیز ہے جو مسلمانوں کو عزت اور غلبہ کے مقام تک پہنچاتی ہے ، اور وہی چیز آج ان کے پاس موجود نہیں ۔

اگر آپ اسلام کی مطلوبہ چیزوں کی فہرست بنا کر اس معاملہ پر غور کریں تو آپ اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ موجودہ مسلمانوں کے یہاں اگرچہ تمام چیزیں موجود ہیں ، مگر ایک چیز ان کے درمیان سے مکمل طور پر غائب ہے ، اور وہ دعوت ہے ۔ بدقسمتی سے جو چیز حذف ہوئی وہی اس معاملہ میں اصل اہمیت رکھتی تھی :

ہماں ورق کہ سیہ گشتہ مدعا ایں جا است

آج مسلمانوں کے درمیان ہر قسم کی سرگرمیاں جاری ہیں۔ مگر دعوت ہی ایک ایسا کام ہے جس کا ان کے یہاں سرے سے کوئی وجود نہیں۔ اس معاملہ میں ان کی دوری کا یہ حال ہے کہ وہ دوسرے دوسرے کام کرتے ہیں اور اس پر دعوت کا لیبل لگا دیتے ہیں۔ کوئی مسلمانوں کی اصلاح کے کام کو دعوت بتا رہا ہے کوئی اپنے قومی فخر کے اظہار کو دعوت کا نام دئے ہوئے ہے۔ کوئی دوسری قوموں سے قومی اور مادی جنگ لڑتا ہے اور اس کو دعوت کا عمل قرار دیتا ہے۔ کوئی شاعری اور خطابت کے مظاہرے کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ وہ دعوت کا کام انجام دے رہا ہے۔ وغیرہ

دعوت دراصل دعوت الی اللہ کا نام ہے۔ اس سے مراد وہ عمل ہے جس کو قرآن میں انذار وتبشیر کہا گیا ہے۔ یعنی اقوام عالم کو خدا کی مرضی سے آگاہ کرنا۔ انھیں آنے والے دن سے باخبر کرنا۔ انھیں خدا کے اُس منصوبہ کی اطلاع دینا جو خدا نے زندگی اور موت کے بارہ میں مقرر فرمایا ہے۔ ایک لفظ میں یہ کہ خدا کے بندوں کو جہنم کے راستہ سے ہٹا کر جنت کے راستہ پر لگانے کی کوشش کا نام دعوت ہے۔

دعوت کا یہ عمل ہمیشہ محبت کی زمین پر اگتا ہے۔ دعوت کا کام وہ لوگ انجام دیتے ہیں جو انسانوں کے انجام آخرت کو سوچ کر تڑپ اٹھے ہوں اور انھیں خدا کی پکڑ سے بچانے کے لئے دیوانہ وار نکل پڑیں۔ مدعو کو محبوب بنائے بغیر کبھی دعوت کا کام انجام نہیں دیا جا سکتا۔

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کو دوسری قوموں کی طرف سے ذلت اور ہزیمت کا تجربہ ہوا۔ اس تجربہ نے مسلمانوں کے دلوں میں دوسری قوموں کے لئے نفرت پیدا کر دی۔ وہ دوسری قوموں کو دشمن یا حریف کی نظر سے دیکھنے لگے۔ اس کے نتیجہ میں یہ ہوا کہ دوسری قومیں مسلمانوں کے لئے محبت کا موضوع نہ رہیں، وہ صرف نفرت کا موضوع بن کر رہ گئیں۔ یہی وہ اصل سبب ہے جس نے مسلمانوں سے داعیانہ جذبہ کو چھین لیا۔ اور ان کے درمیان دعوتی عمل کو زندہ ہونے نہیں دیا۔

دین رحمت کی پیغام رسانی کے لئے داعی کے اندر محبت وشفقت کا جذبہ ہونا لازمی طور پر ضروری ہے۔ کوئی شخص ایسے لوگوں کے اوپر دعوت کے فرائض انجام نہیں دے سکتا جو اس کی نظر میں مبغوض بنے ہوئے ہوں۔ مسلمانوں نے دوسری قوموں سے نفرت کر کے اپنے اندر داعیانہ صلاحیت کھو دی ہے۔ موجودہ حالت میں ان کا دعوت کا نام لینا صرف ایک مذاق ہے، وہ کسی سنجیدہ ارادہ کا اظہار نہیں۔

دعوت الی اللہ کی لازمی شرط صبر ہے۔ مسلمانوں کو داعی بننے کے لئے سب سے پہلے صابر بننا پڑے گا۔

دوسری قوموں سے خواہ انھیں کتنی زیادہ ناخوشگواری کا تجربہ ہو۔ دوسری قوموں کی طرف سے انھیں خواہ کتنا ہی زیادہ مادی نقصان پہنچایا جائے۔ دوسری قوموں کی جانب سے خواہ انھیں کتنا ہی زیادہ اشتعال انگیزی کا تجربہ ہو، ان سب کے باوجود انھیں دوسری قوموں کا خیر خواہ بنے رہنا ہے۔ انھیں یک طرفہ طور پر تمام ناخوش گوار باتوں کو صبر کے خانہ میں ڈال دینا ہے۔

یک طرفہ صبر دعوت کے عمل کو انجام دینے کی لازمی شرط ہے۔ اس یک طرفہ صبر کے بغیر مسلمانوں کے لئے ممکن نہیں کہ وہ دوسری قوموں پر اپنی دعوتی ذمہ داری کو ادا کرسکیں۔ اور جب تک مسلمان اپنی دعوتی ذمہ داری کو انجام نہ دیں، ان کے حالات کبھی بدلنے والے نہیں۔ کوئی دوسرا عمل خواہ کتنی ہی زیادہ بڑی مقدار میں کیا جائے، وہ ان کے احوال کو بدلنے کا ذریعہ نہیں بن سکتا۔

دعوت الی اللہ کی ذمہ داری اتنی سنگین ہے کہ اس میں معمولی کوتاہی بھی اللہ تعالیٰ کے یہاں ناقابل قبول ہے، کجا کہ اس کو مستقل طور پر ترک کر دیا جائے۔

یہ معاملہ سیدنا یونس علیہ السلام کی مثال سے بخوبی طور پر واضح ہے۔ حضرت یونس قدیم عراق (نینوا) میں دعوت توحید کے لئے بھیجے گئے۔ انھوں نے اہل نینوا کو دعوت دی۔ مگر ابھی دعوت کا عمل اپنی تکمیل (اتمام حجت) تک نہیں پہنچا تھا کہ وہ قوم کو چھوڑ کر باہر چلے گئے۔ اللہ تعالیٰ کو ان کی یہ روش پسند نہیں آئی۔ ان کو مچھلی کے پیٹ میں ڈال دیا گیا۔ قرآن کا بیان ہے کہ اگر وہ اپنی کوتاہی کا اقرار کرکے دوبارہ اپنی مخاطب قوم کی طرف جانے کے لئے تیار نہ ہوتے تو وہ قیامت تک مچھلی کے پیٹ میں پڑے رہتے (الصافات ۱۴۴)

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا معاملہ اس سے کہیں زیادہ سنگین ہے۔ انھوں نے اپنی مدعو اقوام پر دعوت کا عمل سرے سے انجام نہیں دیا۔ بلکہ اپنی نفرت بڑھانے والی سرگرمیوں کے ذریعہ اس کی راہ میں مزید رکاوٹیں کھڑی کر دیں۔ اس غفلت کے نتیجہ میں وہ خدا کی گرفت میں آگئے ہیں۔ وہ آج خدا کے عتاب کی زد میں ہیں۔ وہ تمام زیادتیاں جن کا تجربہ انھیں دوسری قوموں کی طرف سے ہو رہا ہے اور جس کو وہ دوسری قوموں سے منسوب کرکے ان کے خلاف احتجاج یا ٹکراؤ کر رہے ہیں، وہ سب یقینی طور پر خدا کی طرف سے ہیں۔ یہ خدا کی تنبیہہ ہے نہ کہ دوسری قوموں کا ظلم یا سازش۔

معاملہ کی اس نوعیت کو سمجھنا انتہائی ضروری ہے۔ کیوں کہ ایک معاملہ جو خدا کی طرف سے ہو، اس کو آپ انسان کی طرف سے سمجھ لیں تو آپ اس سے خلاصی کی تدبیر کو بھی صحیح طور پر سمجھ نہیں سکتے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ معاملہ اپنی آخری صورت میں عین وہی ہے جو اپنی ابتدائی صورت میں بلاتشبیہ حضرت یونس علیہ السلام کے ساتھ پیش آیا تھا۔ آج دنیا بھر کے مسلمان "مسائل کے پیٹ" میں ہیں۔ ان کو مسائل کی عظیم مچھلی نے نگل رکھا ہے۔ ان کو فالتقمہ الحوت کا تجربہ کرایا جا رہا ہے۔

مسلمان اس پیٹ سے ہرگز نکل نہیں سکتے جب تک وہ دعوت الی اللہ کے معاملہ میں اپنی کوتاہی کی تلافی نہ کریں۔ ان پر لازم ہے کہ وہ اس خدائی کام کے لئے اٹھیں اور اس کو اس کے تمام آداب و شرائط کے ساتھ انجام دیں۔ وہ اس وقت تک چین سے نہ بیٹھیں جب تک اقوام عالم پر خدا کی حجت پوری نہ ہو جائے۔

اگر مسلمانوں نے اپنی اس کوتاہی کی تلافی نہ کی تو وہ قیامت تک مسائل کے بطن (پیٹ) میں پڑے رہیں گے۔ کوئی دوسرا عمل، خواہ وہ بظاہر کتنا ہی اچھا ہو اور کتنی ہی زیادہ بڑی مقدار میں کیا جائے، انھیں اس گرفتاری سے نجات دینے والا نہیں۔ جب گرفتاری کے اس معاملہ کا سبب دعوتی کوتاہی ہے تو دوسرا عمل کیوں کر انھیں اس گرفتاری سے نکالنے والا بن سکتا ہے۔

دوڑنے والوں کو خدا کی طرف دوڑنا چاہئے۔ اگر وہ انسانوں کی طرف دوڑتے رہے تو وہ انسانوں کو بھی کھو دیں گے، اور خدا کو تو وہ پہلے ہی سے کھوئے ہوئے ہیں۔

اصل قابل لحاظ بات یہ نہیں کہ ہمارے نزدیک کس چیز کی اہمیت ہے۔ اصل قابل لحاظ بات یہ ہے کہ خدا کے نزدیک کس چیز کی اہمیت ہے۔ ہم بطور خود کسی چیز کو اہم سمجھ کر اس کی طرف دوڑنے لگیں تو اس سے ہماری نجات ہونے والی نہیں۔ ہماری نجات کا انحصار اس پر ہے کہ ہم اپنے ذاتی دائرہ سے اوپر اٹھیں اور بے آمیز ذہن کے تحت خدا کی مرضی کو معلوم کریں۔ اور پھر خدا کی جو مرضی ہے اس پر اپنی تمام کوششوں کو ڈال دیں۔ اس کے سوا کوئی بھی دوسرا طریقہ ہم کو کامیابی کی طرف نہیں لے جا سکتا۔

خدا کے نزدیک ان قومی مسائل کی کوئی اہمیت نہیں جن کو خود مسلم رہنماؤں نے اپنی نادانی سے پیدا کیا ہے اور اب انھیں کو سب سے اہم بتا کر ان میں الجھے ہوئے ہیں۔ خدا کے نزدیک سب سے زیادہ اہم مسئلہ یہ ہے کہ انسان کو نوعیت حیات سے باخبر کیا جائے۔ زندگی کے بارہ میں خدا کا جو منصوبہ ہے اس سے کوئی شخص غافل نہ رہے۔ تاکہ قیامت میں کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ ہم تو بے خبر تھے۔

پاکستان کی مثال لیجئے۔ اہلِ پاکستان نے دوسری قوم کے ظلم اور تعصب سے بچنے کے لیے علٰحدگی کی سیاست چلائی۔ مگر علٰحدگی کے بعد وہ اور بھی زیادہ ظلم اور تعصب میں پھنس کر رہ گئے۔

۱۹۴۷ میں پاکستان بنا تو پاکستان کے بانی مسٹر محمد علی جناح نے اس کو کٹا پھٹا پاکستان (Truncated Pakistan) قرار دیا۔ یہ کٹا پھٹا پاکستان بھی ۱۹۷۱ میں دو ٹکڑے ہوگیا۔ پاکستان کے لیڈروں کا کہنا تھا کہ جوناگڑھ، حیدرآباد اور کشمیر، یہ سب پاکستان کے حصے ہیں۔ مگر ان میں سے کسی ایک کو بھی وہ حاصل نہ کر سکے، حتی کہ باقاعدہ لڑائی کے بعد بھی نہیں۔

پاکستان کے قیام کو تقریباً پچاس سال ہو رہے ہیں، مگر آج تک وہاں کوئی متفقہ دستور نہیں بنا۔ کوئی مستحکم حکومت قائم نہ ہو سکی۔ اس دوران پاکستان کے کئی لیڈر قتل یا ہلاک ہو چکے ہیں۔ جب بھی ایسا کوئی واقعہ یا اس قسم کا کوئی حادثہ پیش آتا ہے تو پاکستان کے دانشور فوراً یہ کہہ دیتے ہیں کہ یہ روس یا امریکہ یا بھارت کی سازش کے نتیجہ میں پیش آیا۔ وہ بھول جاتے ہیں کہ ایسا کہہ کر وہ اعتراف کر رہے ہیں کہ پاکستان اگرچہ بن گیا، مگر اب بھی کوئی "مچھلی" اس کو نگلے ہوئے ہے۔ اور وہ پاکستان کو ابھرنے نہیں دیتی۔ یہ توجیہہ خود پاکستان کی منطق کو غلط ثابت کر رہی ہے۔ مسٹر محمد علی جناح نے کہا تھا کہ میں نے پاکستان کی صورت میں اسلام کا ایک قلعہ بنایا ہے۔ پھر وہ کیسا قلعہ ہے جہاں اسلام کو داخلی حفاظت بھی حاصل نہ ہو۔

یہ صورت حال بے حد غور طلب ہے۔ آخر کیا وجہ ہے کہ "قائد اعظم" کی سیاست، مولانا اشرف علی تھانوی کی دعائیں، مولانا شبیر احمد عثمانی اور مولانا ابو الاعلی مودودی کی رہنمائی، مرد مومن ضیاء الحق کا طویل اور مطلق اقتدار، اور اس طرح کی دوسری بہت سی مادی اور معنوی سعادتوں کو حاصل کرنے کے باوجود پاکستان تباہ حال ہے۔ اسلام کا مینار بننا تو درکنار، وہ اسلام کی زیر زمین بنیاد بھی نہ بن سکا۔

اس کا جواب، ایک لفظ میں یہ ہے کہ، پاکستان خدا کی سنّت کے خلاف بنا۔ اور جو چیز خدا کی سنّت کی خلاف ورزی کرکے بنائی جائے، وہ اس دنیا میں کبھی ترقی نہیں کر سکتی۔

پاکستان کے رہنما پاکستان کے قیام کو "ہجرت" سے تعبیر کرتے ہیں۔ ۱۹۴۷ سے پہلے جب پاکستان کی تحریک چل رہی تھی، پاکستانی مفکرین زور و شور کے ساتھ اس کے حق میں یہ قرآنی دلیل پیش کر رہے تھے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون سے مطالبہ کیا تھا کہ اَرۡسِلۡ مَعَنَا بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ

یعنی ہم کو اجازت دو کہ ہم بنی اسرائیل کو لے کر علیٰحدہ خطہ میں چلے جائیں۔ اسی طرح ہم بھی انگریزوں اور ہندوؤں سے پاکستان کا مطالبہ کر رہے ہیں۔

مگر یہ استدلال صرف ایک بے جا جسارت ہے۔ کیوں کہ ہجرت، دعوت کے بغیر جائز نہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا بنی اسرائیل کو علیٰحدہ خطہ میں لے جانا، یا دوسرے پیغمبروں کا اپنے وطن سے ہجرت کرنا ایک داعیانہ فعل تھا نہ کہ کوئی قومی فعل۔ وہ دعوت الی اللہ کے اگلے مرحلہ کے طور پر عمل میں لایا گیا نہ کہ قومی اور سیاسی نزاع کے طور پر پیش آیا۔

ہندستان کی شرعی صورت حال یہ ہے کہ ہندو قوم مسلمانوں کے لیے مدعو قوم کی حیثیت رکھتی ہے۔ ہندو کے سلسلہ میں مسلمانوں کی پہلی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ انھیں اسلام کی دعوت دیں۔ ہندو کی طرف سے پیش آنے والی تمام تلخیوں اور زیادتیوں کو یک طرفہ طور پر برداشت کرتے ہوئے دعوتی عمل کو جاری رکھیں ہندوؤں کی طرف سے بدخواہی کا معاملہ کیا جائے تب بھی وہ آخری حد تک ہندوؤں کے خیر خواہ بنے رہیں، دعوت کا کام جب تک تکمیل یا اتمام حجت کے مرحلہ تک نہ پہونچ جائے۔ اس وقت تک مسلمانوں کے لیے صرف صبر و اعراض ہے، اس کے سوا اور کچھ نہیں۔

تبلیغی جماعت مسلمانوں کے درمیان اصلاح کا کام کر رہی ہے۔ اس سلسلہ میں اس کا طریقہ یہ ہے کہ مخالفین کی طرف سے خواہ کتنا ہی زیادہ برا سلوک کیا جائے، وہ اپنے طے شدہ اصول کے مطابق، یک طرفہ طور پر صبر کے طریقہ پر قائم رہتے ہیں۔ وہ زیادتی کرنے والوں کے حق میں صرف دعا کرتے ہیں، اس کے سوا اور کچھ نہیں۔

یہی یک طرفہ صبر و اعراض کا طریقہ مسلمانوں کو ہندوؤں کے سلسلہ میں بھی اختیار کرنا ہے۔ موجودہ حالت میں اس کے سوا کوئی بھی دوسری روش مسلمانوں کے لیے جائز نہیں۔ موجودہ مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ انھوں نے ہندوؤں کو دعوت تو نہ دی، البتہ ان کے تمام اصاغر و اکابر نصف صدی سے اس قسم کی دعائیں کرنے میں مشغول ہیں کہ: اللّٰھمّ اھلك الکفرۃ والمشرکین۔ دعوت سے پہلے مدعو کے خلاف اس قسم کی دعا سراسر سنّت الٰہی کے خلاف ہے، اس لیے وہ ہرگز قبول ہونے والی نہیں، خواہ ہمارے تمام اعاظم و اکابر جمع ہو کر اس دعا پر بآواز بلند آمین کہہ رہے ہوں۔

پاکستان کی تحریک چلانے والوں نے ثابت شدہ طور پر اپنی دعوتی ذمہ داری کو پورا نہیں کیا۔

خدا کے حکم کے مطابق، انھوں نے ہندو قوم کو اسلام کی طرف دعوت نہیں دی اور نہ دعوتی عمل کو تکمیل (اتمامِ حجت) کے مرحلہ تک پہونچایا۔ اس کے برعکس وہ آغاز ہی میں جغرافی تقسیم کا مطالبہ لے کر کھڑے ہو گیے۔ ایسی تحریک کا یقینی طور پر ہجرت کے شرعی اصول سے کوئی تعلق نہیں۔ کیوں کہ ہجرت ہمیشہ دعوت کے بعد ہوتی ہے۔ دعوت سے پہلے ہجرت کے طریقہ پر عمل کرنا سرے سے جائز ہی نہیں۔

اس معاملہ میں حضرت یونس علیہ السلام کا واقعہ ایک رہنما مثال کی حیثیت رکھتا ہے۔ حضرت یونس علیہ السلام شہر نینوا (Nineveh) کی طرف بھیجے گیے۔ یہ قدیم اسیریا کا ایک شہر تھا۔ بائبل کے بیان کے مطابق وہاں کی آبادی ایک لاکھ ۲۰ ہزار تھی۔ حضرت یونس علیہ السلام نے اہلِ نینوا کو توحید کی طرف دعوت دی۔ مگر انھوں نے سرکشی دکھائی۔ ان کی مخالفت اور سرکشی کے باوجود حضرت یونس علیہ السلام نے ان پر دعوتی عمل جاری رکھا۔ کچھ عرصہ بعد حضرت یونس علیہ السلام نے بطور اجتہاد یہ سمجھا کہ اہل نینوا پر اتمام حجت ہو گیا ہے، اور اب وہ ماننے والے نہیں ہیں۔ اس خیال کے تحت وہ نینوا سے ہجرت کر کے چلے گیے۔

قرآن میں یہ قصہ مجمل طور پر اور بائبل میں نسبتاً مفصل طور پر موجود ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک سمندری سفر کے دوران حضرت یونس کو ایک بڑی مچھلی (غالباً وہیل) نے نگل لیا۔ وہ کئی ہفتے تک اسی طرح مچھلی کے پیٹ میں پڑے رہے۔ یہاں تک کہ انھیں احساس ہوا کہ ان سے اجتہادی کوتاہی ہو گئی ہے۔ چنانچہ انھوں نے مچھلی کے پیٹ میں وہ دعا کی جو سورہ الانبیاء (آیت ۸۷) میں موجود ہے۔ بائبل کے مطابق، حضرت یونس نے خداوند اپنے خدا سے کہا کہ میں حمد کرتا ہوں کہ میں اپنی نذریں ادا کروں گا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے انھیں مچھلی کے پیٹ سے خلاصی عطا فرمائی۔ بائبل میں ہے:

"اور خداوند کا کلام دوسری بار یوناہ پر نازل ہوا کہ اٹھ اس بڑے شہر نینوا کو جا اور وہاں اس بات کی منادی کر جس کا میں تجھے حکم دیتا ہوں۔ تب یوناہ خداوند کے کلام کے مطابق اٹھ کر نینوا کو گیا۔ یوناہ شہر میں داخل ہوا۔ اس نے منادی کی اور کہا کہ چالیس روز کے بعد نینوا برباد ہو جائے گا۔ تب نینوا کے باشندوں نے خدا پر ایمان لا کر روزہ کی منادی کی۔ اور ادنیٰ اور اعلیٰ سب نے ٹاٹ اوڑھا۔ یہ خبر نینوا کے بادشاہ کو پہونچی۔ وہ اپنے تخت پر سے اٹھا اور بادشاہی لباس کو اتار ڈالا اور ٹاٹ اوڑھ کر راکھ پر بیٹھ گیا۔ بادشاہ کے فرمان سے نینوا میں یہ اعلان کیا گیا کہ سب خدا کے حضور گریہ وزاری کریں۔

ہر شخص اپنی بری روش اور اپنے ہاتھ کے ظلم سے باز آئے۔ شاید خدا رحم کرے اور اپنا ارادہ بدلے اور اپنے قہر شدید سے باز آئے۔ اور ہم ہلاک نہ ہوں۔ جب خدا نے ان کی یہ حالت دیکھی کہ وہ اپنی بری روش سے باز آئے تو وہ اس عذاب سے جو اس نے ان پر نازل کرنے کو کہا تھا باز آیا اور اسے نازل نہ کیا (یوناہ)

حضرت یونس خدا کے پیغمبر تھے۔ اس کے باوجود ان کا قبل از وقت اپنی قوم سے ہجرت کرنا خدا کو پسند نہ آیا۔ حتی کہ انھیں دوبارہ اپنی قوم کی طرف واپس آنا پڑا۔ اب کیا پاکستان کے لوگوں کا درجہ پیغمبروں سے بھی زیادہ بڑھا ہوا ہے کہ ان کی بلا سبب اور قبل از وقت ہجرت اللہ تعالیٰ کے یہاں قبول ہو جائے اور ان پر رحمتوں کے دروازے کھول دیئے جائیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اہل پاکستان کے لیے نجات کی اس کے سوا اور کوئی صورت نہیں کہ وہ حضرت یونس کی طرح دوبارہ اپنی ہجرت سے رجوع کریں۔ جس مدعو قوم کو انھوں نے دعوت کے بغیر چھوڑا تھا، اس کی طرف واپس آکر دوبارہ وہی کام کریں جو حضرت یونس نے کیا، یعنی انھیں دعوت الی اللہ کا مخاطب بنانا۔ اس کے سوا کوئی دوسرا عمل اہل پاکستان کو نجات دینے والا نہیں، خواہ وہ اسلام کے خوشنما نام سے کیوں نہ انجام دیا گیا ہو۔

تاہم واپسی کا یہ عمل اپنی حقیقت کے اعتبار سے مطلوب ہے نہ کہ اپنی ظاہری صورت کے اعتبار سے۔ یعنی اہل پاکستان کو حضرت یونس کی طرح ارضی اور جغرافی واپسی کی ضرورت نہیں۔ ان سے جو واپسی مطلوب ہے وہ فکری اور مزاجی واپسی ہے۔

اہل پاکستان کے لیے لازم ہے کہ وہ اپنے سابقہ مزاج کو ختم کریں جس کے نتیجہ میں انھوں نے ہندوؤں سے بے جا نفرت شروع کر دی، اور جو آج تک ان کے عوام اور ان کے قائدین اور علما میں آخری حد تک موجود ہے۔ وہ ہندو قوم کو حریف کے بجائے مدعو کی نظر سے دیکھیں۔ وہ ہندو قوم سے عداوت کے بجائے محبت کا طریقہ اختیار کریں۔ ہندو قوم کی طرف سے پیش آنے والی زیادتیوں کو یک طرفہ طور پر برداشت کریں۔ ہندو قوم سے اپنے تمام مادی نزاعات کو یک طرفہ طور پر ختم کر دیں، خواہ وہ ان کی اپنی نظر میں کتنے ہی زیادہ اہم کیوں نہ ہوں۔

حضرت یونس علیہ السلام دوبارہ اللہ کی رحمت کے مستحق اس وقت ہوئے جب کہ انھوں نے اپنی مدعو قوم کی طرف ارضی مراجعت کی۔ اسی طرح اہل پاکستان بھی اللہ کی رحمت کے مستحق صرف اس وقت ہو سکتے ہیں جب کہ وہ اپنی مدعو قوم کی طرف فکری اور جذباتی مراجعت کریں۔ اس کے سوا کوئی بھی

دوسری تدبیر پاکستان کو نجات دینے والی نہیں۔

پاکستان پچھلی نصف صدی سے مختلف مسائل میں گھرا ہوا ہے۔ وہ خارجی مسئلہ سے بچنے کے لیے بنایا گیا تھا۔ مگر بننے کے بعد وہ شدید تر انداز میں مختلف خارجی اور داخلی مسائل کے اندر گھر گیا۔ یہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے عین وہی واقعہ ہے جو حضرت یونس علیہ السلام کے ساتھ پیش آیا تھا۔ حضرت یونس علیہ السلام کی طرح پاکستان آج "مچھلی کے پیٹ" میں ہے۔ لاینحل مسائل نے اس کو پوری طرح گھیر لیا ہے۔ اب اس کو حضرت یونس کے انداز میں مراجعت کرنا ہے۔ اگر اس نے مراجعت کے اصول پر عمل نہ کیا تو وہ قیامت تک اسی طرح "مچھلی کے پیٹ" میں پڑا رہے گا، کوئی بھی دوسری تدبیر اس کو اس قید سے خلاصی دینے والی نہیں۔

پاکستان کے لوگ پرفخر طور پر پاکستان کو "مملکتِ خداداد" کہتے ہیں۔ یہ محض خوش فہمی ہے۔ پاکستان پاکستانیوں کی اپنی خواہش کا مظہر ہے نہ کہ خدا کی رضا کا مظہر۔ زیادہ صحیح طور پر پاکستان کا قیام اس قرآنی آیت کی تصویر ہے: وَذَاالنُّونِ اِذ ذَهَبَ مُغَاضِبًا فَظَنَّ اَن لَّن نَّقدِرَ عَلَيهِ (الانبیاء ۸۷) قرآن کے مطابق، برصغیر ہند کے مسلمانوں کا پاکستان کی صورت میں ایک ملک بنا کر الگ ہو جانا ذہابِ مغاضب کا واقعہ ہے نہ کہ وہ واقعہ جس کو قرآن میں ذہاب الی الرب (الصافات ۹۹) کہا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان ان کے حوصلوں کی تکمیل نہ بن سکا۔ پاکستان بننے کے فوراً بعد اہل پاکستان "مچھلی کے پیٹ" میں چلے گیے، پاکستان کو مسائل کے عفریت نے نگل لیا۔

قرآن میں صراحتاً یہ بات بتائی گئی ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام اگر مراجعت پر راضی نہ ہوتے تو وہ قیامت تک مچھلی کے پیٹ میں رہتے، اور انھیں کبھی اس سے نکلنا نصیب نہ ہوتا۔ قرآن کی سورہ نمبر ۳۷ میں ارشاد ہوا ہے:

"اور بے شک یونس رسولوں میں سے تھے۔ جب کہ وہ بھاگ کر بھری ہوئی کشتی پر پہونچے پھر قرعہ ڈالا تو وہی خطاوار نکلے۔ پھر ان کو مچھلی نے نگل لیا۔ اور وہ اپنے کو ملامت کر رہے تھے۔ پس اگر وہ تسبیح کرنے والوں میں سے نہ ہوتے تو لوگوں کے اٹھائے جانے کے دن (قیامت) تک مچھلی کے پیٹ ہی میں رہتے۔ پھر ہم نے ان کو ایک میدان میں ڈال دیا۔ اور وہ اس وقت نڈھال تھے اور

ہم نے ان پر ایک بیل دار درخت اگا دیا۔ اور ہم نے ان کو ایک لاکھ یا اس سے زیادہ لوگوں کی طرف بھیجا۔ پھر وہ لوگ ایمان لائے تو ہم نے ان کو فائدہ اٹھانے دیا ایک مدت تک (الصافات ۱۴۸ - ۱۳۹)

مچھلی کے پیٹ میں حضرت یونسؑ کی جس تسبیح کا یہاں ذکر ہے، وہ ان کی وہ دعا تھی جو سورہ الانبیاء (آیت ۸۷) میں بتائی گئی ہے (لَآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَکَ اِنِّیْ کُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ) سنت الٰہی کے مطابق یہ مطلوب تھا کہ قوم کے انحراف اور ایذارسانی کے باوجود آنجناب اپنی قوم کے درمیان ٹھہریں، یہاں تک کہ تکمیل دعوت کا مرحلہ آجائے۔ مگر انھوں نے قبل ازوقت اپنی قوم کو چھوڑ دیا۔ مگر ان کے اس عمل نے جب انھیں مچھلی کے پیٹ میں پہونچا دیا تو اس وقت انھیں احساس ہوا کہ مجھ سے کوتاہی ہوگئی۔ یہی احساس تھا جو مذکورہ دعا کی شکل میں ان کی زبان پر جاری ہوگیا۔ وہ اس بات پر راضی ہوگیے کہ ایک سچے داعی کا جذبہ لے کر دوبارہ اپنی قوم کی طرف جائیں۔ اس کے بعد حکم الٰہی کے تحت وہ مچھلی کے پیٹ سے باہر آگیے۔ اور پھر اپنی قوم میں دوبارہ واپس جاکر اللہ کے حکم کی منادی کی۔

یہی تاریخ اہل پاکستان کو دہرانا ہے۔ وہ اپنی غلطی کا اعتراف کریں۔ ہندو قوم کی طرف داعیانہ خیرخواہی کا جذبہ لے کر واپس لوٹیں۔ یک طرفہ قربانی کے ذریعہ ہندو اور ہندستان سے اپنے تعلقات کو خوش گوار بنائیں۔ اگر انھوں نے ایسا نہ کیا تو وہ قیامت تک "مچھلی کے پیٹ" میں پڑے رہیں گے، وہ کبھی اس قید اور مغلوبیت سے نکل نہیں سکتے۔

اسلام کی دعوت بدلتی ہوئی دنیا میں

خدا کے جن قوانین کے تحت موجودہ دنیا چلائی جارہی ہے، ان میں سے ایک وہ ہے جس کو قرآن میں قانون دفع کہا گیا ہے۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے ــــــ اور اگر خدا لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعہ سے دفع نہ کرتا رہے تو خانقاہیں اور گرجا اور عبادت خانے اور مسجدیں جن میں خدا کا نام کثرت سے لیا جاتا ہے، ڈھادئے جاتے۔ اور خدا ضرور اس کی مدد کرے گا جو خدا کی مدد کرے۔ بے شک خدا زبردست ہے، زور والا ہے (۲۲/۴۰)

خدا کے اس قانون کا اظہار انسانی زندگی میں مختلف صورتوں میں ہوتا رہا ہے۔ مثلاً اسلام کے ابتدائی زمانہ میں اس کا ایک نمایاں اظہار اس طرح ہوا کہ وقت کی دو بڑی جابرانہ سلطنتوں ــــــ رومی شہنشاہیت اور ساسانی شہنشاہیت کو توڑ دیا گیا۔ اس کے بعد اشاعت حق کے جو آزادانہ مواقع کھلے، اسی کا یہ نتیجہ تھا کہ اسلام اس وقت کی آباد دنیا کے تقریباً تمام حصوں میں پھیل گیا۔

یورپ میں صنعتی دور آنے کے بعد نوآبادیاتی نظام (Colonialism) دنیا پر چھا گیا۔ اس نے دوبارہ، اگرچہ نسبتاً کم تر شدت کے ساتھ، انسانی دنیا میں جبر کی صورت حال پیدا کردی۔ اللہ تعالیٰ کا قانون حرکت میں آیا۔ دوسری عالمی جنگ (۱۹۳۹-۴۵) پیش آئی۔ اس کے نتیجہ میں یورپ کی نوآبادیاتی طاقتیں بے حد کمزور ہوگئیں اور آخر کار اس نظام کا خاتمہ ہوگیا۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ کے قانون دفع کا ایک نمایاں اظہار حالیہ برسوں (۱۹۸۹ - ۹۰) میں ہوا ہے۔ اس بار اس قانون کا نشانہ کمیونسٹ ایمپائر تھی۔ کیمونسٹ روس میں اللہ تعالیٰ نے ایسے حالات پیدا کئے کہ بظاہر ناقابل شکست سوویت ایمپائر ٹوٹ گئی۔ اس طرح اشاعت حق کی آخری رکاوٹ کو بھی ہمیشہ کے لئے ختم کردیا گیا۔ بظاہر اب اس قسم کا نظام جبر دوبارہ دنیا میں آنے والا نہیں۔

مصلحت خداوندی

موجودہ دنیا کو اللہ تعالیٰ نے امتحان کی مصلحت کے تحت بنایا ہے۔ امتحان کی مصلحت کا لازمی تقاضا ہے کہ دنیا میں آزادی کا ماحول ہو۔ یہاں ہر آدمی کے لئے فمن شاء فلیؤمن ومن شاء فلیکفر

(الکہف ۲۹) کا موقع باقی رہے۔

ایسی حالت میں دنیا کے اندر جبر کا نظام قائم کرنا براہ راست مصلحت خداوندی کے خلاف ہے۔ کوئی شخص جب کسی علاقے میں جبر کا نظام قائم کرتا ہے تو گویا وہ خدا کے قائم کئے ہوئے نظام میں مداخلت کرتا ہے۔ خدا ایسے شخص یا گروہ کو کبھی برداشت نہیں کرتا۔ وہ ایسے لوگوں سے طاقت چھین کر انھیں باہر پھینک دیتا ہے۔

کچھ لوگ جہاد (بمعنی قتال) کی تشریح اس طرح کرتے ہیں کہ اس کا مقصد موانع دعوت کو ہٹانا ہے۔ مگر یہ صحیح نہیں۔ جہاد (بمعنی قتال) صرف دفاع کے لئے ہوتا ہے۔ جہاں تک موانع دعوت کا تعلق ہے وہ خود خدا کی طرف سے ہٹائے جاتے ہیں۔ موانع دعوت خدا کا مسئلہ ہے، وہ ہمارا مسئلہ نہیں۔ ہمارا مسئلہ دعوت پہنچانا ہے، اگر ہم دعوت پہنچانے کا کام کریں تو خدا کی طرف سے یہ وعدہ ہے کہ وہ ضرور موانع دعوت کا خاتمہ کر دے گا۔

بائبل کی پیشین گوئی

بائبل میں اسرائیلی پیغمبر کی زبان سے یہ اعلان کیا گیا تھا کہ —— وہ کھڑا ہوا اور زمین تھرا گئی۔ اس نے نگاہ کی اور قومیں پراگندہ ہوگئیں۔ ازلی پہاڑ پارہ پارہ ہوگئے۔ قدیم ٹیلے جھک گئے۔ اس کی راہیں ازلی ہیں (حبقوق ۳ : ۶) :

وقف وفاسَ الارض۔ نظر فرجف الامم ودُکّتِ الجبالُ الدهرية وخسفت آکامُ القِدَم۔ مسالك الازل له (حبقوق ۳ : ۶)

اس پیشین گوئی کا تعلق پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے۔ اس میں "ازلی پہاڑ" اور "قدیم ٹیلہ" سے مراد رومی اور ساسانی سلطنتیں ہیں۔ یہ سلطنتیں جبر پر قائم تھیں۔ انھوں نے قدیم زمانہ میں وہ چیز پیدا کر رکھی تھی جس کو قرآن میں فتنہ کہا گیا ہے۔ اور جس کو ہنری پرین (Henri Pirenne) نے شاہانہ مطلقیت (Imperial absolutism) سے تعبیر کیا ہے۔ اس شاہانہ مطلقیت نے قدیم زمانہ میں دعوت حق کے تمام مواقع ختم کر دئے تھے۔ اسلام کی ابتدائی تاریخ میں اللہ تعالیٰ نے عرب طاقت کے ذریعہ ان شہنشاہیتوں کو توڑ دیا۔

اس کے بعد تاریخ میں پہلی بار آزادانہ غور وفکر کا دور شروع ہوا۔ اس طرح وہ حالات پیدا

ہوئے جب کہ اہل حق آزادانہ طور پر خدا کے دین کی تبلیغ کریں اور لوگ آزادانہ غور وفکر کے تحت اس کو قبول کرلیں۔

دور جدید کا نظام جبر

موجودہ زمانہ میں مذکورہ قسم کی شاہانہ مطلقیت دوبارہ نئی صورت میں قائم ہوگئی۔ یہ وہ نظام جبر ہے جو کمیونسٹ نظریہ کے تحت سوویت یونین میں ۱۹۱۷ میں قائم ہوا۔ یہ جابرانہ نظام دوبارہ شدید تر صورت میں دعوت حق کی راہ میں مانع بن گیا۔ بیسویں صدی کے اس نظام جبر میں تاریخ کی سب سے بڑی طاقت کے ذریعہ یہ کوشش کی گئی کہ خدا اور مذہب کو آخری حد تک انسانی زندگی سے مٹا دیا جائے۔

مگر دوبارہ خدا کا قانون دفع حرکت میں آیا۔ خدا نے اپنی برتر مداخلت کے ذریعہ اس کو توڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ سوویت یونین، ٹائم میگزین ۱۲ مارچ ۱۹۹۰ کے لفظوں میں، سوویت ڈس یونین (Soviet Disunion) بن گیا۔

مارکسزم کا خاتمہ

۱۹۵۸ میں راقم الحروف نے ایک کتاب لکھی تھی، اس کا ٹائٹل تھا: مارکسزم، تاریخ جس کو رد کر چکی ہے۔ اس وقت لوگوں کو یہ ٹائٹل بڑا عجیب معلوم ہوا تھا، مگر آج ۱۹۹۰ میں ساری دنیا کے اخبارات و رسائل میں ایسے مضامین چھپ رہے ہیں جن کی سرخی اس قسم کی ہوتی ہے:

The Collapse of Socialist system
Soviet Empire is Crumbling
The End of Communist History
Marxism is Over
Total Failure of Communism
Fragmented Empire of the U.S.S.R.

ہندستان ٹائمس (یکم جنوری ۱۹۹۰) نے کسی مغربی اخبار سے ایک کارٹون نقل کیا تھا۔ اس میں دکھایا گیا تھا کہ ایک ویران قبرستان ہے۔ اس کے ایک طرف کارل مارکس کی قبر بنائی گئی ہے۔ قبر کے اوپر ایک پتھر لگا ہوا ہے۔ اس پتھر پر جلی حرفوں میں لکھا ہوا ہے:

Marx: Finally buried 1989

اسی طرح ہندستان کے دوسرے انگریزی اخبار ٹائمس آف انڈیا (۱۳ مئی ۱۹۹۰) نے اپنے پہلے صفحہ پر ایک کارٹون چھاپا تھا۔ اس میں ایک گلوب ہے جس میں دنیا کا نقشہ بنا ہوا ہے۔ اس گلوب کے سامنے روسی لیڈر مسٹر گورباچیف آتشیں شیشہ (magnifying glass) لئے ہوئے کھڑے ہیں اور اس کے نقشہ میں اپنا ملک تلاش کر رہے ہیں۔ آخر کار وہ اپنی بیوی سے کہہ اٹھتے ہیں کہ رئیسہ، وہ یہاں ہے، میں نے اس کو پالیا، سوویت یونین:

Raisa, It's here! I found it – the Soviet Union!

سوویت یونین میں ہونے والے اس انقلاب کا کریڈٹ ٹائم میگزین نے میخائیل گورباچیف کو دیا ہے۔ اس نے اپنا شمارہ یکم جنوری ۱۹۹۰ استثنائی طور پر گورباچیف نمبر کے طور پر نکالا ہے اور گورباچیف کو دہے کی شخصیت (Man of the Decade) قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ گورباچیف نے دنیا کو بدل دیا:

Gorbachev has transformed the world (p. 14).

اس میں شک نہیں کہ سوویت یونین میں جو انقلابی واقعہ ہوا، اس کو ظہور میں لانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے گورباچیف کو وسیلہ بنایا ہے۔ اس معاملہ میں زیادہ بڑے پیمانہ ان کا وہی درجہ ہے جو فرانس کے جنرل ڈیگال کا تھا۔ ڈیگال نے حالات کا اعتراف کرتے ہوئے فرانس کے افریقی مقبوضات کو آزاد کر دیا۔ اسی طرح میخائیل گورباچیف نے اندرونی اور بیرونی حالات کا اعتراف کرتے ہوئے سوویت روس میں انقلاب کے بند دروازے کھول دئے۔ اس سلسلہ میں ٹائم کا یہ ریمارک بہت بامعنی ہے کہ گورباچیف ایک ماہر سیاست داں ہیں۔ وہ بہت سے ملکوں میں الکشن جیت سکتے ہیں مگر غالباً خود اپنے ملک میں نہیں:

A master politician, Gorbachev could win election in many countries, but probably not his own.

سوویت روس میں لائے جانے والے اس انقلاب کے بہت سے پہلو ہیں۔ ان میں سے ایک اہم پہلو وہ ہے جو مذہب سے تعلق رکھتا ہے۔ کمیونسٹ حکومت کے قیام (۱۹۱۷) کے بعد پورے سوویت روس میں مذہب پر مکمل پابندی عائد کر دی گئی تھی۔ اسی طرح اسلام بھی وہاں محبوس ہو کر رہ گیا تھا۔

ہزاروں مسجدیں اور مدرسے بند کر دیے گئے۔ اسلامی لٹریچر کی اشاعت پر پابندی لگا دی گئی۔ اسلامی تعلیم یا اسلامی سرگرمیاں جرم قرار پا گئیں۔ مگر نئے انقلاب نے دوبارہ سوویت روس میں اسلامی سرگرمیوں کے دروازے کھول دئے ہیں۔

اسلام کا دور

سوویت روس میں عبادت خانے بند کر دئے گئے تھے۔ مذہب کو خلاف قانون قرار دے دیا گیا تھا۔ حکومت کی طرف سے ایک مستقل محکمہ قائم کیا گیا جس کا مقصد یہ تھا کہ وہ سوویت روس سے مکمل طور پر مذہب کے خاتمہ کی تدبیریں اختیار کرے۔ مگر آج یہ تمام چیزیں عملاً ختم ہو چکی ہیں۔

سوویت روس میں اب ایک ہزار سے زیادہ مسجدیں مسلمانوں کے حوالے کر دی گئی ہیں۔ اسلامی لٹریچر شائع کرنے کی اجازت مل گئی ہے۔ چنانچہ ۱۹۹۰ میں وہاں سے ایک اسلامی جریدہ "نور الاسلام" کے نام سے نکالا گیا ہے۔ روسی حکومت کی منظوری کے تحت خود روس کی ہوائی کمپنی ایروفلاٹ نے قرآن کے ایک ملین نسخے جدہ سے ماسکو پہنچائے ہیں، جب کہ اس سے پہلے قرآن کا ایک نسخہ بھی روس کے اندر لے جانا ممنوع تھا۔

کمیونسٹ انقلاب کے بعد سوویت روس میں حج کا سفر بند کر دیا گیا تھا۔ اب خود سوویت یونین کے صدر میخائیل گورباچیف نے روسی ایئر لائن ایروفلاٹ کو ہدایت کی ہے کہ وہ روسی حاجیوں کو عرب پہنچانے کا خصوصی انتظام کرے اور اس مقصد کے لئے ماسکو، تاشقند، باکو، تاتار، قازان اور دوسرے بڑے روسی شہروں سے جدہ تک براہ راست پروازیں جاری کرے۔ اسی کے ساتھ گورباچیف نے روسی وزیر خارجہ سے کہا ہے کہ سوویت روس سے جو مسلمان حج کے لئے جانا چاہیں، ان کے لئے بسہولت ویزا جاری کیا جائے۔

سوویت روس میں اسلام کے لئے جو نئے مواقع پیدا ہوئے ہیں، ان کے سلسلہ میں یہ چند باتیں بطور مثال ہیں نہ کہ بطور حصر۔ انھیں چند مثالوں سے بقیہ باتوں کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

کارل مارکس نے اپنی ایک تحریر میں مذہب کے خلاف نہایت سخت ریمارک دیا تھا۔ اس نے لکھا تھا کہ مذہب عوام کی افیون ہے:

Religion is the opium of the people.

مگر آج خود کمیونسٹ روس میں ایسے اہل علم پیدا ہوچکے ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ مارکسزم خود بدترین قسم کی ذہنی افیون تھی۔ مارکس خود اس افیون میں مبتلا ہوا اور دوسرے بہت سے لوگوں کو اس میں مبتلا کیا۔ اسٹالن نے روس کے ۲۵ ملین انسانوں کو یا تو ہلاک کر دیا یا انھیں سخت ترین سزائیں دیں۔ اُس کے باوجود وہ کمیونسٹ نظام کو مستحکم نہ کرسکا۔

ٹائم میگزین نے اپنے شمارہ ۱۲ مارچ ۱۹۹۰ میں سوویت روس کے بارہ میں ایک مفصل رپورٹ شائع کی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ نئے انقلاب کے بعد اب روس میں مذہب کی حیثیت کیا ہے۔ اس سلسلہ میں اسلام کا بھی تفصیلی حال درج کیا گیا ہے۔ رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ روس کے تقریباً ۵۵ ملین مسلمان نئی مذہبی رواداری کا فائدہ حاصل کر رہے ہیں:

Some 55 million Soviet Muslims enjoy the fruits of new religious tolerance.

اس باتصویر رپورٹ کی سرخی نہایت بامعنی ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں ——— کارل مارکس محمد کے لئے جگہ خالی کرتا ہے:

Karl Marx makes room for Muhammad

کیسا عجیب ہے یہ انقلاب جو تاریخ انسانی میں پیش آیا ہے۔

آزاد دنیا میں دورِ خاتمیت

یہ وہ صورت حال ہے جو دوسری دنیا (second world) میں پیش آئی۔ اسی طرح پہلی دنیا (first world) میں بھی ایک اور انداز سے دور رس تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ اور یہ تبدیلیاں بھی عین اسلامی دعوت کے حق میں ہیں۔ ان تبدیلیوں نے مغربی دنیا میں موانع دعوت کا حصار توڑ کر وہاں دعوت کے نئے وسیع تر امکانات کھول دئے ہیں۔

امریکہ کے دانشور طبقہ میں پچھلے چند برسوں میں ایک نیا فکر پیدا ہوا ہے۔ اس فکر کو خاتمیت (endism) کا نام دیا گیا ہے۔ "آزاد دنیا" نے حیرت انگیز طور پر اپنی تہذیب میں اپنے سابقہ یقین کو کھو دیا ہے۔

لامحدود آزادی کا نظریہ حقائق فطرت سے ٹکرا گیا۔ صنعتی ترقی کے مسائل نے دنیا میں جنت

تعمیر کرنے کے خواب کو برباد کر دیا۔ جاپان کی غیر متوقع اقتصادی طاقت نے مغرب کی فوجی طاقت کو غیر موثر بنا دیا۔ انسانی ساخت کے تمام نظریات اپنے تجربہ میں غیر معتبر قرار پاگئے۔ مادی ترقیاں انسان کی روح کو مطمئن کرنے میں ناکام ثابت ہوئیں۔ وغیرہ

ناکامیوں کی اس فہرست میں سب سے اہم اور دوررس نتائج والی ناکامی وہ ہے جو فکری سطح پر پیش آئی ہے۔ انیسویں صدی کے نصف آخر اور بیسویں صدی کے نصف اول میں اہل مغرب نے یہ یقین کر لیا تھا کہ ان کی سائنس ان کے لئے الہامی مذہب کا بدل ہے۔ سائنس فکری اعتبار سے انھیں وہ سب کچھ دے سکتی ہے جس کی امید مذہب سے کی جاتی ہے۔ مگر موجودہ صدی کے آخر میں پہنچ کر اصل سائنس نے آخری طور پر اپنے اس یقین کو کھو دیا ہے۔ اب انسان دوبارہ وہاں کھڑا ہے جہاں اس کو فکری اعتقاد اور نظریاتی یقین کے لئے دوبارہ اسی چیز کی ضرورت ہے جس کو مذہب کہا جاتا ہے۔

سائنس کی اس ناکامی پر موجودہ زمانہ میں کثیر تعداد میں کتابیں چھپی ہیں۔ ان کتابوں کا مشترک خلاصہ یہ ہے کہ سائنس کی تمام تحقیقات نے اس کو اس مقام پر پہنچایا ہے کہ انسان جو کچھ جاننا چاہتا ہے، وہ اس کو سائنسی مطالعہ کے ذریعہ نہیں جان سکتا۔ موجودہ صدی کے آغاز میں انسان نے "انسائیکلو پیڈیا آف نالج" چھاپی تھی، اب موجودہ صدی کے خاتمہ پر وہ قاموس جہالت (Encyclopaedia of Ignorance) چھاپ رہا ہے۔

یہاں میں ایک کتاب کا حوالہ دوں گا جو ۱۹۸۹ میں نیو یارک سے چھپی ہے۔ اس کتاب کے مصنف اسٹفن ہاکنگ (Stephen W. Hawking) ہیں۔ وہ کیمبرج یونیورسٹی میں میتھمیٹکس کے پروفیسر ہیں۔ میتھمیٹکس کی یہ چیر نیوٹن کے نام پر قائم کی گئی ہے۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ آئن سٹائن کے بعد وہ نظریاتی طبیعیات میں سب سے زیادہ ممتاز سائنس داں ہیں۔ انھوں نے اپنی کتاب وقت کی مختصر تاریخ (A Brief History of Time) کو ان سطروں سے شروع کیا ہے:

ایک مشہور سائنس داں (کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ برٹرینڈرسل) نے ایک بار فلکیات پر ایک عوامی لکچر دیا۔ اس نے بتایا کہ زمین کس طرح سورج کے گرد گھومتی ہے اور پھر سورج کس طرح کہکشاں کے مرکز کے گرد گھومتا ہے جو کہ بہت سے ستاروں کا ایک مجموعہ ہے۔ لکچر کے آخر میں ایک چھوٹی بوڑھی عورت کمرہ کے پچھلے حصہ سے اٹھی اور کہا۔ جو کچھ تم نے ہمیں بتایا وہ لغو ہے۔ زمین درحقیقت ایک

چپٹی پلیٹ کی طرح ہے اور وہ ایک بڑے کچھوے کی پشت پر ٹھی ہوئی ہے۔ سائنس داں برتری کے احساس کے تحت مسکرایا اور پھر کہا کہ یہ کچھوا کس چیز کے اوپر ہے۔ خاتون نے کہا کہ نوجوان، تم بہت چالاک ہو۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ کچھوے کے نیچے کچھوا ہے، اور اسی طرح یہ سلسلہ نیچے تک چلا گیا ہے۔

بہت سے لوگ دنیا کی اس تصویر کو مضحکہ خیز سمجھیں گے کہ یہاں کچھوؤں کا ایک لامتناہی کھبا قائم ہے۔ مگر ہم کیوں یہ خیال کرتے ہیں کہ ہمارا علم اس سے بہتر ہے۔ ہم دنیا کی بابت کیا جانتے ہیں اور کس طرح جانتے ہیں۔ دنیا کہاں سے آئی اور وہ کہاں جا رہی ہے۔ کیا دنیا کا ایک آغاز ہے، اور اگر ایسا ہے تو اس سے پہلے کیا پیش آیا۔ وقت کی نوعیت کیا ہے۔ کیا وہ کبھی ختم ہو جائے گا۔ علم طبیعیات کے حالیہ انکشافات جو نئی ٹکنالوجی کے ذریعہ ممکن ہوئے ہیں، وہ ان میں سے بعض سوالات کا کچھ جواب دیتے ہیں۔ یہ جواب آئندہ اتنے ہی بدیہی دکھائی دے سکتے ہیں جتنا کہ زمین کا سورج کے گرد گھومنا یا شاید وہ اتنے ہی مضحکہ خیز نظر آئیں جتنا کہ کچھوؤں کا کھبا۔ صرف وقت ہی اس کے بارہ میں کچھ بتا سکتا ہے:

A well-known scientist (Some say it was Bertrand Russell) once gave a public lecture on astronomy. He described how the earth orbits around the sun and how the sun, in turn, orbits around the center of a vast collection of stars called our galaxy. At the end of the lecture, a little old lady at the back of the room got up and said: "What you have told us is rubbish. The world is really a flat plate supported on the back of a giant tortoise." The scientist gave a superior smile before replying, "What is the tortoise standing on?" "You're very clever, young man, very clever," said the old lady. "But it's turtles all the way down!"

Most people would find the picture of our universe as an infinite tower of tortoises rather ridiculous, but why do we think we know better? What do we know about the universe, and how do we know it? Where did the universe come from and where is it going? Did the universe have a beginning, and if so, what happened before then? What is the nature of time? Will it ever come to an end? Recent breakthroughs in physics, made possible in part by fantastic new technologies, suggest answers to some of these longstanding questions. Someday these answers may seem as obvious to us as the earth orbiting the sun or perhaps as ridiculous as a tower of tortoises. Only time (whatever that may be) will tell.

ایک اور مثال

اسٹفن ہاکنگ نے اپنی کتاب میں مختلف پہلوؤں سے بحث کر کے دکھایا ہے کہ کائنات نے بے شمار امکانی ماڈلوں میں سے اسی ایک ماڈل کو اختیار کیا ہے جو انسان جیسی مخلوق کی زندگی اور

ترقی کے لئے ضروری تھا۔" کائنات ویسی کیوں ہے جیسی ہم اسے دیکھتے ہیں"۔ ان کے الفاظ میں، اس سوال کا جواب بالکل سادہ ہے۔ اگر کائنات کسی اور ڈھنگ کی ہوتی تو ہم یہاں موجود ہی نہ ہوتے:

"Why is the universe the way we see it?" The answer is then simple: If it had been different, we would not be here! (p. 131).

انھوں نے بگ بینگ (big bang) نظریہ کا حساب کرکے بتایا ہے کہ اس میں بے شمار ایسے پہلو ہیں جن کے متعلق ماننا پڑتا ہے کہ وہ کسی ناقابل توجیہہ سبب (unexplained reason) کی بنا پر ہوا۔ کیوں کہ معلوم مادی قوانین میں اس کی توجیہہ موجود نہیں۔

مثال کے طور پر انھوں نے بتایا ہے کہ بگ بینگ کے بعد کائنات کی جو توسیع شروع ہوئی اور جو اب تک مسلسل جاری ہے، اس کی توسیع کی شرح (rate of expansion) انتہائی حد تک حسابی (well-calculated) ہے۔ اس توسیع کی شرحِ رفتار میں اگر ایک سکنڈ کے جزء (fraction) کے بقدر بھی فرق ہوتا تو کائنات اب تک منہدم ہو چکی ہوتی۔

اس قسم کی مختلف تفصیلات دیتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ اس کی وجہ بتانا بے حد مشکل ہے کہ کائنات اس خاص طریقہ سے کیوں شروع ہوئی، سوا اس کے کہ یہ مانا جائے کہ وہ ایک خدا کا عمل ہے جس نے چاہا کہ وہ ہمارے جیسی مخلوق پیدا کرکے یہاں رکھے:

It would be very difficult to explain why the universe should have begun in just this way, except as the act of a God who intended to create beings like us (p. 134).

کائنات کا سائنٹفک ماڈل تقاضا کرتا ہے کہ اس کائنات کا ایک خدا مانا جائے۔ خدا کو نہ ماننے کی صورت میں یہ ماڈل ناقابل فہم بن کر رہ جاتا ہے۔

سائنس کی تصدیق

موجودہ زمانہ عقل (reason) کا زمانہ ہے۔ آج کا انسان ہر چیز کو عقل کے معیار پر پرکھ کر اختیار کرنا چاہتا ہے۔ مگر آج کے انسان نے جب موجودہ مذاہب کو عقل کے معیار پر پرکھا تو اس نے پایا کہ تمام مذاہب کی کتابیں غیر عقلی تعلیمات سے بھری ہوئی ہیں۔

مثال کے طور پر بائبل میں زمین پر انسان کے ظہور کی جو تاریخ دی گئی ہے، اس کے لحاظ سے حساب لگایا جائے تو ۱۹۹۱ میں زمین پر انسان کے ظہور کی مدت ۵۷۵۲ سال ہوگی۔ سائنسی نقطہ نظر سے انسانی عمر کا یہ تعین مضحکہ خیز ہے۔ مگر اس قسم کی غیر علمی اور غیر تاریخی باتیں تمام مذہبی کتابوں میں پائی جاتی ہیں۔

اس میں صرف ایک استثناء ہے اور وہ قرآن کا ہے۔ قرآن میں اس قسم کی کوئی مثال مطلق طور پر موجود نہیں۔ اس موضوع پر مختلف کتابیں چھپ چکی ہیں۔ فرانس کے ڈاکٹر موریس بوکائی (Dr Maurice Bucaille) کی مشہور کتاب (The Bible, the Qur'ān and Science) خاص اسی موضوع پر ہے جو پہلی بار فرانسیسی زبان میں ۱۹۷۶ میں شائع ہوئی تھی۔ اور اب تک ۱۰ زبانوں میں اس کے ترجمے کئے جا چکے ہیں۔

اس سلسلہ میں ڈاکٹر بکائی کی دوسری کتاب ۱۹۸۴ میں پیرس سے شائع ہوئی ہے۔ ۲۲۰ صفحہ پر مشتمل اس کتاب کے انگریزی اڈیشن کا نام یہ ہے:

What is the Origin of Man?

ڈاکٹر موریس بوکائی نے اس کتاب میں خاص طور پر ان آیات کا مطالعہ کیا ہے جن میں بتایا گیا ہے کہ رحم مادر کے اندر انسان کی ابتدائی تخلیق کس طرح ہوتی ہے۔ مثلاً: اور ہم نے انسان کو مٹی کے خلاصہ سے پیدا کیا۔ پھر ہم نے پانی کی ایک بوند کی شکل میں اس کو ایک محفوظ ٹھکانے میں رکھا۔ پھر ہم نے پانی کی بوند کو ایک علقہ کی شکل دی۔ پھر علقہ کو گوشت کا ایک لوتھڑا بنایا۔ پس لوتھڑے کے اندر ہڈیاں پیدا کیں۔ پھر ہم نے ہڈیوں پر گوشت چڑھایا۔ پھر ہم نے اس کو ایک نئی صورت میں بنا کر کھڑا کیا۔ پس بڑا ہی بابرکت ہے اللہ، بہترین پیدا کرنے والا (۲۳/۱۲-۱۴)

ڈاکٹر بوکائی نے دکھایا ہے کہ پیغمبر اسلام کے الہام کا زمانہ ۶۱۰ سے ۶۳۲ء تک ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب کہ مشرق و مغرب میں ہر طرف علمی تاریک خیالی (scientific obscurantism) کا ذہن چھایا ہوا تھا۔ چنانچہ اس دور کی تمام کتابوں میں اس زمانہ کے غیر علمی خیالات کا انعکاس پایا جاتا ہے۔

مگر قرآن حیرت انگیز طور پر اس عمومی تاثر سے مستثنیٰ ہے۔ قرآن میں اپنے زمانہ کی کوئی ایک بھی علمی

غلطی راہ نہ پاسکی۔ حتی کہ قرآن اگر اس زمانہ کی کسی رواجی بات کو نقل کرتا ہے تو وہ صرف اس کے صحیح اجزاء کو نقل کرتا ہے، اور اس کے غیر صحیح اجزاء کو حذف کرتا چلا جاتا ہے۔

ڈاکٹر موریس بوکائی نے اس سلسلہ میں ان آیتوں کا تفصیلی مطالعہ کیا ہے جن کا تعلق انسان کی پیدائش اور رحم مادر میں اس کے ارتقاء سے ہے۔ انھوں نے تفصیل سے دکھایا ہے کہ انسان کی پیدائش کے بارہ میں قرآن کے جو بیانات ہیں وہ حیرت انگیز طور پر جدید تحقیقات کے عین مطابق ہیں۔ وہ تحقیقی نتائج جو پہلی بار صرف بیسویں صدی کے نصف آخر میں سامنے آئے ہیں، وہ ۱۴۰۰ سو سال پہلے کی کتاب قرآن میں کیوں کر موجود ہیں، یہ ظاہرہ (phenomenon) انتہائی حد تک عجیب ہے۔

ڈاکٹر بکائی اس قسم کی تفصیلات پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ علم کی تاریخ ہم کو اس نتیجہ تک پہنچاتی ہے کہ قرآن میں اس قسم کی آیتوں کی موجودگی کی کوئی انسانی توجیہہ ممکن نہیں:

> The history of science leads us to conclude that there can be no human explanation for the existence of these verses in the Qur'ān (p. 188).

اس طرح کی کثیر مثالیں ہیں جو یہ ثابت کرتی ہیں کہ علم کا دریا (river of knowledge) جو لوگوں کو انیسویں صدی میں الحاد کی طرف جاتا ہوا نظر آرہا تھا، اب بیسویں صدی میں وہ اپنا رخ موڑ کر مذہب کی طرف جا رہا ہے۔ مذہبی عقائد عین سائنٹفک سطح پر ثابت شدہ حقائق بنتے جا رہے ہیں۔ مذہب آج خالص سائنس کی روشنی میں، سب سے زیادہ قابل فہم اور قابل اعتبار آئیڈیالوجی بن گیا ہے۔

یہاں میں اضافہ کروں گا کہ مذہب کی صداقت کا ثابت ہونا اسلام کی صداقت کا ثابت ہونا ہے۔ کیوں کہ اسلام کے سوا تمام مذاہب تبدیلی اور اضافہ کی بنا پر اپنا استناد کھو چکے ہیں۔ اب میدان میں صرف اسلام ہے جس کو مستند اور قابل قبول مذہب کا درجہ دیا جاسکے۔

سائنس کی طرف سے مایوسی

یہ ایک حقیقت ہے کہ موجودہ زمانہ کی سائنسی دریافتوں نے انسان کو علم سے زیادہ بے علمی تک پہنچایا ہے۔ مثلاً بلیک ہول کا نظریہ یہ بتاتا ہے کہ ہماری کائنات کا صرف ۳ فی صد حصہ ہمارے لئے

قابل مشاہدہ ہے۔ بقیہ ۹۹ فی صد حصہ روشنی خارج نہ کرنے کی وجہ سے ہمارے لئے قابل مشاہدہ ہی نہیں۔

یہ سادہ طور پر مادہ (mass) کی بات ہے۔ جہاں تک مادی مشاہدات کی توجیہہ کا سوال ہے تو اس معاملہ میں سائنس نے ہمیں کسی بھی یقینی جواب تک نہیں پہنچایا ہے۔ ہر چیز جس کو آدمی جاننا چاہتا ہے، بہت جلد وہ دیکھتا ہے کہ اس کی حد (limit) آگئی۔ اور اس کے آگے معاملہ کو جاننا یا سمجھنا آدمی کے لئے موجودہ حالت میں ناممکن ہے۔

ان تجربات کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ موجودہ زمانہ میں آدمی نے سائنس کے بارہ میں اپنے یقین کو کھودیا ہے۔ کمیونسٹ دنیا کا مسئلہ اگر جبر تھا، تو آزاد مغربی دنیا کا مسئلہ ذہنی گھمنڈ (intellectual arrogance) تھا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے ان کو سائنس کی محدودیت (Limitations) بتا کر ان کے علمی گھمنڈ کو چور چور کردیا۔

یہاں میں انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) کا ایک پیراگراف نقل کروں گا۔ اس نے "ہسٹری آف سائنس" کے آرٹیکل کے تحت لکھا ہے کہ ابھی حال تک، سائنس کی تاریخ کامیابی کی تاریخ تھی۔ سائنس کی کامیابیاں بڑھتے ہوئے علم، اور جہالت اور توہم پرستی پر فتح کی نمائندگی کررہی تھیں۔ سائنس سے ایجادات کا ایک سیلاب نکلا تھا جو انسانی زندگی کو ترقی دینے والا تھا۔ مگر حال میں یہ محسوس کیا گیا ہے کہ سائنس گہرے اخلاقی سوالات سے دوچار ہے۔ لامحدود ٹیکنکل ترقیوں سے پیدا ہونے والے خطرات نے مورخین کو مجبور کیا ہے کہ وہ سائنس کے بارہ میں اپنے ابتدائی سادہ خیالات کا دوبارہ تنقیدی جائزہ لیں:

Until recently, the history of science was a story of success. The triumphs of science represented a cumulative process of increasing knowledge and a sequence of victories over ignorance and superstition; and from science flowed a stream of inventions for the improvement of human life. The recent realization of deep moral problems within science, of external forces and constraints on its development, and of dangers in uncontrolled technological change has challenged historians to a critical reassessment of this earlier simple faith. (16/366)

خلاصہ کلام

دوسری دنیا (کمیونسٹ دنیا) میں اسلامی دعوت کے لئے کام کرنے کے مواقع مسدود ہوگئے

تھے۔ اب وہاں اسلامی دعوت کے مواقع دوبارہ کھل گئے ہیں۔ جہاں تک پہلی دنیا (آزاد دنیا) کا تعلق ہے، وہاں کام کے مواقع پہلے سے موجود تھے۔ اب نئے حالات نے ان مواقع میں صرف مزید اضافہ کیا ہے۔

ان حالات میں ہماری ذمہ داری بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ اب ہمیں مزید طاقت اور سرگرمی کے ساتھ ان مواقع دعوت کو استعمال کرنے میں لگ جانا چاہئے۔

اسلام کا احیاء اور مسلمانوں کی ترقی تمام تر دعوت کے عمل سے وابستہ ہے۔ اور موجودہ زمانہ میں دعوت کے مواقع آخری حد تک کھول دئے گئے ہیں۔ اب تاریخ منتظر ہے کہ کچھ لوگ اٹھیں اور ان مواقع کو استعمال کرکے اسلام کی دعوت کو تمام بندگان خدا تک پہنچادیں۔

موجودہ زمانہ میں ایک طرف ہر قسم کے دعوتی مواقع کے دروازے کھل گئے ہیں۔ دوسری طرف وسائل اعلام (communication) کے جدید ذرائع نے اس کو ممکن بنادیا ہے کہ انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ خدا کی دعوت سارے عالم میں پہنچائی جاسکے، یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ پیشین گوئی پوری ہو جائے جس میں آپ نے فرمایا کہ زمین کے اوپر کوئی بھی مکان یا خیمہ نہیں بچے گا جس میں اسلام کا کلمہ داخل نہ ہو جائے۔ تاریخ ہمیں یہ عظیم کریڈٹ دینے کے لئے تیار ہے، بشرطیکہ ہم ان ضروری شرائط کو پورا کردیں جس کے بعد کسی کو اس قسم کا کریڈٹ دیا جاتا ہے۔

تعمیرخویش

جاپان کے موجودہ بادشاہ آکی ہیٹو (Akihito) ۱۲ نومبر ۱۹۹۰ کو باقاعدہ طور پر تخت پر بیٹھے۔ اس سلسلہ میں جو خبریں چھپی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے جو ٹائمس آف انڈیا (۱۳ نومبر ۱۹۹۰) سے لے کر یہاں نقل کی جارہی ہے:

In 1953 Akihito faced embarrassment when he was asked to represent his father, at the coronation of the British Queen Elizabeth and the London newspaper Daily Express polled British opinion on: should the Japanese crown prince attend the coronation? 67 per cent of those responded had said "no". Twenty-six years later when asked to comment on this experience, Akihito told Japanese journalists: "I strongly felt then how necessary it was for people of a country to live in plenty." Today Prince Charles, the eldest son of Queen Elizabeth and the heir to the British throne, attends Akihito's enthronement when Japan far surpasses Britain in wealth and is riding high the acme of its still growing economic power.

(*The Times of India*, November 13, 1990)

۱۹۵۳ میں آکی ہیٹو کو پریشانی لاحق ہوئی تھی جب کہ ان سے کہا گیا تھا کہ وہ لندن میں منعقد ہونے والی برطانی ملکہ الزبتھ کی تاج پوشی کی تقریب میں اپنے والد کی نمائندگی کریں۔ اس وقت برطانیہ کے اخبار ڈیلی اکسپریس نے برطانی عوام کی رائے معلوم کی۔ اس نے لوگوں سے پوچھا کہ کیا جاپانی ولی عہد کو تاج پوشی کی تقریب میں شرکت کرنا چاہئے۔ ۶۷ فی صد انگریزوں نے جواب دیا کہ "نہیں" اس واقعہ کے ۲۶ سال بعد جب آکی ہیٹو سے اس تجربہ پر تبصرہ کرنے کے لئے کہا گیا تو انھوں نے جاپانی صحافیوں کو جواب دیتے ہوئے کہا کہ اس وقت میں نے نہایت شدت کے ساتھ محسوس کیا کہ کسی ملک کے عوام کے لئے یہ کتنا ضروری ہے کہ ان کو خوش حالی اور فراوانی حاصل ہو۔

اب شہزادہ چارلس، ملکہ الزبتھ کے بڑے لڑکے اور برطانی تخت کے وارث، آکی ہیٹو کی تخت نشینی کی تقریب میں اس وقت شریک ہو رہے ہیں جب کہ جاپان دولت میں برطانیہ سے بہت زیادہ بڑھ چکا ہے اور اپنی بڑھتی ہوئی اقتصادی طاقت کے عروج پر پہنچ چکا ہے۔

۱۹۵۳ میں جاپان کی تصویر یہ تھی کہ وہ ایک کمزور اور شکست خوردہ ملک ہے۔ اس

کا اقتصادی ڈھانچہ تباہ ہو چکا ہے۔ چنانچہ انگریزوں نے (اور اسی طرح دنیا کی دوسری قوموں نے) اس کے ساتھ ایسا معاملہ کیا جو واضح طور پر تحقیر اور تذلیل کی حیثیت رکھتا تھا۔ اب جاپانیوں کے لئے ایک صورت یہ تھی کہ وہ ردعمل کا انداز اختیار کریں۔ وہ دوسری قوموں کے خلاف شکایت اور احتجاج کا لفظی طوفان برپا کریں۔ مگر انھوں نے ایسا نہیں کیا۔

اس کے برعکس جاپانیوں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ اس قسم کی تمام اشتعال انگیز باتوں کو انھوں نے اعراض کے خانہ میں ڈال دیا۔ انھوں نے اپنی تمام طاقت اور اپنے تمام وسائل کو صرف ایک کام میں لگا دیا۔ اور وہ وہی تھا جس کو جاپان کے سابق شہنشاہ ہیروہیٹو نے جاپان کی تعمیر نو سے تعبیر کیا تھا۔

اس کا نتیجہ حیرت ناک حد تک شاندار نکلا۔ آج جاپان دنیا کی نمبر ایک طاقت بننے کے کنارے پہنچ چکا ہے۔ وہ ساری دنیا کو قرض دے رہا ہے۔ اس کی اسی ترقی کا نتیجہ ہے کہ ۱۲ نومبر ۱۹۹۰ کو جب آکی ہیٹو کی تخت نشینی کی رسم ٹوکیو میں ادا کی گئی تو برطانیہ سمیت دنیا کی ۱۶۴ قوموں کے نمائندے اس میں شرکت کے لئے موجود تھے۔ حکومت جاپان نے اس تقریب پر ۹۵ ملین ڈالر خرچ کیا۔

اس دنیا میں ترقی کا راز یہ ہے کہ آدمی دوسروں کی ناخوش گوار باتوں پر صبر کرے۔ وہ یکسو ہو کر صرف اپنی تعمیر میں لگا رہے۔ اگر آپ اپنے کو دوسروں سے اوپر اٹھالیں تو دوسروں کی زیادتیاں اپنے آپ ختم ہو جائیں گی۔ آپ کسی مطالبہ کے بغیر دوسروں کے درمیان عزت اور سرفرازی کا مقام حاصل کر لیں گے۔

اصل عمل وہ ہے جو اپنے آپ پر کیا جائے۔ مگر نادان لوگ اکثر ایسا کرتے ہیں کہ وہ اپنے مسئلہ کے حل کے لئے دوسروں کے اوپر جدوجہد شروع کرتے ہیں۔

دوسرا انسان ہمیشہ آپ کے قابو سے باہر ہوتا ہے۔ مگر اپنی ذات کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ اپنی ذات پر عمل کرنے کی قدرت آپ کو ہمیشہ حاصل رہتی ہے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ دوسرا اگر آپ سے چھینتا ہے تو خواہ وہ کتنا ہی زیادہ آپ سے چھین لے، پھر بھی ایک سب سے قیمتی چیز آپ کے پاس باقی رہے گی۔ اور وہ خود آپ کا اپنا وجود ہے۔ اس بچے ہوئے سرمایہ کو استعمال کیجئے،

اور پھر آپ کو کسی سے شکایت باقی نہ رہے گی۔

تخریب نہیں تعمیر

دو آدمی ایک دوسرے کے پڑوسی تھے۔ دیوار سے دیوار ملی ہوئی تھی۔ شروع میں دونوں برابر کی حیثیت رکھتے تھے۔ بعد کو ایک خاندان تجارت کرنے لگا۔ دھیرے دھیرے اس نے کافی پیسہ کما لیا۔ اس نے اپنا گھر بھی بڑا بنالیا۔ اس کے بعد ان لوگوں میں غرور آگیا۔ وہ اپنے کو بڑا سمجھنے لگے۔

اب دوسرے خاندان میں ردعمل پیدا ہوا۔ انھوں نے پہلے خاندان کے خلاف تخریب کاری کے منصوبے بنائے۔ انھوں نے طے کیا کہ اس کے سامان میں آگ لگائیں اور اس کے آدمیوں پر گولی اور بم سے حملہ کریں۔ اس دوران ان کی ملاقات ایک تجربہ کار آدمی سے ہوئی۔ اس کو تخریبی منصوبہ کا حال معلوم ہوا۔ اس نے خاندان والوں سے پوچھا کہ تم کیوں ایسا کرنا چاہتے ہو۔

انھوں نے جواب دیا کہ پہلے ہم دونوں برابر تھے۔ ہماری لکیر بھی ایک فٹ کی تھی اور ان کی لکیر بھی ایک فٹ کی۔ اس کے بعد انھوں نے تجارتیں کیں اور اس کے ذریعہ سے اپنی لکیر کو دو فٹ بنالیا۔ اب ہم چاہتے ہیں کہ ان کی لکیر کو کاٹ کر دوبارہ ایک فٹ بنادیں۔ اس کے بغیر وہ لوگ ہمیں چین سے رہنے نہیں دیں گے۔

تجربہ کار آدمی نے کہا کہ لکیر کو چھوٹا کرنے کا ایک اور طریقہ بھی ہے جو زیادہ یقینی ہے۔ اگر تم چاہو تو میں تم کو یہ دوسرا کامیاب طریقہ بتاؤں۔ انھوں نے کہا کہ بتائیے۔ تجربہ کار آدمی نے کہا کہ وہ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ تم اپنی لکیر کو تین فٹ بنالو، اس کے بعد ان کی دو فٹ کی لکیر اپنے آپ چھوٹی ہو جائے گی۔ خاندان والوں نے پوچھا کہ وہ کیسے۔ تجربہ کار آدمی نے کہا کہ تمہارے پڑوسی نے تجارت کے میدان میں اپنی لکیر کو بڑھایا ہے۔ تم اپنی لکیر کو علم کے میدان میں بڑھا لو۔

یہ بات خاندان والوں کی سمجھ میں آگئی۔ ان کے گھر میں ایک درجن چھوٹے بڑے لڑکے تھے سب کو انھوں نے یکسو کر کے تعلیم کے میدان میں لگا دیا۔ ۲۰ برس کے بعد نقشہ بالکل دوسرا

تھا۔ اب اس خاندان میں ہر قسم کے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ جمع ہوگئے اور دھیرے دھیرے بڑے بڑے عہدوں پر پہنچ گئے۔ ڈاکٹر، انجنیئر، وکیل، آئی اے ایس افسر، ممبر اسمبلی، وغیرہ۔ دوسرے خاندان کی حیثیت پہلے خاندان سے بہت زیادہ بڑھ گئی۔ پہلے خاندان والوں کا سارا غرور اپنے آپ ختم ہوگیا۔

تخریب کاری کے ذریعہ یقینی نہیں تھا کہ دوسرے کی لکیر چھوٹی ہوجاتی۔ اور اگر بالفرض چھوٹی ہوتی تو وہ بھی اس قیمت پر ہوتی کہ پہلے خاندان کی لکیر بھی مزید چھوٹی ہو چکی ہو۔ مگر تعمیر کاری کا طریقہ صد فی صد کامیاب رہا۔ اب کسی بھی قسم کا ذاتی نقصان کئے بغیر دوسرے خاندان کی لکیر اپنے آپ چھوٹی ہوگئی۔

دنیا میں جتنے جھگڑے ہیں، ان سب کا خلاصہ صرف ایک ہے۔ اور وہ دوسرے کی بڑھی ہوئی لکیر کو چھوٹا کرنے کا جنون ہے۔ آج ہر فرد اور ہر گروہ اسی کوشش میں سرگرم نظر آتا ہے۔ ہر ایک اپنی ساری توجہ اس کام میں لگائے ہوئے کہ وہ دوسرے کی بڑھی ہوئی لکیر کو کسی نہ کسی طرح چھوٹا کردے۔ تاکہ دونوں کی حیثیت برابر ہوجائے۔

"دوسرے کی لکیر کو چھوٹا کرنا" بجائے خود کوئی برا جذبہ نہیں۔ یہ جذبہ ایک فطری جذبہ ہے۔ اسی جذبہ کی وجہ سے دنیا میں مقابلہ و مسابقت کی فضا بنتی ہے۔ اسی کی وجہ سے تمام سرگرمیاں ظہور میں آتی ہیں۔ اگر لوگوں میں یہ جذبہ ختم ہوجائے تو دنیا سے تمام سرگرمیاں بھی ختم ہوجائیں گی۔

مگر اس جذبہ کا صحیح استعمال تعمیر کا میدان ہے نہ کہ تخریب کا میدان۔ آدمی کو چاہئے کہ وہ دوسرے کی لکیر کو چھوٹا کرنے کی فکر نہ کرے بلکہ اپنی لکیر کو بڑا کرنے میں لگ جائے۔ اس کے بعد مسئلہ اپنے آپ ختم ہوجائے گا۔ اس کے بعد یہ ضرورت نہ ہوگی کہ علیٰحدہ سے فریق ثانی کی لکیر کو چھوٹا کرنے کی کوشش کی جائے۔

دوسرے کی لکیر کو چھوٹا کرنے کے لئے دوڑنا تخریب کاری ہے، اور اپنی لکیر کو بڑا کرنے کے لئے محنت کرنا تعمیر کاری۔ تخریبی سرگرمیوں سے پورا سماج برباد ہوتا ہے، جس کا ایک حصہ خود تخریب کار کو بھی ملتا ہے۔ اس کے برعکس تعمیری سرگرمیوں سے پورا سماج ترقی کرتا ہے، اور دوبارہ اس ترقی کے فوائد مختلف صورتوں میں خود تعمیر کار کو بھی ضرور پہنچتے ہیں۔

آپ کو جب بھی محسوس ہو کہ دوسرے شخص کی لکیر بڑی ہوگئی ہے تو دوسرے کی لکیر کو چھوٹا کرنے کے پیچھے نہ پڑئیے۔ آپ صرف یہ کیجئے کہ وہی طاقت تعمیر کے راستوں میں لگا کر اپنی لکیر کو بڑا کر لیجئے۔ اس کے بعد وہی مقصد زیادہ بہتر طور پر حاصل ہو جائے گا جو آپ اپنے تخریبی منصوبوں کے ذریعہ ناکام طور پر حاصل کرنا چاہتے تھے۔

اگر آپ کھلی آنکھ سے دیکھیں تو دونوں قسم کی مثالیں آپ کو اپنے آس پاس ہی دیکھنے کو مل جائیں گی۔ وہ مثالیں بھی جب کہ ایک شخص نے دوسرے کی لکیر کو چھوٹا کرنا چاہا، مگر آخر کار جو نتیجہ ہوا وہ یہ کہ خود اس کی اپنی لکیر مزید چھوٹی ہو کر رہ گئی۔ اسی کے ساتھ وہ مثال بھی جب کہ ایک شخص دوسرے کے پیچھے پڑنے کے بجائے خود اپنی لکیر کو بڑا کرنے میں لگ گیا۔ اور چند برسوں کے بعد تمام دیکھنے والوں نے دیکھا کہ اس کی لکیر بڑی ہوگئی ہے اور دوسرے کی لکیر چھوٹی۔ اگرچہ دنیا میں پہلے قسم کی مثالیں بہت زیادہ ہیں، اور دوسرے قسم کی مثالیں اس کے مقابلہ میں بہت کم۔

تعمیر و ترقی کی یہ کارگر تدبیر ایک شخص کے لیے بھی ہے اور پوری قوم کے لیے بھی۔ انفرادی سطح کی کامیابی بھی اسی طریقہ سے حاصل ہوتی ہے اور اجتماعی سطح کی کامیابی بھی اسی طریقہ سے۔ موجودہ دنیا میں حقیقی اور پائدار کامیابی حاصل کرنے کا اس کے سوا اور کوئی طریقہ نہیں۔

ملت کے کارواں کی شاہراہ ابدی طور پر شریعت میں مقرر کردی گئی ہے۔ اور رسولؐ اور اصحاب رسولؓ کی زندگیوں کی صورت میں اس کا ایک مکمل نمونہ تاریخ میں قائم کردیا گیا ہے۔ اب مسلمانوں کو صرف یہ کرنا ہے کہ وہ قرآن وسنت کے ذریعہ اس شاہراہِ حیات کو معلوم کریں اور رسولؐ اور اصحاب رسولؓ کے نمونہ کی پیروی کرتے ہوئے اپنی زندگی کی تعمیر کریں۔ اسی میں ان کی دنیا کی فلاح ہے اور اسی میں ان کی آخرت کی فلاح بھی۔

ISLAMIC STUDIES
GOODWORD
www.goodwordbooks.com
ISBN: 81-8506-394-X
9 78818 5063942